تاریخ

اخلاق یورپ

دوم

قواعد و ضوابط انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن)

(۱) سرپرست وہ ہیں جو پانچ ہزار روپے یک مشت یا پانسو روپے سالانہ انجمن کو عطا فرمائیں —
(ان کو تمام مطبوعات انجمن بلا قیمت اعلیٰ قسم کی جلد کے ساتھہ پیش کی جائیں گی)

(۲) معاون وہ ہیں جو ایک ہزار روپے یک مشت یا سالانہ سو روپے عطا فرمائیں - (انجمن کی تمام مطبوعات ان کو بلا قیمت دی جائیں گی)

(۳) رکن دوامی وہ ہیں جو ڈھائی سو روپے یک مشت عطا فرمائیں —
(ان کو تمام مطبوعات انجمن مجلد نصف قیمت پر دی جائیں گی)

(۴) رکن معمولی انجمن کے مطبوعات کے مستقل خریدار ہیں جو اس بات کی اجازت دے دیں کہ انجمن کی مطبوعات طبع ہوتے ہی بغیر دریافت کئے بذریعہ قیمت طلب پارسل ان کی خدمت میں بھیج دی جائیں - (ان صاحبوں کو تمام مطبوعات پچیس فی صدی قیمت کم کرکے دی جائیں گی) مطبوعات میں انجمن کے رسالے بھی شامل ہیں —

(۵) انجمن کی شاخیں وہ ہیں جو انجمن کو یک مشت سوا سو روپے یا بارہ روپے سالانہ دیں (انجمن ان کو اپنی مطبوعات نصف قیمت پر دے گی)

فہرستِ مضامین

(جلد دوم)

باب چہارم

قسطنطین کے زمانہ سے شارلمین کے عہد تک

فصل (۱)

تمہید

گزشتہ باب میں اجمالاً ، مگر کافی وضاحت کے ساتھہ معلوم ہوچکا ہے کہ رومہ میں مسیحیت کے پھیلنے کے کیا کیا اسباب ہوے اور اس راہ میں کس کس قسم کی رکاوٹیں حائل رہیں - موجودہ باب میں یہ دیکھنا ہے کہ مسیحیت نے دنیا کے سامنے اخلاقی معیار و نصب العین کیا پیش کیا، اور دنیا سے اس کی تعمیل کیونکر کرائی؟ لیکن قبل اس کے کہ آگے بڑھیں، ایک عام غلط فہمی کا شروع میں رفع کردینا ضروری ہے ۔ بہت سے لوگ یہ کرتے ہیں کہ مسیحی تعلیمات کے مقابل مارکس آریلیس و سنیکا کی تحریروں سے ان کے متحدالمضمون فقرات اقتباس کرکے رکھہ دیتے ہیں، اور پھر ان دونوں میں موازنہ کر کے مسیحیت کے حق میں فیصلہ صادر کردیتے ہیں - لیکن یہ طریق موازنہ قطعاً ناقابل اعتماد ہے - مشرکانہ و مسیحانہ اخلاق کی بہت بڑی فارق یہ شے ہے کہ مشرکوں کا اخلاق ان کے فلسفہ کا جز و تھا، برخلاف اس کے مسیحیوں کا اخلاق ان کے مذہب کا جزو تھا - اول الذکر کے یہاں جو کچھہ

سرمایہ اخلاق تھا، وہ نام تھا ان حکیمانہ اصول کا جو فلاسفہ نے بعد غور و خوض کے قایم کئے تھے - وہ فلاسفہ هي کے لئے موزوں تھے، اور عوام کو ان سے کوئی سروکار نہ تھا - بہ خلاف اس کے آخرالذکر کا نظام اخلاق ان کے مذہب کا جزو غیر منفک تھا، جو مذہب کے قایم کردہ حدود عبارات، معتقدات و معاملات سے ذرا بھی الگ نہ تھا، اور اس واسطے عوام و خواص سب پر یکساں موثر تھا - مشرکوں کا مذہب کون سے مسائل حل کرتا تھا؟ یہ کہ علم غیب کیونکر حاصل ہوسکتا ہے؟ کائنات کی علت حقیقی کیاہے ؟ مصائب سے کیونکر مامون رهنا چاهئیے؟ اور دیوتاؤں سے کیونکر استعانت کرنا چاهئیے؟ اس کے اندر اس کی کہیں گنجائش هی نہ تھی، کہ پاکیزگی اخلاق کے ذریعہ سے روحانی ترقی حاصل کرنا چاهئیے ان کے هادیان شریعت فضائل اخلاق سے بیگانہ تھے، اور حکماء اخلاق مذہب و شریعت سے مطلق واسطہ نہ رکھتے تھے - یہ شرف محض مسیحیت کے لئے مخصوص تھا کہ اس نے اخلاق و مذہب کے تانڈے ملادیے - اخلاقی پاکیزگی کو نجات اُخروی کا ذریعہ بتایا، اور حسن اخلاق کے لئے وہ محرکات و مرغبات فراہم کردیے، جن سے عوام و خواص دونوں برابر متاثر ہوتے تھے - یہ ضرور تھا کہ اہل خطابت کے هاتھہ میں پڑکر فلسفہ ملک میں زیادہ مقبول و شایع ہوگیا تھا، اور فیثا غورثی و مشرقی مذاهب میں صفاے باطن کا بھی ایک درجہ مقرر کیا گیا تھا، تاهم اس قدر قطعی هے کہ مذہب و اخلاق میں جس قدر صریحی، بلا واسطہ اور قریبی آمیزش و اتحاد مسیحیت نے پیدا کردیا، یہ اس سے پیشتر دنیا کے لئے نامعلوم تھا - اس نے مذہبی تقدس اور برگزیدگی کی بنیاد فضیلت اخلاقی پر رکھی، اور موثرات قوی سے کام لے کر وجودباری، بقاے روح و فرائض

انسانی کے مسائل کو جن تک قدماء کا تخیل بھی نہیں پھلچھتا تھا، وقف عام کردیا —

لیکن مسیحیت اس اخلاقی انقلاب میں کامیاب کیونکر ہوئی ؟ اگر کہئے کہ اپنی تعلیمات کی خوبیوں سے؛ تو مشرک حکماء اخلاق کی تعلیمات کی رفعت و حسن سے کون انکار کرسکتا ہے؟ اس کا اصلی باعث یہ تھا کہ مسیحیت نے اخلاقی تعلیمات کو موثر بنانے کے طریقہ بالکل نئے اختیار کئے۔ وہ طریقے یہ دو تھے۔ ایک یہ کہ مسیحیت نے حیات بعد الموت میں جزا و سزا کا پورا یقین دنیا کو دلادیا۔ مشرکوں کے یہاں یہ تخیل بہت ہی دھندلا و مبہم تھا، مسیحیت نے اسے پوری وضاحت و قطعیت کے ساتھ پیش کیا۔ دوسرے مسیحیت نے یہ بتایا کہ ہر نفس کو اپنے جزئیات اعمال تک کا فرداً فرداً حساب دینا ہوگا اور سزائیں عارضی نہیں، بلکہ دایمی ہوں گی۔ یہ دونوں طریقے دنیا کے لئے بالکل نئے تھے، اور ان کا عام قلوب پر بیحد اثر ہوا۔ پیشتر لوگ عاقبت کی طرف سے غافل و بے خبر رہتے تھے، لیکن اب انھیں اپنے ہر حقیر سے حقیر قول و فعل پر ذمہ داری محسوس ہونے لگی، اور انھیں یقین ہوگیا کہ ان کا چھوٹے سے چھوٹا عمل بھی یوم آخرت کے محاسبہ و باز پرس سے باہر نہیں رہ سکتا، خواہ دنیا میں وہ سب کی نظر سے مخفی رہے۔ ایک اثر تو یوں پڑا۔ دوسری طرح پر یہ تخیل اس لئے زیادہ موثر ہوا کہ مسیحیت نے بجاے فضائل اخلاق پر زیادہ زور دینے کے، اصل زور ذمایم اخلاق کے نتائج پر دیا۔ مشرکوں کا فلسفہ یہ تھا کہ "نیک کردار بنو، فضائل اخلاق سے آراستہ ہو" ۔ مسیحیت نے اس کے برخلاف یہ دعوت دی کہ " بد کاری سے بچو ذمایم اخلاق سے اپنے تئیں گنھگار نہ بناؤ" یہ دونوں طریقے

اپنی اپنی جگہ پر بہت خوب ہیں، لیکن پہلی صورت انسان کو فرشتہ بنانے میں زیادہ معین ہوتی ہے، اور آخری صورت شیطان کو انسان بنانے میں - قدیم فلسفۂ اخلاق پر عمل سے چند مخصوص اشخاص کا، جو پہلے سے نیک کرداری پر آمادہ و مائل ہوتے ہیں، اخلاق نہایت اعلیٰ درجہ کا ہوسکتا ہے، لیکن یہ نہیں ہوسکتا کہ عام افراد کا اخلاق ایک متوسط حد تک اصلاح پذیر ہوجاے - یہ قوت صرف اس آخری طریقۂ دعوت کو حاصل ہے - جو لوگ طبعاً بدکاری کی جانب مایل ہیں، ان کے سامنے فضائل اخلاق کے مناقب پیش کرنا بالکل بے کار ہیں - ان پر اگر کوئی شےء موثر ہوسکتی ہے تو صرف یہ کہ بد کاری سے عذاب اخروی میں گرفتار ہوگے اور عذاب دائمی میں پڑوگے - انھیں راہ راست پر صرف خوف لا سکتا ہے - اور پھر وہ خوف جو عذاب دائمی کا ہو، دنیا کی اخلاقی خامیوں کی اصلاح کا یہی ایک راستہ ہے اور اسی کو مسیحیت نے اختیار کرکے گویا کائنات اخلاق میں ایک انقلاب پیدا کر دیا —

دنیا کی ہر شے میں نفع و ضرر دونوں ہوتے ہیں - مفید سے مفید شے بھی ضرر کے پہلو سے خالی نہیں ہوتی - چنانچہ مسیحیت نے اصلاح اخلاق کا جو طریقہ اختیار کیا اس نے نہایت کامیاب اثر دکھایا تاہم اس کے مضر پہلو بھی بے اثر نہیں رہے - انسانیت کے تاریک رخ پر ہر وقت زور دیتے رہنے کا یہ نتیجہ ہوا کہ علماء مسیحیت کے ذہن میں انسان کے پرمعاصی ہونے کا تخیل بہت مبالغہ کے ساتھ سما گیا، اور وہ معصیت کو انسان کی اصل سرشت سمجھنے لگے، اُنھوں نے اپنے نزدیک یہ سمجھ لیا کہ ہر انسان فطرتاً بدی کی طرف

مایل ہے ' اور نیکی کی تحریک اس کے دل میں خاص اہتمام و کوشش کے بعد ہی پیدا ہونا ممکن ہے - حالانکہ یہ تخیل واقعات کے صریحاً خلاف ہے ہم اپنے گرد و پیش کیا کیفیت پاتے ہیں ؟ عموماً ہر شخص ہمدردی و انسانیت کو پسند ' اور بے رحمی و شقاوت کو نا پسند کرتا ہے - خود غرضی ' شہوت پرستی رشک و حسد کو کوئی اچھی نظر سے نہیں دیکھتا - دوسروں کے ساتھ بھلائی ' اُخوت و خدا ترسی کو سب پسند کرتے ہیں ' منت پزیری و احسان شناسی کی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں ' اور احسان فراموشی کی خال خال - یہ وہ حالت ہے جو ہم اپنے مشاہدہ میں برابر ہر وقت پاتے رہتے ہیں - یہ انسان کی عام و طبعی حالت ہے ' اس کے خلاف جو کچھہ ہے وہ شاذ و غیر طبعی ہے - گویا یہ سمجھنا چاہئے کہ ہر سرشت انسانی کا سیدھا اور عام راستہ نیکی کا ہے ' اور اس میں افراط و تفریط کا نام معصیت ہے —

لیکن یہ ضرور ہے کہ نفس بشری کی معصیت سرشتی کا یہ مبالغہ آمیز تخیل ابتدا کی دو تین صدیوں تک نہیں پیدا ہوا تھا - یہ زیادہ تر تیسری صدی عیسوی سے پھیلا - ورنہ شروع شروع تو ائمہ مسیحیت بھی گناہ کو انسان کی ایک غیر طبعی حالت سمجھتے تھے ' اور اسی بنا پر اُس سے روکنے کی طرح طرح کی تدابیر اختیار کرتے تھے - ان تدبیروں میں سے سب سے زیادہ کارگر تدبیر یہ تھی کہ اخلاقی پاکیزگی کو مذہبی زندگی کے لئے ایک لازمی شرط قرار دے دیا گیا تھا ' اور یہ اس طرح پر کہ روزانہ گرجا میں جمع ہوکر عبادت کرنا ' اور تبرکات حاصل کرنا ' مسیحی کے لئے نجات اُخروی

کے واسطے ضروری تھا ، اور وہ لوگ جو کسی معصیت میں گرفتار ہوجاتے تھے، اُن سے یہ حق سلب کرلیا جاتا تھا، زنا کاری ، شاھد بازی، نکاح کے قبل کسی سے ھمبستری ، بت پرستی ، نقالی یا سیافی کا پیشہ اختیار کرنا ، یا دشمنوں کو کسی مسیحی کا پتہ بتا دینا، یہ تمام جرایم ایسے تھے جن کی پاداش میں مجرم کو یہ سزا ملتی تھی کہ وہ گرجا کی حاضری اور حصول تبرکات سے معطل کردیا جاتا ، جس کے معنی یہ تھے کہ جب تک وہ توبہ نہ کرلے اُسے آخرت کے عذاب دردناک سے نجات نہیں مل سکتی - ان میں سے سب سے ھلکے جرم کی سزا کی میعاد چند ھفتہ تھی ، بعض کی ایک سال کی ، بعض کی دس سال کی ، اور کسی کسی کی ساری عمر کی - اس میعاد میں مجرم کو بیوی کے پاس جانا ، اچھا کپڑا پہننا ، اچھا کھانا کھانا ، غرض جملہ لذات کو اپنے اوپر حرام کرلینا ھوتا تھا ، سخت سے سخت ریاضتیں کرنا ھوتی تھیں اور میعاد کے آخری دن اسے تمام مسیحیوں کے سامنے علانیہ سر منڈائے، چہرہ پر خاک ڈالے، کپڑے کے بجاے جسم کو بورئیے سے ڈھانپے ھوئے آنا پڑتا تھا، اور وہ آکر اپنے تئیں پادری کے قدموں پر گرا دیتا تھا، اور پکار پکار کر اپنے گناھوں کا اعتراف، اور ان پر استغفار کرتا تھا، اور صرف یہی نہیں کہ سزا کی میعاد بھر وہ کسی مذھبی رسم میں شریک نہیں ھوسکتا تھا ، بلکہ مواکلت و معاشرت ، مناکحت و مجالست ھر شعبۂ زندگی کا اس سے پورا مقاطعہ ھو جاتا تھا، یعنی کوئی عیسائی نہ اس سے مل جل سکتا ، نہ بات چیت کرسکتا نہ اس کے ساتھہ کھا پی سکتا ـــ

اس طرز عمل سے اگرچہ دلوں میں یہ خیال پیدا ھوگیا

کہ نجات پادریوں کے ہاتھ میں ہے، یہ جسے چاہیں جنت میں بھجوائیں اور جسے چاہیں جہنم میں پھنکوائیں، اور آگے چل کر یہی خیال بہت سی تو ہم پرستیوں کا پیش خیمہ ثابت ہوا، تاہم اس میں ذرا شبہہ نہیں کہ اس وقت اس کا اثر نہایت مفید پڑا - در حقیقت گناہوں کی روک تھام میں، اور اس اعتقاد کے پھیلانے میں کہ چھوٹے سے چھوٹا گناہ بھی حشر میں بلا احتساب نہیں رہ سکتا، یہ طرز عمل جس قدر موثر و مفید ثابت ہوا اس کے لحاظ سے یہ آپ ہی اپنا نظیر ہے —

لیکن مسیحیت کا خالی یہی کارنامہ نہ تھا کہ اس نے لوگوں کو ڈرا دھمکا کر اور ان کے ذاتی و خود غرضانہ جذبات کو متاثر کر کرکے ان کے اخلاق کو درست کیا، بلکہ اس سے بڑھ کر اس کا کمال یہ ہے کہ اس نے بالکل بے غرضانہ و خود فراموشانہ طور پر محض خالصاًللہ لوگوں میں نیکی و نیک چلنی کا جذبہ پیدا کردیا، اور یہ مسیح کی محبت کے ذریعہ سے - "اشراقیہ" کہتے تھے کہ خدا کا تتبع کرو - "رواقیہ" کہتے تھے کہ شاہراہ عقل پر چلو - لیکن مسیحیت نے آکر کہا کہ "مسیح سے محبت رکھو، اور تمہارے اخلاق خود بخود درست ہو جاوئیں گے"- محبت کی یہ پہلی صدا تھی جو دعوت اخلاق کے سلسلہ میں بلند ہوئی، اور اس کا جو کچھ اثر ہوا وہ دنیا پر روشن ہے ایپکٹیٹس و متاخرین رواقیہ یہ کہنے لگے تھے کہ ہمیشہ ایک بلند اخلاق شخص کو بہ طور اسوہ حسنہ کے اپنے سامنے رکھنا چاہئے اور اس کی تقلید کرتے رہنا چاہئے - لیکن تقلید و تتبع اور الفت و محبت میں زمین و آسمان کا فرق ہے - یہ

شرف مسیحیت کے لئے مخصوص تھا کہ اس نے دنیا میں سب سے اول بار لوگوں کو محبت کے راستہ سے اخلاق کی تعلیم دی اور نسل انسانی کے سامنے ایک ایسا بلند کیرکٹر، ایک ایسی دلفریب شخصیت پیش کی، جو اپنی دلفریبی و محبت سے ہر قوم، ہر ملک، ہر زمانہ کو متاثر کرتی رہی ہے، جو بہترین محرک اخلاق ہے، جو انیس سو سال گزر جانے پر بھی بدستور قوی و موثر ہے: اور جس کی عجیب و غریب قوت کا اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ گو اس کی ساری زندگی کے صرف تین سالوں کا علم ہے، لیکن اس کی اسی سالہ زندگی کے کارنامہ طبیعت پر وہ اثر ڈالتے ہیں جن کا مقابلہ بڑے سے بڑے واعظین کے مواعظ اور بہتر سے بہتر حکماء کے مقولے نہیں کرسکتے - حقیقت میں مسیحی اخلاق کے چشمہ کا منبع یہی مسیح کی محبت رہی ہے، جو صدہا انقلابات پر بھی اب تک جوں کی توں ہے، اور گو آگے چل کر مسیحیوں نے خود اپنے دین و ملت میں بیسیوں رخنے پیدا کئے، لیکن اپنے آقائے نامدار کے سیرت کی دلفریبی پر کبھی کوئی حرف نہ آنے دیا - محبت کامل اپنے سامنے کسی استحقاق و دعوے کو نہیں ٹھیرنے دیتی - پس جو لوگ ایک مرتبہ مسیح کے عشق و محبت میں سر شار ہوجاتے ہیں، وہ جو کچھ کرتے ہیں انتہائی خلوص و ذوق سے کرتے ہیں، جس میں نہ خوف کی آمیزش ہوتی ہے اور نہ صلہ و تحسین کی - سینٹ تھریسیا دعا مانگا کرتی تھی کہ کاش ساری کائنات ناپید ہو جائے اور اکیلی میں موجود ہوں، تا کہ آقا کی خدمتگزاری کا فخر تنہا مجھی کو حاصل رہے، اور اُس کی اُس تمنا کی آواز باز گشت اُس جیسی

ہزارہا عاشقان مسیح کی زبان سے آتی ہے۔ خود تعدیوں کے زمانہ میں منتہائے شداید پر تحمل و برداشت کی قوت مسیحیوں میں کس نے پیدا کر دی تھی؟ اسی عشق مسیح نے۔ زندہ زمین میں دفن کیے جاتے تھے، جنگلی جانوروں کے آگے چھوڑ دیئے جاتے تھے، لیکن صلیب کو اپنے محبوب مصلوب کی محبوب یادگار کسی طرح ہاتھ سے نہ چھوڑتے تھے، زخم پر زخم کھاتے تھے، دوسروں کو اُن کی حالت پر ترس آجاتا تھا، لیکن وہ خود خوش و خرم تھے کہ مسیح کے نام پر یہ زخم کھائے جا رہے ہیں موت آتی تھی اور وہ اس کا اس مسرت سے استقبال کرتے تھے کہ گویا دولہا اپنی نئی دلہن کو آغوش میں لے رہا ہے یہ کیوں؟ محض لئے کہ موت سے انہیں اپنے معشوق کا وصل نصیب ہو گا۔ 'سینٹ فیلیٹیس' زندان عقوبت میں اسیر تھی کہ وضع حمل کا وقت آگیا۔ ایسی حالت میں اُسے جیسی کچھ تکلیف ہوئی ہو گی ناظرین اندازہ کر سکتے ہیں۔ اس حال میں بے اختیار ایک چیخ اُس کے منھ سے نکل گئی۔ ایک تماشائی نے ترس کھا کر کہا کہ "ابھی اس قدر بیچین ہو رہی ہو، ذرا دیر میں درندوں کے سامنے ڈال دی جاؤگی، وہ تکلیف کیسے برداشت کروگی؟" اس پر اس نے پورے اطمینان سے جواب دیا۔ کہ 'نہیں' اُس وقت مجھے مطلق تکلیف نہیں ہو گی۔ وہ تکلیف میں جس کے لئے برداشت کروں گی، در حقیقت خود وہی اُسے برداشت کر لیگا"۔ اسی طرح جب 'سینٹ میلیمیا' کا شوہر اور دونوں لڑکے دفن ہو چکے، اور دنیا میں اُس کا کوئی والی و وارث باقی نہیں رہا تو وہ اُن کی قبروں پر جا کر بیٹھی اور کہا کہ 'الٰہی' تیرا

شکر ہے کہ تو نے ان بکھیڑوں سے مجھے نجات دے دی۔ میں اب پوری یکسوئی کے ساتھ تیری خدمت گزاری کر سکوں گی"۔

جو لوگ اس واقعیت سے باخبر ہیں کہ جذبات کی قوت و تندی کے مقابلہ میں اکثر محض قوت فرض شناسی کیونکر بیکار ہو جاتی ہے؛ جو لوگ اس رمز سے آگاہ ہیں کہ اسلام باوجود اپنی خالص توحید اور اعلیٰ نظام اخلاق کے محض اس باعث کہ اس کے متبعین کے سامنے کوئی اعلیٰ عملی نمونہ نہیں تھا، شرافت و محبت کے لطیف ترین جذبات سے کس طرح معریٰ رہا ہے؟ اور جن لوگوں کے پیش نظر مسیحی تاریخ کے اوراق ہیں جن کی ہر ہر سطر میں محبت مسیح کے کرشمے نظر آرہے ہیں، وہ سینٹ اگسٹاین کے اس فقرہ کی اہمیت و لطف کا پوری طرح اندازہ کر سکتے ہیں کہ 'مسیحی اخلاق، فلسفہ اخلاق نہیں، بلکہ ایک نظام محبت ہے"۔ بلکہ ایک طرح پر ہم قدما، مسیحین کی پورے جوش محبت کا اندازہ کر ہی نہیں سکتے۔ وجہ یہ کہ اُن کی دماغی زندگی کی ایک خاص خصوصیت تھی، آج جو ہم میں سے کسی میں موجود نہیں۔ وہ خصوصیت یہ تھی کہ کائنات کے مستمرالنظام پابند قوانین ہونے کا علم و یقین جیسا آج کل ہم کو ہے قدماء میں کسی کو نہ تھا۔ آج کا ہم میں کوئی تعلیم یافتہ شخص خواہ کیسا ہی مذہبی خوش عقیدگی میں ڈوبا ہوا ہو، یہ یقین ایک لمحہ کے لئے بھی نہیں رکھتا کہ قحط و وبا، طوفان و زلزلہ کسی مستبد حاکم کی طرف سے انسانی افعال کے صلہ یا سزا کی طور پر نازل ہوتے ہیں، بلکہ ہر شخص یہ جانتا ہے کہ یہ طبعی واقعات ہیں، جو

طبعی و مادی اسباب سے پیش آتے رہتے ہیں۔ لیکن قدماء مسیحیین کی یہ حالت نہ تھی۔ اُس وقت عالم کے مستمرالنظام ہونے کا عقیدہ تقریباً نہ معلوم تھا۔ اُس وقت ہر حرکت براہ راست ایک فرمان الٰہی کی معلول سمجھی جاتی تھی۔ ایسی حالت اور اپنے زمانہ میں کسی ہستی کے بارہ میں یہ اعتقاد کہ ایک طرف وہ ساری دنیا پر متصرف و حاکم تھا، جس کا حکم ہو شے پر حاوی تھا اور جسے کوئی شے نقصان نہیں پہنچا سکتی تھی، دوسری طرف باوجود اس غیر محدود قوت و اقتدار کے وہ محض اپنی اُمت کی نجات کے لئے محض اپنے اتباع کے گناہوں کے کفارہ کے لئے انتہائی مظلومیت و بیکسی کے ساتھ سولی پر چڑھ گیا، اور سخت سے سخت شداید برداشت کرتا رہا۔ ظاہر ہے کہ یہ اعتقاد کس قدر مؤثر ہوتا ہو گا خون میں حرارت پیدا ہوتی ہو گی، تو اسی تخیل سے؛ ارادوں میں جوش پیدا ہوتا ہوگا، تو اسی عقیدہ سے؛ غرض اس کی اُس زمانہ میں جتنی کچھ بھی اہمیت ہو، ہمارے اندازہ سے یقیناً زاید ہوگی۔ مصیبت کا مارا، ایک غریب و ناچار دکھیارا، جسے دنیا میں ہر طرف ناکامی و مایوسی کا چہرہ نظر آتا تھا، وہ بھی آسمان کی طرف سر اٹھاکر کہتا تھا کہ "اے مولیٰ تیرا ہی آسرا ہے" —

پس اگر ایسے مذہب نے جس نے اپنا مقصد اولی اصلاح اخلاق رکھا تھا، اور جس نے اپنے زبردست نظام، اپنے عقیدۂ جزا و سزا، اور اپنی قوت تخلیق خلوص و خود فراموشی سے قلوب انسانی پر ایک عدیم‌النظیر قابو حاصل کرلیا تھا، اگر ایسے مذہب نے اپنے متبعین کو تقدس کی بہت بلند سطح پر

پہنچا دیا تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں ۔ سچ یہ ہے کہ یورپ میں مسیحیت نے اپنے داخلہ سے تقریباً دو سو سال تک پاکیزگی اخلاق کا جو نمونہ پیش رکھا، اس کی نظیر تو شاید کہیں مل جائے، تاہم اس سے بہتر نمونہ یقیناً کہیں نہیں ملتا - رومیوں کے درمیان رہکر، مگر ان کی تباہ کاریوں سے الگ، سیاسی شورشوں سے دور، مقدمہ بازیوں سے علحدہ؛ جنگی و قومی مشاغل سے بیگانہ؛ اپنے آقا کے ظہور کے مشتاق؛ اپنے مذہب کی تعلیمات کے جوش و غلو میں سرشار؛ اور اپنے گرد و پیش کی زہریلی ہوا سے غیر متاثر؛ ان مسیحیوں نے مدت دراز تک اپنی اخلاقی آن و بان قایم رکھی اس سے انکار نہیں کہ اس زمانہ میں بھی اخلاقی انحطاط کے علامات خال خال موجود تھے اور کیونکر نہوتے جب کہ صدہا برائے نام عیسائی اس حلقہ میں شامل ہوگئے تھے - اور دولت و ثروت کا جادو اپنا اثر دکھانے لگا تھا، تاہم یہ اس وقت کسی کے سان و گمان میں بھی نہ آتا تھا کہ وہ مذہب جو کچھہ دنوں میں شرک و بت پرستی کا بیخکن ثابت ہوگا، جس کے اٹھہ کے سامنے بڑے بڑے تاجداروں کو سرنگوں ہو جانا پڑیگا - اور جس کے اکابر اپنا اثر دنیا کے تمدن پر ایک ہزار سال تک قایم رکھیں گے ؛ اس کا یہ عین قوت و اقتدار کا زمانہ، تمدنی حیثیت سے تاریخ کے حقیر ترین زمانوں میں شمار ہوگا —

اس زمانہ کے خاص حالات ہم مختصر الفاظ میں بیان کیے دیتے ہیں :—

مارکس آریلیس کی وفات کے زمانہ میں جو وہی زمانہ تھا جب کہ مسیحیت نے رومہ میں اثر و اہمیت

حاصل کرنا شروع کردی تھی، سلطنت کے اقبال میں گھن لگ گیا اور روز بروز انحطاط و زوال کے آثار ظاہر ہونے لگے - سب سے پہلے مسیحی تاجدار، یعنی "قسطنطین" نے اپنا دارالحکومت ایک نئے شہر "قسطنطنیہ" کو قرار دیا جو شرک و بت پرستی کی روایات کی زہریلی ہواؤں سے غیر متاثر تھا، اور یہاں اس نے ایسی سلطنت کی بنا ڈالی جس کا اخلاق تمامتر مسیحی مآخذ سے ماخوذ تھا، اور جو ۱۱۰۰ سال تک قایم رہی، لیکن اس حکومت کے بارہ میں، جسے بازنطینی حکومت کہتے ہیں، مورخین کا یہ متفقہ فتویٰ ہے کہ اس سے زیادہ ذلیل و پست تمدن اب تک دنیا نے نہیں دیکھا - بے شبہہ، ظلم، شقاوت، و بہیمیت میں اور تمدن اس سے بڑھ چڑھ کے ہوئے ہیں ، لیکن کم ظرفی ، دناءت ، و سفلہ پن کی مثالیں کسی دوسرے تمدن میں اس کثرت سے نہیں ملتیں تمدن کے ظاہری لوازم کی ان میں کمی نہ تھی ، علم ان کے پاس تھا، یونان قدیم کا پرجوش و پر عظمت لٹریچر ان کے پیش نظر تھا - یہ سب کچھ تھا، باینہمہ سفلہ پن کے مظاہر ہر سمت جلوہ گر تھے سازش و دغابازی، برادر کشی، احسان فراموشی ، نا شکر گذاری ، بزدلی ، و غلا مانہ خصوصیات کی ہر طرف گرم بازاری تھی ، اور واقعات جو چاروں طرف سنائی دیتے تھے ' وہ اس طرح کے ہوتے تھے کہ آج اس نے اس کے کھانے میں زہر ملادیا، کل اس نے اس کا محرم اسرار دوست بن کر عین موقع پر اسے دغا دی، پرسوں کسی نے کسی رئیس کی ڈیوڑھی کے خواجہ سراؤں کو گانٹھ کر محل سے اسباب اڑا لیا وغیرہ اگر یہ کہا جائے کہ اس زمانہ میں نیرو کا سا

ظالم، اور هیلیو ڈیباس کا سا بے شرم، کوئی تاجدار نہیں پیدا ہوا، تو پھر یہ بھی تو ھے کہ کوئی فرمان روا انٹو نائن و مارکس آریلس کے لگ بھگ بھی نہیں پہنچا - بیہودگی کی یہ حالت قایم تھی کہ مسلمانوں کے حملہ نے مشرقی حکومت کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کردیا، اور اهل شہر کو ابھی فقیہانہ موشگافیوں سے فرصت نہیں ملی تھی کہ قسطنطنیہ، ہلال کے زیر نگیں آگیا - ایشیا میں تو کلیسا پر مدت ہوئی فنا طاری ہوچکی تھی، ایشیاے کوچک میں مسیحیت نے پر جوش پر غلو راهب اور متشدد فقہا گو بہت سے پیدا کردیے تھے۔ لیکن اخلاق میں شمہ برابر بھی اصلاح نہیں کی تھی - لوگوں کو فقیہانہ مناظرہ کا تو ایک اچھا مشغلہ ھاتھہ آگیا تھا، تاهم ان کی عیش پرستی، اس کے اثر سے ذرا بھی ماند نہیں پڑتی تھی، بلکہ سچ یہ ھے کہ قبول مسیحیت کے بعد تعیش اور بھی بڑھ گیا تھا -

یہ سرگزشت تو مشرقی سلطنت کی تھی - مغربی سلطنت کا حال اس سے کسی قدر مختلف تھا - قسطنطین کے اصطباغ کو ابھی پوری ایک صدی بھی نہیں ہونے پائی تھی کہ روم کو الارک نے اپنے قبضہ میں کیا، اور وحشیوں کے متواتر حملوں نے رومی تمدن و معاشرت کی بنیادیں متزلزل کردیں - ادھر ان وحشی حملہ آوروں نے خود ھی مسیحیت قبول کرلی، اور چونکہ ان میں پیشتر سے کسی قسم کا تمدن موجود نہ تھا، اس لئے گرجا کو جو قدما کے تمام خزائن کا محافظ تھا، پورا موقع ملا کہ اس سادہ صفحہ کی جس طرح پر چاھے خدہ پری کرے - چنانچہ اس نے اس موقع سے پورا فائدہ اٹھایا - صدیوں تک اس نے دل و دماغ و زبان پر اپنی حکومت قاھرہ قایم رکھی، اور ایسا نظام تمدن برقرار رکھا جس کے ایک ایک

رگ و ریشہ میں کلیسا کی مذہبیت سرایت کئے ہوے تھی، یہاں تک کہ عہد ظلمات میں بھی، جو اپنی تاریک خیالی کے واسطے اس قدر بجا طور پر بد نام ہے، شریفانہ و اعلیٰ اخلاق کے جوہر بکثرت چمکتے نظر آتے ہیں - یہ زمانہ بلحاظ فیاضی، مذہبی تقدس و احترام، وفا شعاری، اور مشارکت و معاونت ' قدما مشرکین کے زمانہ سے؛ بلحاظ انسانیت و خدا ترسی روسی تمدن سے؛ اور بلحاظ عصمت پرستی، یونانی تمدن سے کہیں بڑھا چڑھا ہوا تھا - ایک طرف ان میں یہ خوبیاں تھیں - لیکن دوسری طرف وطنیت، قومی ہمدردی، حریت پسندی کا ان میں پتہ نہ تھا - نہ ان کے یہاں قدما کی طرح کوئی اعاظم رجال پیدا ہوے - اور نہ ان کے اخلاقی مطمح نظر میں کبھی وہ رفعت و لطافت پیدا ہوسکی جو قدما کے یہاں تھی - طوائف الملوکی، بدنظمی، خانہ جنگی، ظلم و جبر، جدال و قتال کا بازار گرم تھا، اور کمالات علمی کی تو شاید ہوا بھی انھیں نہیں لگی تھی تھی - اس سے جاہل تر تمدن دنیا میں کبھی پیدا ہی نہیں ہوا - اختلاف رائے و عقائد پر روا داری کے نام سے کسی کے کان بھی آشنا نہ تھے - البتہ مقبول و متعارف عقائد کی تائید میں اختراع واقعات و روایات و خدع و مکر کے لئے کامل رواداری تھی - زود اعتقادی و توہم پرستی کی خاص تعلیم دی جاتی تھی اور تحقیق و تنقید کا نام لینا گویا کلمات کفر بکنا تھا - غرض یہ کہ بحیثیت مجموعی، بجز فقہا و راہبوں کے اور اس زمانہ کا کوئی ایسا شخص نہ تھا جو اس گیارہ بارہ سو سال کی مدت کے کسی زمانہ میں رہنے کے مقابلہ میں یونان و روم کی قدیم حکومتوں میں رہنے کو نہ ترجیح دیتا —

مشرقی و مغربی حکومتوں کی دوازدہ صد سالہ مختصر تمدنی تاریخ اوپر کی سطروں میں بیان ہوچکی۔ میرے نزدیک اب اس سے بڑھ کر واضح و معتبر شہادت اس حقیقت کی کیا ہوسکتی ہے کہ اگرچہ مسیحیت نے دنیا کو چند نئے اصول اخلاق دیے، اور اجتماعی زندگی کی فلاح و بہبود میں اس نے ایک نہایت زبردست اصلاحی عنصر کا کام دیا، تاہم اس کی جو شکل کلیسائے یونان و روما نے پیش کی، اس کے لحاظ سے یہ بالکل اس کے لئے ناموزوں تھی کہ کسی تمدن کی باگ اس کے ہاتھ میں دے دی جاتی۔ بعض مصنفین اس الزام کو رفع کرنے کے لئے یہ تاویل پیش کرتے ہیں کہ "رومی سلطنت میں مسیحیت کے دین حکومت ہونے سے پیشتر ہی انحطاط شروع ہوگیا تھا، اور چونکہ مسیحی حکمرانوں نے قدیم مشرکانہ روایات کو ایک حد تک زندہ و برقرار رکھا۔ اس لئے جو کچھ خرابیاں پیدا ہوئیں، ان کی ذمہ داری مسیحیت پر کسی طرح عاید نہیں کی جا سکتی۔ پھر یہ کہ عہد ظلمات میں جو جہالت کی تاریکی چھائی ہوئی تھی، اس کا اصلی باعث وحشیوں کے حملے تھے، جو امن پسندوں کو دم نہیں لینے دیتے تھے" یہ تاویل ایک حد تک واقعیت پر مبنی ہے۔ لیکن رفع الزام کے لئے کافی نہیں۔ جب ہم یہ خیال کرتے ہیں کہ بازنطینی حکومت کا صدر مقام تو ایسا شہر تھا، جو مشرکانہ روایات و رسوم سے قطعاً غیر متاثر تھا، نیز یہ کہ مغرب میں مسیحیت کو وحشیوں کی شورش کے اچھی طرح فرو ہوجانے کے بعد، پورے سات سو سال تک عروج و اقتدار کامل حاصل رہا تو اس تاویل کا وزن کچھ بھی نہیں باقی رہ جاتا اور ہم یہ کہنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ مسیحیت کو اپنے امتحان دینے کا پورا موقع حاصل

رہا - اور اس امتحان میں وہ ناکام ثابت ہوئی - یہ بتا دینا بہت آسان ہے کہ قدما میں فلاں فلاں معایب تھے اور مسیحی تحریریں ان سے بالکل پاک ہیں لیکن یہ طریق موازنہ قرین انصاف نہیں - اگر ہم انصاف کے ساتھہ موازنہ کرنا چاہتے ہیں تو چاہئے کہ دونوں تمدنوں کا بہ حیثیت مجموعی موازنہ کریں ' اور صرف اسی پر نظر نہ رکھیں کہ ایک تمدن میں کیا کیا نقصانات تھے ' جن سے دوسرا پاک رہا ' بلکہ یہ بھی لحاظ رکھیں کہ ہر تمدن بہ لحاظ فضائل اخلاق کے تنوع اور مدارج کے دوسرے سے کہاں تک ممتاز رہا - اور جب ہم اس طریقہ پر موازنہ کرتے ہیں ' تو نتائج ذیل پر پہنچتے ہیں :—

(۱) مسیحیت نے اپنی زندگی کی ابتدائی دو صدیوں میں اپنی اخلاقی سطح نہایت بلند رکھی - اور اُس کی یہ بلند اخلاقی ' خاص طور پر اُس کے دین بر حق و الہامی ہونے کی سند میں پیش کی جاتی رہی —

(۲) تیسری صدی سے انحطاط کے علامات پائے جانے لگے —

(۳) اس کے بعد کی دو صدیاں بہ قول پادری مورخوں کے ' معصیت و سیہ کاری کی صدیاں تھیں —

(۴) اس کے بعد جو زمانہ خاص مسیحی تمدن کا ۸ - ۱۰ صدیوں تک رہا ' گو فضائل سے خالی نہ تھا ' تاہم وہ اس قابل نہیں کہ مسیحی اُسے فخر کے ساتھہ اپنی تائید میں پیش کریں —

(۵) آخری تین صدیوں (یعنی سترھویں ' اٹھارویں ' اور انیسویں) میں ' تمدن بے شبہ پھر نہایت بلند سطح اُبھر یا ہے ' لیکن اس کے لئے یہ مسیحی اخلاق کا کچھہ یوں ہی سا دست نگر ہے - ورنہ سائنس کی ترقی ' آلات

کی ایجادیں ، علوم طبعی کے انکشافات ، کاروباری زندگی کا پھیلاؤ ، علم و لٹریچر کی اشاعت عام ، نظام حکومت کی برتری ، قدماء کی روایات غرض موجودہ تمدن کو اس قدر بلند سطح پر لانے والی تمامتر یہی مادی چیزیں ہوئی ہیں - بلکہ اگر زیادہ دقت نظر سے تفتیش کی جائے تو دو حقایق اصولی اور بھی ظاہر ہوں گے —

(الف) اولاً یہ کہ قرون وسطیٰ کے تمدن کو خواب غفلت سے ہوشیار کرنے والی چیزیں اور یہ دونوں تھیں مسیحیت کے اثر سے بالکل الگ تھیں - ایک قدماء یونان و روم کا لٹریچر ، دوسرے مسلمانوں کے مدارس و درسگاہیں —

(ب) ثانیاً یہ کہ تمدن جدید ، جوں جوں مذہب کے اثر سے آزاد ہوتا گیا ہے اُسی نسبت سے ترقی کرتا رہا ہے - فن طب ، سائنس ، صنعت و حرفت سیاسیات ، بلکہ فلسفۂ اخلاق تک کسی شے کو اُٹھا کر دیکھئے ہر جگہہ یہ نظر آئے گا کہ جوں جوں کلیسا کی گرفت ہلکی پڑتی گئی ہے ، تمدن کی رفتار تیز ہوتی رہی ہے - (اس مبحث پر ہم نے اپنی ایک دوسری تصنیف " تاریخ عقلیت یورپ " میں تفصیل سے نظر کی ہے) —

ان مراتب کے بعد اب اصل مسئلہ یہ سامنے آتا ہے کہ وہ کیا اسباب تھے ، جن کی بناء پر ایک ایسا مذہب جو اپنی اعلیٰ اخلاقی تعلیمات کے لحاظ سے بے نظیر ہے ، جو انسان کے دل و دماغ ، دست و زبان پر ایک حیرت انگیز اثر و اقتدار رکھتا ہے - اور پچھلی تین صدیوں سے دنیا کے لئے آیۂ رحمت ثابت ہورہا ہے ، ہزار بارہ

سو سال تک اخلاق یورپ کی اصلاح میں ناکام و بے بس رہا ؟ میرے خیال میں اس کے متعدد و پیچیدہ اسباب تھے - اور اس مدت میں کلیسا اگر چہ بعض حیثیات سے اصلاح کرتا رہا ، لیکن بعض دوسری حیثیات سے تخریب و زوال کا بھی باعث رہا - اس اجمال کی تفصیل کے لئے آیندہ فصلیں ملاحظہ طلب ہیں —

فصل (۲)

مسیحیت کا پہلا سبق نفس انسانی کا احترام

مسیحیت نے آکر دنیا کو سب سے پہلا اخلاقی سبق اخوت انسانی کا دیا - اُس نے یہ بتایا کہ کسی شخص کی زندگی اس دنیا میں نہیں ختم ہوتی بلکہ ہر شخص کو اُس کے بعد آخرت میں جزا و سزا ملتی ہے اور ہر شخص حصول نجات کے لحاظ سے ایک دوسرے سے متحد اور اس کے مساوی ہے - اور اس بناء پر ہر بشر کا فرض ہے کہ وہ اپنے ہمجنسوں کی زندگی کو تقدس و احترام کی نظر سے دیکھے یہیں سے دنیا میں نفس بشری کی عظمت کا عقیدہ سب سے پہلی بار پھیلا - یہاں پر جملہ معترضہ تو ہوتا ہے ، لیکن مسئلہ کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے ہم اصل مبحث سے ذرا ہٹ کر ایک بات کہنا چاہتے ہیں —

ضمیریت پر ایک بڑا اعتراض یہ ہے کہ جن عقائد کو داخل سرشت و جزو فطرت سمجھا جاتا ہے وہ تحقیقات کے بعد ایسے نہیں ثابت ہوتے - مثلاً ایک قتل انسانی ہے کہ اس کی طرف سے نفرت کو جزو فطرت سمجھا جاتا ہے، حالانکہ ایسا نہیں ہے - لیکن میں کہتا ہوں کہ یہ معترضین کی اصولی غلط فہمی ہے - حامیان ضمیریت نے یہ کبھی بھی دعویٰ نہیں کیا کہ متعین و مشخص افعال کے متعلق نفس بشری میں نفرت یا رغبت کی یکساں کیفیت پائی جاتی ہے - ان کا دعویٰ صرف اس قدر ہے کہ دنیا میں رذایل کی طرف سے نفرت اور فضائل و محاسن کی طرف رغبت ایک اجمالی طور پر سب انسانوں کے ذہن میں فطرتاً برابر درجہ کی پائی جاتی ہے - مثلاً یہ احساس ہر شخص کے دل میں فطرتاً موجود ہوتا ہے کہ انسانیت، رحم و خدا ترسی قابل اختیار ہیں اور شقاوت، بیرحمی و بیدردی قابل ترک - رہا یہ کہ انسانیت و شقاوت کی تعریف کیا ہے؟ تو اس کا دار و مدار تمام تر سوسائٹی کے اثرات و تعلیم و تربیت پر ہے اور انہیں کے اقتضا سے ان کی تعریفات مختلف زمانوں میں بدلتی رہتی ہیں - چنانچہ خود اسی مسئلہ قتل انسانی کو لیجئے - ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ وحشی قبائل کا ذکر نہیں، اکثر اچھی خاصی متمدن جماعات میں بھی اپنے بعض ہم جنسوں کی خون ریزی کا تماشا دیکھنا ذرا بھی معیوب نہیں سمجھا گیا ہے - رومیوں کو اپنے غلاموں اور سیافوں کی جان کی کچھ بھی پروا تھی ؟ اہل یونان وحشیوں کے قتل و ہلاکت کو کچھ بھی معیوب سمجھتے تھے اہل اسپین اپنی مفتوح

امریکی قوموں کی زندگی ایک ذرہ برابر بھی عزیز رکھتے تھے ؟ خود آج بیسوں فاتح قومیں اپنے مفتوحوں کے ساتھہ کیا سلوک رکھتی ھیں ؟ ان سب چیزوں کو بھی جانے دیجئے - ایک بچہ کشی کی رسم کو لیجئے کتنے ملک ایسے ھیں جو اس رسم سے بچے ھوئے ھیں ؟ اور تو اور، تین سو سال ادھر خود انگلستان کی اس باب میں کیا روش تھی ؟ قدما میں نیک دل سے نیک دل رحیم سے رحیم اشخاص بلا تکلف سیافی اور دیگر خون ریز مناظر کی سیر کرتے تھے - غرض یہ ایک مسلم اور کھلی ھوئی حقیقت ھے کہ تفصیلات اخلاق کا معیار ھمیشہ بدلتا رھتا ھے - اور اگر کوئی ان اختلافات رواج سے حجت پکڑ کر ضمیریت پر اعتراض کرتا ھے، تو اس کا اعتراض تمام تر با در ھوا ھے - ضمیریت کی صحت کے لئے صرف اس قدر کافی ھے کہ اگر چہ ھر ملک اور ھر زمانہ نے اپنے لئے ایک جدا گانہ معیار اخلاق قرار دیا ھے تاھم اتنے جزو پر نوع انسانی ھمیشہ متفق رھی ھے کہ اصولی حیثیت سے اخلاق بد اخلاقی سے، نیکی بدی سے، اور خیر شر سے بہتر ھے - فلاطون، جو بچہ کشی کی تلقین کرتا تھا، کیٹو جو اپنے ضعیف غلاموں کو فروخت کر ڈالتا تھا پلینی، جو ذوق و شوق کے ساتھہ مناظر سیافی سے لطف اٹھاتا تھا، قدیم جنرل جو اسیران جنگ کو غلامی یا سیافی کا پیشہ اختیار کرنے پر مجبور کرتے تھے، موجودہ زمانہ کے جنرل جو اس طرز عمل کو وحشیانہ خیال کرتے ھیں، قدیم و اضعان قانون جو سزائے موت کے لئے طرح طرح کے ھولناک طریقے جاری کرتے تھے، حال کے و اضعان قانون جو سزائے موت کو باھتمام آسان و سہل بناتے ھیں قدیم استاد جو

مار پیٹ کر پڑھاتے تھے، حال کے اُستاد جو سمجھا بجھا کر پڑھاتے ہیں، بڑے سے بڑے بیدرد شکاری اور رحم دل سے رحم دل اشخاص جو شکار کے خیال سے بھی لرز اُٹھتے ہیں، یا جو ذبح حیوانات کے لئے آسان اور بے تکلیف طریقہ ایجاد کرنے میں مشغول رہتے ہیں، غرض یہ کہ تمام مختلف الرائے و مختلف الخیال اشخاص جو اپنے عقاید و اعمال کے لحاظ سے ایک دوسرے سے زمین و آسمان کا فرق رکھتے ہیں، اتنے جزو پر بہر حال بالکل متحد و ہم رائے ہیں کہ ظلم و شقاوت قابل نفرت اور انسانیت و رحم قابل تحسین ہے —

خیر یہ فقرہ معترضہ تو ضمیریت کے مخالفین کی غلط فہمی دور کرنے کے لئے تھا - ہم کہہ رہے تھے کہ مسیحیت کا شاید سب سے زیادہ روشن کار نامہ یہ ہے، کہ اُس نے نہ صرف عام طور پر لوگوں کو باہمی حسن سلوک کی تعلیم دی، بلکہ قتل انسانی کو ایک معصیت کبیرہ قرار دے کر دنیا کی تاریخ اخلاق میں ایک بالکل جدید باب کا اضافہ کر دیا - اور اس سلسلہ میں بھی سب سے بڑی بات یہ کہ حیات انسانی کے مفہوم سے اس نے حیات کے بالکل ابتدائی دور کو مستثنیٰ نہیں رکھا، بلکہ رحم مادر میں جس جس وقت سے نطفہ قرار پاتا ہے، اسی وقت سے اُس نے اس پر زندگی کا اطلاق شروع کر دیا قدماء کے نزدیک اسقاط حمل مطلق معیوب نہ تھا۔ کیونکہ ایک تو اُس وقت یہ غلط طبی مسئلہ رائج تھا کہ حالت جنین میں زندگی نہیں ہوتی، دوسرے یہ بھی ایک بالکل قدرتی جذبہ ہے کہ جو رنج جوان آدمی کی موت سے اس کے اعزا و احباب کو ہوتا ہے، وہ ایک ایسی ہستی کی ہلاکت سے قطعاً ہمارے دل میں نہیں پیدا

هو سکتا جس کی طرف سے نہ ابھی ہمارے دل میں کچھہ توقعات قایم ہوئی ہیں اور نہ جسے جان دینے میں کچھہ تکلیف ہوتی ہے۔ ان اسباب کی بنا پر قدماء کے نزدیک اسقاط بالکل جائز تھا۔ ارسطو نے اسے نہ صرف جائز قرار دیا، بلکہ یہ کہہ دیا تھا کہ جب ملک کی آبادی ایک خاص حد سے بڑھنے لگے، تو اس قاعدہ کو حکماً نافذ کرنا چاہئے۔ مصنف ھذا کے علم میں یونان و جمہوریت رومہ نے کبھی اسے ناجائز نہیں قرار دیا، لیکن اگر جیسا بعض لوگوں کا خیال ہے، کسی زمانہ میں قانون نے اسے جرم قرار دیا بھی تھا، تو یہ قطعی ہے کہ اس قانون کا نفاذ کبھی نہیں ہوا۔ بلکہ متعدد مسیحی و مشرک مصنفین کی متفقہ شہادت ہے کہ یہ رسم اس زمانہ میں علانیہ و بالعموم جاری تھی۔ اس کے اسباب کیا ہوتے تھے؟ ایک افلاس، دوسرے حظ نفس کہ حمل کے زمانہ میں مرد کی صحبت ترک کرنا ہوگی اور تیسرے جسمانی زینت و خود آرائی کا شوق کہ وضع حمل و رضاعت سے عورت کے بعض اعضا میں مثل سابق کے رعنائی و خوش نمائی نہیں باقی رہتی۔ یہ مصنفین اس والدہ کا ذکر غیر معمولی مدح و ستایش کے ساتھہ کرتے ہیں، جس نے کبھی اپنی اولاد غیر مولود کو ہلاک نہیں کیا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ رواج عام تھا، اور اس کی تعلیم کی بڑی دلیل تو یہی ہے کہ حمل کو نہ ٹھیرنے دینا ایک مستقل پیشہ ہو گیا تھا، بیسیوں عورتیں تھیں، جن کا ذریعہ معاش یہی تھا کہ مختلف تدابیر سے وہ حمل نہ ٹھیرنے دیں اسی کے ساتھہ یہ ضرور ہے کہ 'اووڈ'، 'سنیکا'، 'جونیل'، 'پلوٹارک'، گو اس کی تعمیم کی پوری

شہادت دیتے ہیں ، تاہم اسے معصیت بھی قرار دیتے ہیں معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اس وقت رومی اسے معیوب تو سمجھنے لگے تھے ، لیکن اسے کچھ اہمیت نہیں دیتے تھے ۔

مگر مسیحیوں نے اپنی روش شروع ہی سے اس باب میں مختلف رکھی ۔ اپنے لب و لہجہ میں نہایت شدت قطعیت کے ساتھ اور بکمال تواتر و استقلال انھوں نے ہمیشہ اس رسم کو نہ صرف قبیح و مذموم ظاہر کیا ، بلکہ اسے صاف قتل عمد کے مرادف قرار دے دیا گرجا کی عمارت میں حصول تبرکات کے لئے داخلہ جن چند خاص جرایم کی شکل میں ممنوع قرار دیا گیا تھا اُن میں اسقاط کا جرم بچہ کشی کے مساوی رکھا گیا تھا ، بلکہ شروع شروع اس کا کوئی کفارہ بھی نہیں رکھا گیا تھا ، اور یہ ایسا جرم قرار دیا گیا تھا جو موت کے وقت تک کسی ریاضت کسی توبہ ، کسی استغفار سے محو ہی نہیں ہوسکتا ۔ اور گو اس اس سزا کی میعاد بعد کو گھٹا کر دس سال اور سات سال تک کر دی گئی ، تاہم یہ جرم ہمیشہ بہ طور معصیت کبیرہ کے شمار ہوتا رہا ۔ ایک عجیب بات یہ ہے کہ اس خیال کی زیادہ تائید ایک ایسے عقیدہ سے ہوئی ، جو پادریوں کے علم العقائد میں نہایت ہی مہمل عقیدہ ہے ۔ مشرکوں اور اکیلے مشرکوں پر کیا موقوف ہے عام طور پر دنیا کے نزدیک اسقاط و بچہ کشی اگر جرایم ہیں بھی ، تو کسی بالغ جیتے جی انسان کے قتل عمد کے مقابلہ میں یہ یقیناً ہلکے ہیں ، لیکن پادریوں کا عقیدہ اس کے بالکل برعکس تھا ۔ ان کے نزدیک بچہ کی جان ایک غیر معمولی اہمیت رکھتی تھی ۔ اُن کے عقیدہ کے بموجب جنین میں جونہی روح پڑی ، اُس پر آدم کے گناہ کی

ذمہ داری ، اور روز حشر کی مسئولیت عائد ہو جاتی تھی ، اور اگر وہ قبل ولادت ہلاک ہوگیا ، تو اُس کی روح یا تو (بہ قول کلیسائے یونان) ہمیشہ عالم برزخ میں پڑی رہے گی اور یا (بہ قول کلیسائے روما) قعر جہنم میں ڈال دی جائیگی - یہ عقیدہ گو بجائے خود مہمل ہے ، تاہم دلوں میں بچہ کی زندگی کی عظمت و اہمیت پیدا کرنے میں یہ بڑی حد تک موثر ثابت ہوا اور اسی کے اثر سے آج ہمارے دلوں میں بچہ کی زندگی کا وہ احترام قائم ہوگیا ہے ، جسے کوئی اعتقادی تغیر ، کوئی مذہبی تبدیلی کوئی تحول دین نہیں بدل سکتا - قرون اولی و وسطی میں جو شے مسیحیوں میں اطفال کشی سے سب سے زیادہ روکتی تھی ، وہ یہ خیال نہ تھا کہ بچے بلاوجہ قتل و ہلاک کئے جارہے ہیں ، بلکہ یہ تھا کہ وہ بلا اصطباغ کے قتل کئے جا رہے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ دائمی عذاب میں گرفتار رہیں گے - اسی زمانہ کے ایک شخص کا یہ افسانہ مشہور ہے کہ اُسے قبل ولادت بچہ کی حالت دیکھنے کا بہت شوق تھا ، ایک دن اسی اضطرار شوق میں اُس نے ایک حاملہ عورت کو قتل کر ڈالا - جس سے عورت اور بچہ دونوں مرگئے ، اب ہوش درست ہونے پر اُسے ندامت ہوئی ، اور توبہ ، استغفار کی نیت سے اُس نے ایک جنگل میں جاکر تنہا عبادت و ریاضت شروع کردی - سالہا سال کی مشقت کے بعد ایک صدائے غیبی آئی کہ "عورت کے قتل کا جرم معاف کردیا گیا" لیکن وہ مرتے مرتے مرگیا ، مگر یہ صدا اُس کے کان میں کبھی نہ آئی کہ طفل غیر مولود کے قتل کا گناہ بھی بخش دیا گیا ۔ اس

افسانہ سے یہ اندازہ ہوسکتا ہے کہ اولاد غیر مولود کے قتل کا جرم کس قدر سنگین خیال کیا جاتا تھا —

اسقاط کے بعد طفل کشی کا نمبر آتا ہے - اور اس میں شبہ نہیں کہ تمدن قدیم کے دامن پر طفل کشی کا ایک سخت بدنما دھبہ ہے - اس دستور کی تاریخ کچھہ عجیب سی ہے - وحشی ' جن کے دماغ میں جذبہ رحم و خدا ترسی بالکل ابتدائی و ناقص حالت میں ہوتا ہے اور جن کا خانہ بدوشانہ طرز معاشرت بجائے خود اُن پر بچوں کی پرورش و پرداخت وبال کر دیتا ہے - اُن کے یہاں غالباً عام دستور یہ ہے کہ بچہ کے پیدا ہونے پر والدین خود یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ اُسے زندہ رہنا چاہئے یا نہیں ' اور اگر نفی میں فیصلہ ہوتا ہے ' تو اُسے قتل کر ڈالتے ہیں - اس کے بعد تمدن کا جو درجہ آتا ہے ' اس میں یہ دستور بہت ہلکا پڑ جاتا ہے ' تاہم یہ نہ سمجھنا چاہئے ' کہ مدارج تمدن کے ساتھہ ساتھہ یہ دستور بھی مٹ جاتا ہے - کیونکہ شایستگی پھیلنے کے بعد یہ رواج از سرنو پھیلتا ہے گو اب اس کی محرک وحشیانہ شقاوت نہیں ہوتی ہے - بلکہ ناجائز حظ نفسانی کی سعی اخفاء ہوتي ہے - پھر بعض اقوام و ممالک میں یہ رواج یوں قایم ہو جاتا ہے کہ والدین اولاد کو اپنی عزیز ترین ملک سمجھہ کر خدا کی راہ میں بہ طریقہ قربانی کے نذر کردیتے ہیں - خود یونان میں اگرچہ عملاً یہ رواج عام طور پر جاری نہ تھا ' بلکہ مشہور تو یہ ہے کہ تھیبس میں یہ جرم سزاے موت کا مستلزم تھا ' تاہم علی العموم یونان میں یہ اصولاً بالکل جائز تھا اور اصول افادہ کی بناء پر

فلاطون و ارسطو، لایکرگس و سولن نے اسے قانوناً واجب کر دیا تھا - یہ بالکل ظاہر ہے کہ آبادی جب ایک حد متعین سے بڑھ جائے گی، تو یقیناً ملک کی فلاح و بہبود پر مضر اثر ڈالے گی، خصوصاً اگر ملک میں زیادہ تعداد بیکار و معطل العضو افراد کی ہوئی تو صریحاً ملک کو نقصان عظیم پہنچے گا - اس لئے یونانی قانون سازوں نے صاف یہ حکم دے رکھا تھا کہ جو مریض و معطل العضو اطفال جماعت و ملک کے لئے بار ہوں انہیں بے تکلیف طریقہ سے ہلاک کر ڈالنا چاہئے - یہ حکم ملکی خیر اندیشی و مصلحت شناسی کی بنا پر تو تھا ہی، اُس کو کچھہ تقویت تو یونانی عیش پرستی سے پہنچی جس کا یہ عالم تھا کہ کسی شوہر کو رضاعت وغیرہ کے زمانہ میں اپنی بیوی کی ہم بستری سے عرصہ تک محروم رہنا گوارا نہ تھا - اور کچھہ اس کی یوں بھی تائید ہوئی کہ مائیں، جو باپوں کی بہ نسبت صغیر سن اطفال سے زیادہ محبت و اُلفت رکھتی ہیں، اپنے شوہروں پر اس قدر اثر ہی نہیں رکھتی تھیں کہ انہیں اطفال کشی سے مانع آسکیں —

روسائے قدیم میں والدین کو اپنی اولاد کی موت و زیست پر اختیار حاصل تھا - اس اختیار کی بنا پر قتل اطفال کا شمار بہت زیادہ بڑھ گیا ہوتا - لیکن اس کی روک تھام کے لئے ایک اور نہایت قدیم قانون رومولس کے وقت سے موجود تھا، جس کا منشاء یہ تھا کہ والد پر اپنی تمام اولاد ذکور کو اور اولاد اُناث میں سب سے بڑی اولاد کو پرورش کرنا فرض ہے، اور کسی صحیح و سالم اولاد کو تاوقتیکہ اُس کی عمر تین سال کی نہ ہو جائے

قتل نہیں کرسکتا * - البتہ وہ ناقص العضو اولاد کو اس کی ولادت کے وقت ہلاک کرسکتا ہے ' مگر اپنے قریب ترین اعزہ میں سے پانچ آدمیوں کی منظوری کے بعد - رومہ کا اصل الاصول ' بہ خلاف یونان کے آبادی کو محدود کرنا نہیں ' بلکہ بڑھانا تھا - چنانچہ رومہ میں اطفال کشی کی کبھی گرم بازاری نہیں ہوئی بجز اس زمانہ کے کہ جب سلطنت کے دور انحطاط میں نفس پرستی وشہوت رانی کی عام ہوا چل گئی - مگر اس وقت بھی قانون سازان رومہ خاموش نہیں رہے بلکہ اُنہوں نے اسے سختی سے معیوب قرار دیا ' اور بالواسطہ قوانین کی مدد سے اس کا انسداد کرنا چاہا - مثلاً کثیرالاولاد اشخاص کو خاص حقوق و مراعات دیے ' مفلس والدین پر ٹیکس بہت ہلکے رکھے اور لاوارث بچوں کی حفاظت کا بھی ایک حد تک سامان کیا عام رائے بھی اس دستور کو مجرمانہ سمجھتی تھی ' چنانچہ عیسائیوں کے خلاف جو غلط الزامات لگائے جاتے تھے ' منجملہ ان کے ایک الزام یہ بھی تھا - با ایں ہمہ مسیحی و مشرکانہ دونوں شہادتوں سے ثابت ہوتا ہے - کہ اطفال کشی کا دستور رومہ میں انحطاط سلطنت کے وقت عام طور پر رائج ہوگیا تھا ' اور بہ قول ٹرٹولیسن کے اس باب میں جو قوانین موجود تھے اُن کی گرفت سے نہایت آسانی سے رہائی ہو جاتی ہے - اسي زمانہ میں بچوں کی ہلاکت

---

* عمر کی قید غالباً اس لئے تھی کہ اس اثناء میں والدین کو خواہ نہ خواہ بچہ سے محبت بڑھ جائے گی - اور تین برس کے پلے پلائے بچہ کی جان لیتے ہوے از خود وہ ہچکچائیں گے —

کے دو مختلف طریقے پیدا ہوگئے تھے - ایک تو یہ کہ اُنھیں براہ راست قتل کر ڈالا، دوسرے یہ کہ انھیں خود قتل نھیں کیا بلکہ کسی سنسان مقام پر جا کر تنھا چھوڑ ائے کہ وھیں پڑے پڑے ھلاک ھوجائیں - آخرالذکر جرم کبھی قانونی مواخذہ کے تحت میں نھیں آیا - چنانچہ یہ دستور نھایت کثرت کے ساتھہ کھلے خزانہ جاری رھا، اور مفلس والدین کے لئے کوئی شخص اسے سنگین جرم نھیں خیال کرتا تھا - یہ متروک بچے بہت سے تو ھلاک ھوجاتے تھے، لیکن اکثر صورتوں میں یہ ھوتا تھا کہ لوگ انھیں اُٹھا کر فروخت کرڈالتے تھے، اور عموماً لڑکے غلامی کے لئے، اور لڑکیاں طوائف کے پیشہ کے لئے خرید لی جاتی تھیں -

غرض اشاعت مسیحیت کے وقت اس خاص باب میں لوگوں کو یہ بتانے کی ضرورت نہ تھی کہ یہ معیوب ھے، البتہ اس جذبہ کو قوی کرنے، اطفال کشی کو سخت ترین معصیت قرار دینے اور متروک اولاد کی حفاظت کے سامان کرنے کی ضرورت تھی - چنانچہ مسیحیت نے یہ سب کچھہ کیا - اُس نے سب سے پہلے پرزور طریقہ پر اطفال کشی کو معصیت کبیرہ ٹھیرایا، جیسا کہ صفحات بالا میں گزر چکا ھے، اور پھر لوگوں کو یہ بھی بتایا کہ متروک اولاد کو اجنبیوں کے رحم پر چھوڑ دینا بھی ایک طرح پر انھیں قتل ھی کرنا ھے - مسیحیت کا یہ اثر قانون میں بھی اپنی جھلک دکھانے لگا - روایت ھے، کہ لیکٹینٹس کے مشورہ سے قسطنطین نے اپنے سنہ اصطباغ ھی میں یہ فرمان جاری کردیا کہ نادار والدین کی اولاد کے کھانے کپڑے کا خرچ سرکار کے ذمہ رھے گا - یہ قاعدہ

انٹو نانیس * کے عہد حکومت میں بھی جاری تھا ' لیکن قسطنطین نے اسے از سر نو باضابطہ صورت میں پہلے اٹلی میں جاری کیا ' اور پھر سنہ ۳۲۲ ع میں ' افریقہ ' تک اسے وسیع کردیا - سنہ ۳۲۹ ع میں یہ قانون نافذ ہوا کہ والدین اپنی اولاد کو فروخت کرنے کے بعد پھر قیمت دے کر اُسے واپس لے سکتے ہیں - سنہ ۳۴۱ ع میں اس قانون کا نفاذ ہوا کہ متروک اولاد جب کسي شخص کی زیر پرورش آ جاے ' تو وہ اُسی کی ملک ہوجاتی ہے ' وہ اُسے جس پیشہ میں چاہے لگا دے ' والدین کو اُس پر کوئی حق باقی نہیں رہتا اور نہ وہ اسے واپس لے سکتے ہیں-

مگر یہ آخرالذکر ہر دو قوانین ' صحیح معنی میں اصلاحی قوانین نہیں کہے جاسکتے ' کیونکہ ان سے بہتر قوانین پیشتر سے موجود تھے مثلاً ایک قدیم قانون مشرکوں کے زمانہ سے یہ چلا آتا تھا ' کہ والدین جب چاہیں انہیں متروک اولاد کو اجنبی مربیوں اور آقاؤں سے ' قیمت دے کر پھر واپس لے سکتے ہیں ' بلکہ ترجن نے تو یہاں تک حکم جاری کردیا تھا کہ اولاد متروک کسی صورت میں غلامی کے پیشہ میں نہیں لگائی جاسکتی - اس قانون کے مقابلہ میں قسطنطین کا سنہ ۳۳۱ ع والا قانون ' جس نے اولاد متروک کی دایمی غلامي پر مہر ثبت کردی کسی طرح قابل ستایش نہیں کہا جاسکتا - یہ قانون ' مغرب کی حکومت میں تو ہمیشہ جاری رہا ' البتہ مشرق میں یہ ہوا کہ سنہ ۵۲۹ ع میں جستینین نے پھر مشرکوں

---

* انٹونینس کے نام کے روما میں دو سلاطین ہوئے ہیں - یہ اُن کی جمع ہے —

کے قانون کی تجدید کر کے ' غلامی کے پیشہ کو متروک اولاد کے لئے بالکل ناجائز کردیا ' یہی حال " قسطنطین " کے دوسرے قانون " یعنی " سنہ ۳۲۹ م والے قانون کا ہے - کیونکہ متعدد مشرک تاجداروں بالخصوص ' کریکلا نے آزاد بچوں کی تجارت کو بالکل منع کر دیا ' اور ڈایوکلیشن نے تو اس باب میں بہت سخت قوانین نافذ کردیے تھے - البتہ قسطنطین ' کو اپنے قانون کے نفاذ کی ضرورت شاید اس لئے پیش آئی کہ ملک کی اندرونی لڑائیوں نے اس وقت صدہا باشندوں کو بالکل نادار بنا دیا تھا ' اور اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ غلاموں کی تجارت کو از سر نو رواج دیا جائے - اس کے بعد کی مختصر سرگزشت یہ ہے کہ ھنیو ڈو سیس اعظم نے یہ قانون نافذ کیا ' کہ متروک اولاد کو والدین ان کے مربیوں سے بلا قیمت دیے ہوئے واپس لے سکتے تھے ' کیونکہ جتنے دن انھوں نے خدمت لی ' یہ کافی معاوضہ ہوچکا - لیکن ویلسنیٹینن سوم نے اس قانون کو منسوخ کردیا - عملاً اولاد فروشی ' باوجود پادریوں کے شور و غل کے ' تھیوڈو سیس کے بعد مدتوں جاری رہی اور کسی مسیحی فرماں روا نے ڈایو کلشن مشرک کے مفید و اصلاحی قانون کی تجدید نہ کی —

اس طرح کے قوانین کا مقصد متروک اولاد کے تحفظ و بقا کے لئے سامان کرنا تھا ' لیکن ان کے علاوہ بعض قوانین ایسے جاری کئے گئے ' جن کا مقصد براہ راست اطفال کشی پر مواخذہ کرنا تھا یہ قوانین کب اور کس طرح جاری ہوئے ؟ یہ ایک بہت ہی بحث طلب و اختلافی مسئلہ ہے لیکن اس قدر غالباً صحیح ہے کہ مشرک واضعان قانون اطفال کشی کو قتل عمد کی ایک قسم قرار دیتے تھے -

گو اُسے اس قدر سنگین نہیں خیال کرتے تھے جتنا کہ قتل عمد کی اور اقسام کو ، چنانچہ اطفال کشی کی سزا' سزائے موت کی بجائے جلا وطنی تھی - قسطنطین نے ایک قانون کے ذریعہ سے جو شاید صرف افریقہ کے لئے مخصوص تھا جہاں بچہ اکثر زحل کی نذر کردیے جاتے تھے قتل اولاد کو قتل کی دفعہ میں رکھا ، ویلینٹینین نے سنہ ۳۷۴ ع میں اسے قتل عمد کا جرم قرار دیا ، اور متروک اولاد کے والدین پر خصوصیت کے ساتھ سختی کی - ساتویں صدی عیسوی میں اسقاط و اطفال کشی کی سزا یہ نافذ ہوئی کہ یا مجرم کی آنکھیں نکال لی جائیں یا اسے قتل کر ڈالا جاے - شارلمین نے اپنے عہد میں طفل کشی کے لئے سزاے موت رکھی —

اب آج یہ متعین طور پر دریافت ہونا دشوار ہے کہ ان قوانین نے اطفال کشی کا کس حد تک انسداد کیا ، تاہم مسیحیت کا اتنا اثر تو قطعی ہوا کہ متروک اولاد کی تجارت کا دروازہ بند ہو گیا اور دلوں میں طفل کشی کی اہمیت و معصیت پوری طرح جم گئی - اس جرم کے ارتکاب کا ایک بہت بڑا سبب والدین کا افلاس ہوتا تھا - مسیحیت نے اس کا بھی علاج کردیا - صدہا مسیحیوں نے فرداً فرداً متروک اولاد کو اُٹھا کر تعلیم و تربیت دی - اور چند صدیوں بعد یعنی قرون وسطیٰ کی ابتداء میں اجتماعی کوشش سے انھوں نے اس مقصد کے لئے پرورش گاہیں کھولنا شروع کردیں - چنانچہ روایت ہے کہ ایک ایسی پرورش گاہ تریوس میں چھٹی صدی میں ، اور اینگرس میں ساتویں صدی میں کھلی تھی ، اور آٹھویں صدی میں میلان میں ایک کا قایم ہونا تو یقینی طور پر ثابت ہے - نویں

صدی میں روین کے پادریوں نے ایک صلاے عام دیا کہ جو مائیں اپنے وضع حمل کو مخفی رکھنا چاھتی ھیں، وہ گرجا کے دروازہ پر اپنی اولاد نو مولود کو چھوڑ جایا کریں کہ یہاں اُن کی پرورش ھو جاے گی - ایسے بچوں کی تعلیم و تربیت غالباً گرجا کے خدام و غلاموں کے ساتھہ ھوتی تھی، کیونکہ ایسی اولاد کو غلام بنانا گرجا کے نزدیک کچھہ معیوب نہ تھا، جیسا کہ شارلمین کے ایک قانون اور آرلیس کے پادریوں کی مجلس شوری کے ایک فیصلہ سے ظاھر ھے کلیسا نے عورت کی بے عصمتی کو ام القبایح خیال کیا، اس لئے اس قسم کی پرورش گاھوں میں خاطرخواہ سرعت کے ساتھہ ترقی نہ ھوسکی - خود روما میں، جو اس قسم کے خیرات خانوں کا مرکز تھا، اس قسم کی پرورش گاہ میں تیرھویں صدی سے پیشتر نہ قایم ھوسکی - اور بارھویں صدی کے وسط میں میلان والوں پر یہ ایک سخت الزام عاید کیا گیا کہ وہ متروک اولاد کی تلاش میں رھتے ھیں - اس صدی کے خاتمہ پر مونٹ پیلیر کے ایک راھب نے روح القدس کے نام پر ایک انجمن قایم کی جس کا مقصد بچوں کو تعلیم و تربیت دینا تھا - اس انجمن کی پندرھویں صدی تک مختلف شاخیں، تمام یورپ میں پھیل گئی تھیں - اس کے ابتدائی مقاصد میں اگرچہ صرف جائز شادیوں کی یتیم اولاد کو تعلیم دلانا داخل تھا اور ناجائز بچوں کو یہ اپنے یہاں داخل کرنا حرام جانتی تھی - تاھم کچھہ عرصے میں متروک اولاد کی تربیت و پرداخت عملاً اسی کے ھاتھہ میں آگئی یہاں تک کہ بے انتہا رد و قدح کے بعد سینٹ و نسینٹ ڈی پال اٹھہ کھڑا ھوا، جس نے اپنے زور و قوت سے اس قسم کی پرورش گاھوں کے استحسان کو اصولاً و باضابطہ بھی منوا لیا - ان کار روائیوں کے اجرا کے وقت ان کے جواز و عدم جواز

پر بڑے بڑے معرکۃ‌الآرا مباحث رہے - ایک فریق یہ کہتا تھا کہ اس طرح کی سہولتیں بہم پہنچادینے سے بد چلنی و بے عصمتی کو اور تحریک ہوتی ہے' دوسرا گروہ اس کے جواب میں قتل انسانی کی معصیت شدیدہ کو پیش کرتا تھا - ان مباحث کی تفصیل بیان کرنا ہمارے موضوع سے خارج ہے - ان کے ذکر سے ہمیں صرف دکھانا یہ ہے کہ مسیحیوں نے اس کے لئے کتنے سامان کئے تھے - اور خواہ ان کی رائے غلط ہو یا صحیح' بہر حال انھوں نے نفس انسانی کی عظمت کا جو تخیل دنیا کے سامنے پیش کیا' اور حقیر سے حقیر حیات انسانی کا خواہ وہ غلام کی ہو' یا بچہ کی ہو' یا سیاہ کی ہو یا پھر کسی مفتوح وحشی کی ہو' جو احترام دلوں میں بٹھایا' وہاں تک قدماء کا طائر فکر بھی نہیں پہنچا تھا - چنانچہ آج دنیا کی مختلف جماعتوں اور قوموں میں نفس انسانی کا جو شرف و احترام مسلم ہے' یہ اسی تعلیم مسیحیت کا پرتو ہے —

اسقاط و طفل کشی کے انسداد میں مسیحیت نے جو کوششیں کیں ان کا ذکر گزر چکا - ان پر مسیحیوں کا فخر بجا ہے' لیکن بعض مرتبہ وہ اس فخر کو مبالغہ کی حد تک پہنچا دیتے ہیں - میرے نزدیک مسیحیت کا اصلی پرفخر کارنامہ جس میں کسی مبالغہ کی گنجایش نہیں یہ ہے کہ اس نے مناظر سیافی کا خاتمہ کرکے دنیا کے سامنے نفس انسانی کے احترام کا عملی نمونہ پیش کیا - در حقیقت' جب ہم یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ مناظر خونریزی کس طرح رومی زندگی و رومی تمدن کے اجزاے غیر منفک بن گئے تھے' اور کس طرح بہتر سے بہتر باشندگان رومہ اس کے متعلق چشم پوشی سے کام لیتے تھے جب جاکر کلیسا کی اصلاح کی پوری اہمیت کھلتی

ہے اور پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ اگر حکماء مشرکین شاذ و نادر کبھی ان رسموں کے خلاف آواز بلند کرتے بھی تھے، تو محض فلسفیانہ حیثیت سے اور صرف اس قدر بتانے پر قانع ہوجاتے تھے کہ یہ تماشے اخلاق شکن، خلاف انسانیت و وحشیانہ ہیں بہ خلاف اس کے مسیحیوں نے اس کی روک تھام بالکل مذہبی پیرایہ میں کی۔ وہ صرف اسے غیر محمود کہنے پر قانع نہیں ہوے، بلکہ انھوں نے اسے متعین طور پر قتل عمد کے درجہ میں رکھا جس کے لئے قاتل اور تماشائی دونوں روز حشر قابل مواخذہ ہوں گے - خیال کیجئے، تو یہ بہت بڑا فرق تھا —

اس دستور کے انسداد کی اجمالي کیفیت یہ ہے کہ مشرک حکومت کے دور آخر میں بڑی بڑی عظیم الشان سیاف گاهیں برابر تیار ہو رہی تھیں - بلکہ خود قسطنطین نے اپنے زمانہ تک بیسیوں وحشی قیدیوں کو جنگلی درندوں سے لڑنے کے لئے مجبور کیا تھا - سب سے پہلے سنہ ۳۲۵ م میں نالیس کے پادریوں کے دارالشوریٰ کے اجلاس کے بعد مسیحی فرماں روا کے حکم سے قلمرو روسہ میں سیافی کی ممانعت کا فرمان جاری ہوا - اول اول اس حکم کا نفاذ صرف بیروت (شام) بلکہ شاید اس کے صوبہ فنیقیہ تک محدود رہا، اور یہاں بھی اس پر عمل درآمد واجبی ہی واجبی ہوا - اور مغربی ممالک میں تو یہ تماشے کُھلم کھلا جاری رہے۔ سنہ ۳۵۷ ع میں قسطنطین نے خدام محل شاہی کو سب سیافوں کی صف میں داخل ہونے سے منع کیا سنہ ۳۶۵ ع میں ویلینٹینین نے یہ حکم نافذ کیا کہ کوئی مسیحی مجرم سیافی پر مجبور نہ کیا جاے - هنوریس نے امرا کے غلاموں کو سیافی کا پیشہ اختیار کرنے کی ممانعت کی گو اس سے اصل مدعا یہ تھا کہ سیافی کو روکنا نہیں، بلکہ یہ تھا کہ اُمراء کے پاس مسلح رفقا نہ رہ سکیں - ایک خاص بات یہ ہوئی کہ یہ دستور،

کبھی نئے دارالسلطنت قسطنطنیہ میں داخل ہونے پایا - خاص شہر رومہ میں یہ رواج گو کم ہو چلا تھا، تاہم تا وقتیکہ قانون نے اس کا قطعی استیصال نہیں کردیا' یہ رواج بالکل اُٹھا نہیں - قدیم مشرکانہ تمدن کا روشن ترین پہلو' مذہبی آزادی و رواداری اور تاریک ترین رخ بھی شوق سیافی تھا' لیکن افسوس سے کہنا پڑے گا کہ مسیحی حکومت نے آتے ہی آتے روشن پہلو کو مٹادیا، اور تاریک پہلو کو کچھہ عرصہ تک بر قرار رکھا، چنانچہ تھیوڈوسیس اعظم، جو بالکل پادریوں کے ہاتھہ میں تھا، اور جس نے مذہبی رواداری کا خاتمہ کردیا تھا، اُسے مشرکوں میں مقبولیت محض اس بنا پر حاصل ہوگئی کہ اُس نے وحشی قیدیوں کو سیافی پر مجبور کیا - اس کے علاوہ یہ بھی قطعی طور پر معلوم ہے، کہ سنہ ۳۸۵ ع و سنہ ۳۹۱ ع میں بلکہ تھیوریس کے زمانہ میں بھی سیافی کی نمایشیں وقتاً فوقتاً ہوتی رہیں، اور قیدیوں کو اکھاڑہ میں اُتارنے کا دستور تو بہت بعد تک قایم رہا —

لیکن اگرچہ خود دارالحکومت میں مناظر سیافی کا سد باب، مسیحی حکومت کے ۴۰ سال تک نہیں ہوا، تاہم اس باب میں مسیحیت و مشرکیت کی جو تعلیمات تھیں، اُن کے درمیان زمین و آسماں کا فرق تھا - بت پرستوں کے بہتیرے سلاطین اور بڑے سے بڑے حکماء میں سے (بجز جولین کی استثنائی مثال کے) کبھی کسی نے اس سے تعرض نہ کیا، بہ خلاف اس کے مسیحیوں کا یہ حال تھا کہ اُنھوں نے سیافوں کو بپتسمہ دینے سے انکار کردیا تھا، تاوقتیکہ وہ اپنے اس پیشہ سے توبہ نہ کریں، اور جوشخص مسیحی ہوکر اس کا تماشہ دیکھنے

جاتا، وہ گرجامیں حصول تبرکات سے محروم کردیا جاتا - اُن کے مصنفین و واعظین نے اس کے خلاف روز اول سے جہاد شروع کردیا تھا، اور پروڈنشیس شاعر نے براہ راست شہنشاہ کو مخاطب کرکے اس دستور کے انسداد کے لئے التجا کی - مشرق میں یہ دستور شروع ہی سے کمزور تھا، اور تھیوڈویس کے زمانہ میں بالکل بند ہوگیا اور اس کی جگہ گاڑی دوڑ نے لے لی - مغرب میں اس دستور کی زندگی کی آخری تاریخ سنہ ۴۰۴ ع تھا، اور جب کہ شہر رومہ میں تھوریس کے عہد میں یہ تماشہ ایک بار ہورہا تھا، کہ ایک ایشائی راہب دفعتاً اکھاڑہ میں کود پڑا اور فریقین کو چھڑانا چاہا اس پر خلقت اتنی برافروختہ ہوئی کہ اُس نے راہب پر پتھر برسانا شروع کئے اور اسی پتھراؤ میں وہ غریب شہید ہو گیا - لیکن اس کی شہادت سے بعد کو لوگ اس قدر متاثر ہوئے کہ یہ دستور ہی مٹ گیا - درندوں سے مقابلہ اب بھی جاری رہا، خصوصاً مشرق میں - لیکن افلاس اور درندوں کی کامیابی سے رفتہ رفتہ یہ دستور بھی مٹ گیا - اور اب اس کی جگہ کھیلوں اور "بازیوں" نے لی، جو گو حیوانات کے لئے سخت ظالمانہ تھے تاہم انسان کو ان سے کوئی خطرہ نہ تھا - مگر ساتویں صدی کے خاتمہ پر یہ "بازیاں" بھی موقوف کردی گئیں - اٹلی میں مصنوعی جنگ کا جو خونریز دستور تھا، اور جو قرون وسطیٰ میں برابر قایم رہا، اُس کی بنا بھی سیافانہ اکھاڑہ کی روایات پر تھی —

غرض سیافی کا استیصال یقیناً ایک ایسا موضوع ہے، جس کا ذکر مسیحی اثرات کے ذیل میں، مورخ پورے

فخر کے ساتھہ کرسکتا ھے - مسیحیت نے صرف اتناھی نہیں کیا کہ اس قدر خونریزی کو مٹادیا بلکہ لوگوں کے دلوں سے بیدردی ' شقاوت و قساوت کو نکال کر انسانیت کا معیار نہایت بلند کردیا ' اور یہ ایسی بڑی کامیابی تھی ' جس کی توقع بہ وادیٔ رفتار واقعات نہ مشرکانہ تمدن و شایستگی سے کی جاسکتی تھی ' اور نہ مشرکانہ فلسفہ سے بلکہ اُس کی جڑ رومی سر زمین میں ایسی مضبوط ھوگئی تھی کہ اس زمانہ میں اگر شمال کے فاتحین اٹلی پر حاکم ھوجاتے تو وہ بھی اس دستور کو اختیار کرلیتے ' پھر یہ دستور یورپ میں برابر قرون وسطیٰ میں قایم رھتا ' اور اس طرح انسانیت و تمدن کی ترقی ایک مدت غیر محدود تک رکی ھوئی رھتی - یہ صرف مسیحیت ھی میں قوت تھی کہ اُس نے راستہ سے اس بھاری پتھر کو ھٹادیا ' اس کامیابی کا سہرا مسیحیت اور صرف مسیحیت کے سر ھے اکثر مشرک اُمراء و رؤسا اپنی وفات کے وقت بڑے بڑے ترکہ سیافوں کے لئے چھوڑ جاتے تھے ' تاکہ اس سرمایہ سے اُن کی یادگار میں سیافی کے جشن منائے جائیں مسیحیت نے آکر یہ بتایا کہ ترکہ فقراء مساکین و اھل حاجت کے لئے ھے ' اور اس طرح بھی سیافی کے مٹانے میں بالواسطہ معین ھوئی اسی طرح دسمبر کا مہینہ جو ان ظالمانہ تماشوں کے لئے مخصوص تھا ' اُس میں مسیحیت نے بہ کمال دانشمندی ایک دوسرا جشن ' یعنی ولادت مسیح ' رکھہ دیا —

مسیحیت نے حیات انسانی کے شرف و احترام کا جو اعلیٰ ترین تخیل پیش کیا تھا ' اس پر بعض دفعہ مسیحی اس سختی سے عملدرامد کرتے تھے کہ کبھی کبھی قومی آزادی و ملکی قوانین سے ان کا تخیل بالکل تکرا جاتا تھا ان کا اصل الاصول

یہ تھا کہ کسی مسیحی کو دوسرے کی جان لینے میں معین نہ ہونا چاہئیے ، اور اس اصول نے مختلف شکلیں اختیار کی تھیں ، مثلاً یہ کہ کسی عیسائی کو فوج میں نہ داخل ہونا چاہئیے یا یہ کہ جلادی کا پیشہ نہ اختیار کرنا چاہئیے - یا پھر یہ کہ کسی شخص پر ایسا جرم نہ عاید کرنا چاہئیے جس کی سزا موت ہو - ان میں سے امر اول کی بابت کسی دوسری فصل میں ذکر آئے گا، البتہ امر دوم و سوم کی بابت یہاں دو لفظوں میں مختصراً بیان کئے دیتے ہیں ، قتل خواہ وہ بالکل جائز و قانون کے حکم ہی سے کیوں نہ ہو ، ہمیشہ سے معیوب سمجھا گیا ہے ، اور جلادی کا پیشہ ابتدا سے مذموم و ذلیل رہا ہے چنانچہ یونان و روما میں قانوناً جلادوں کو شہر کی چار دیواری سے باہر رہنے کا حکم تھا، اور روما میں انہیں شہر میں داخلہ کی ممانعت تھی - یہ خیال مسیحیت نے اپنی ابتدائی زندگی میں بالکل جذب کرلیا اور یہ حکم دیا کہ جو شخص اپنے ہاتھہ خون میں رنگے گا ، عام اس سے کہ وہ فرمان روائے وقت ہی ہو، جسے حمایت حق میں تلوار کھینچنی پڑی ہو، جب تک کفارہ نہ دے لیگا ، گرجا کے حصول تبرکات سے محروم رکھا جائے گا - ابتدائی تین صدیوں تک مسیحی ملکی و سیاسی مصالح سے مستغنی، اس خیال پر بالکل جمے رہے، لیکن چوتھی صدی میں جب کلیسا کو دینوی اقتدار بھی حاصل ہو چلا، تو اس خیال میں لا محالہ ترمیم کی ضرورت محسوس ہوئی - اور اگرچہ لیکیٹینٹس اب تک تمام خون ریزی کو ناجائز قرار دیتا رہا، یہ تاہم رائے بالاتفاق قرار پاگئی کہ پادریوں و راہبوں کے لئے کسی پر سزائے موت کا

جرم عاید کرنا جائز نہیں - پادریوں کی استثنائی حیثیت کا یہ اثر ہوا کہ وہ ملزموں کے شفیع و سفارش کنندہ بن کر مختلف درباروں اور عدالتوں میں جاتے تھے اور جب کبھی ان کے شہر یا قرب و جوار میں کسی جرم یا بغاوت کے انتقام میں سخت خون ریزی کا احتمال ہوتا، تو اهل شہر ان سے سفارشیں اٹھواتے اگلے زمانہ میں سلاطین کے مجسمہ اور مشرکوں کے معابد خاص حرمت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے، یعنی جو ملزم ان سے جاکر چمٹ جاتا، وہ قانون کی گرفت سے بچ جاتا، اب یہی حرمت گرجوں کو بھی حاصل ہوگئی - ایسٹر وغیرہ مسیحی ایام عید میں بھی ملزموں پر مقدمہ چلانا یا انہیں سزائے موت دینا ناجائز ہوگیا - اور روایت ہے کہ ملزموں کی بے گناہی و معصومیت کی شہادت میں بار ہا معجزات صادر ہوئے گو کسی ملزم کے ثبوت جرم میں کبھی کوئی معجزہ نہیں سرزد ہوا —

اس صورت حال سے جو اثرات پیدا ہوئے، انھوں نے بڑی وسعت حاصل کی ' اور بہت دور دور تک پھیلے - از آنجملہ یہ کہ —

(۱) عام اذہان میں رحم و در گزر کے تصور نے ایک خاص تقدس و الوہیت کا مرتبہ حاصل کر لیا ، اور حیات انسانی کے احترام میں روز بروز مبالغہ ہوتا گیا —

(۲) پادری و اہل کلیسا، اپنی شدید تعدیوں کے زمانہ میں بھی خون ریزی سے جھجکتے رہے - کفار و ملاحدہ پر یہ اور ہر طرح کی سختیاں روا رکھتے تھے - جائداد ضبط کرتے تھے، قید میں رکھتے تھے، جلا وطن

کراتے تھے ' حریت رائے کا بالکل سد باب کردیا تھا یہ سب کچھہ تھا' لیکن قتل کی سزا دینے میں بے حد تامل و پس و پیش کرتے تھے - چنانچہ خود سینٹ آگسٹائین' سینٹ ایمبروز ' سینٹ مارٹن ' جو اختلاف عقائد پر سخت سے سخت تشدد کو جائز رکھتے تھے' تاہم ان کو بھی کبھی سزائے قتل کی جرات نہیں ہوئی بلکہ جن لوگوں نے ایسا کیا' ان پر انھوں نے سخت ملامت کی —

(۳) ایک نتیجہ یہ ہوا کہ جب پادریوں نے دیکھا کہ قتل و خون ریزی کے بغیر کام نہیں چلتا' اور قتل جائز نہیں' تو لگے طرح طرح کی حیلہ تراشی' تاویل بازی کرنے - مثلاً ایک حکم یہ دیا کہ ملاحدہ کے خون کا قطرہ زمین پر بھی نہ گرنا چاہئے' لہذا انہیں زندہ جلا دینا چاہئے ! حیلہ تراشی کی یہ مثال دنیا کی تاریخ میں کچھہ انوکھی نہیں - اس کی اور نظیریں بھی موجود ہیں ' پلو تارک نے لکھا ہے کہ قدیم زمانہ میں پاک کنواریوں پر جب بد چلنی کا جرم ثابت ہوتا تھا' تو چونکہ ان پر تلوار اٹھانا منع ہے اس لئے زندہ دفن کردی جاتی تھیں - یا ایک اور فرقہ ہوا ہے جس کے نزدیک تلوار کھینچنا نا جائز تھا' لہذا وہ لوگ بد عقیدگی کے مجرموں کو لوہے کے گرزوں سے مار ڈالتے تھے - قتل و خون ریزی سے پادریوں کا اس زمانہ میں یہ تباعد' اگرچہ حیرت انگیز ہے' خصوصاً اس خیال سے ! کہ کچھہ مدت کے بعد انہوں نے اپنے ہاتھہ خوب ہی خون میں رنگے- لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اس رحم و رافت' عفو و

در گذر کے زمانہ میں بھی ملک کے ضابطہ تعزیرات میں کچھہ اصلاح نہ ہوئی قوانین مروجہ میں جو کچھہ اصلاح ہوئی وہ رواقیت کے اثر سے مشرک مقننین کے زمانہ میں ہوئی' اور اس باب میں مسیحیت کا کوئی ایسا کارنامہ وقیع نہیں ۔ ہمیں اس سے انکار نہیں کہ تھیوڈوس و جستنین کے زمانہ میں ضابطہ تعزیرات پر نظر ثانی ہوئی ۔ اور انھیں زیادہ منضبط بنایا گیا ' لیکن معدلت و مساوات قانونی کے اصول اساسی سب ہیڈرین و اسکندر سوریس کے عہد میں منقح ہو چکے تھے مسیحیوں نے اس میں کچھہ اضافہ کر دیا وہ بھی بہت قلیل وغیر اہم ۔ در حقیقت فلسفۂ رواقیت کے لئے یہ امر بس کرتا ہے کہ اُس نے جو کام چند سال میں انجام دے دیا مسیحیت اپنی صدیوں کے اقتدار و عروج کے باوجود بھی اس کی برابری نہ کر سکی ۔ یہ سچ ہے کہ قسطنطین نے اپنے زمانہ میں یہ قوانین نافذ کئے کہ مجرموں کے چہرہ کو داغا نہ جائے ۔ انھیں سیافی کا پیشہ اختیار کرنے پر نہ مجبور کیا جائے انھیں سولی نہ دی جاے (سولی کی سزا اس زمانہ میں سخت ذلیل و تحقیر آمیز خیال کی جاتی تھی) لیکن اس نرمی کی کسر مسیحی حکمرانوں کی اس سختی نے نکال لی تھی ۔ جس کے ساتھہ وہ طفل کشی' زنا' زنابالجبر وغیرہ کی سزائیں دیتے تھے ۔ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ تھیوڈیس سے نظام قانون میں جو دفعہ سب سے زیادہ قطعی طور پر کلیسا کے اثر سے رکھی گئی ' وہ کوئی اصلاحی دفعہ نہیں ' بلکہ وہ ہے جس کا منشایہ ہے کہ اہل کلیسا ایک مخصوص و معتوم طائفہ غالبہ ہیں اور جو شخص کیتھولک عقاید سے ذرا بھی منحرف ہے ' وہ گردن زدنی اور مستحق صد ہزار تعزیر ہے —

خیر - یہ ایک جملہ معترضہ تھا - چوتھا اور سب سے آخری اور سب سے اہم نتیجہ ، حیات بشری کے اس تقدس کا یہ ہوا کہ خود کشی ، انتہائی ملامت کی مورد قرار پائی - یہ ہم کہیں پہلے کہہ آئے ہیں کہ مشرکوں کے یہاں جب کبھی خود کشی کے خلاف صدا بلند ہوئی ہے ، تو حسب ذیل اسباب اربعہ میں سے کسی کی بنا پر : -

(۱) فیثا غورث و فلاطون کا مذہبی استدلال کہ تمام انسان خدا کے سپاہی ہیں - پس اپنی جگہہ کو بغیر حکم باری چھوڑ دینا گویا اس سے بغاوت کرنا ہے —

(۲) ارسطو ویونانی واضعان قانون کا سیاسی استدلال کہ تمام انسان حکومت کے خدام ہوتے ہیں - پس قتل نفس کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ ہم نے اپنی خدمت اصلی سے منہ موڑ لیا —

(۳) پلوٹارک کا نفسیاتی استدلال کہ خود کشی بزدلی کا نتیجہ ہے ، اور اس لئے انسان کی فطرت شجاعت کے شایاں شان نہیں —

(۴) اشراقیین جدید کا فلسفیانہ استدلال کہ ہر طرح کی حرکت افساد روح کا باعث ہوتی ہے اور خود کشی بھی ایک حرکت ہے —

قدما کے استدلال کا خلاصہ تمام تر یہ تھا - ان میں سے آخرالذکر کی تو مسیحیت میں گنجایش ہی نہیں نکل سکتی تھی - استدلال (۳) کی بنا انسان کی فطری مردانگی و شجاعت پر تھی اور یہ مسیحیت کے اس تخیل سے ٹکراتی تھی جو اُس نے انسان کے انکسار و فروتنی سے متعلق قایم کیا تھا گو کہا یہ بھی جاتا تھا کہ تحمل شداید اپنے تئیں ہلاک کر لینے سے زیادہ مردانگی کا مظہر

ھے - رہا استدلال (۲) سو وہ بھی ایک بڑی حد تک
مسیحیت کے منافی تھا - اگر اس پر عمل کیا جاتا تو
راہبانہ زندگی خاک میں ملی جاتی تھی، حالانکہ اس زمانہ
میں مسیحیت کی جان رہبانیت تھی - پھر اس کے معنی
یہ بھی تھے کہ انسان میں وطنیت پیدا ہونا چاہئے اور
ظاہر ہے کہ اسے مسیحیت روا نہیں رکھ سکتی تھی
موجودہ حکماء اخلاق کے پاس خود کشی کی ممانعت میں
بڑی مضبوط دلیل یہ ہے کہ اس سے نظام خاندان کی برھمی
کا اندیشہ ہے - لیکن اس زمانہ کے مسیحین و مشرکین
دونوں اس اصول سے نا آشنا تھے - مسیحی تو اس لئے کہ ان
کے اخلاق وفلسفۂ اخلاق کی بنیاد یکسر عالم آخرت کی جزا و سزا
پر تھی اور کسی دنیوی محرک کو اُن کے نظام اخلاق میں
دخل نہ تھا اور مشرک اس لئے کہ وہ افسر خاندان کو
صرف حاکم سمجھتے تھے اور اُس کے ذمہ فرایض مطلق نہیں
قرار دیتے تھے - اب صرف فیثا غورث و فلاطون کا استدلال
(۱) باقی رہا - یہ البتہ مسیحی معتقدات سے بالکل مل
جل گیا اپنی تکالیف میں خدا سے استعانت کرنا مصائب
میں اسی کی ذات کا بھروسہ رکھنا یہ خیال ایسا تھا جو
مسیحی دماغ کو خاص طور پر پسند ہوا - خود کشی میں
ایک بات یہ بھی ھے کہ گو شدت معصیت میں اور معاصی
اس سے بڑہ چڑہ کے ھوں تاہم خدا پر بے اعتمادی و بے
اطمینانی جیسی اس فعل سے ظاہر ہوتی ھے اور کسی
سے نہیں ہوتی —

اس عام محرک کے علاوہ اساطین مسیحیت نے اپنی
تعلیمات میں ترغیب و ترھیب کے چند اور عناصر کا بھی
اضافہ کر دیا، جنھوں نے خود کشی کی طرف سے نفس

بشری کو اور روک دیا، اُنھوں نے ایک طرف تو یہ کیا
کہ انسان کو خود کشی پر اُسی قدر مجرم قرار دیا جس
قدر کہ کسی دوسرے کے قتل پر - اور خود کشی کرنے
والے شخص کی روح کو طرح طرح کے عذاب کی وعیدوں
سے ڈرایا اور دوسری طرف خدا پر اعتماد و اطمینان اور
رضا و توکل کے جذبہ کو انتہائی قوت دی - آخرت میں
صابرین و شاکرین کو طرح طرح کے انعام کی چاٹ دلائی
اور دنیوی تکالیف کو گناھوں کا کفارہ بتایا - ان سب کا
مجموعی اثر یہ پڑا کہ یاس و قنوط کی وہ کیفیت جو
انسان کی آنکھوں میں دنیا تاریک کردیتی ھے اور اسے
خود کشی پر آمادہ کردیتی ھے، بڑے سے بڑے مصیبت
زدہ شخص کے دل سے بھی مٹا دی - قدیم فلسفہ کی یہ
کرامت تھی کہ اُس نے تکلیف کی مذمومیت و قباحت کو
دلوں سے مٹا دیا تھا، لیکن مسیحیت کا معجزہ یہ تھا
کہ اس نے تکلیف کو انسان کے لئے خوشگوار بنا دیا -

مگر مسیحیت کا یہ عام کلیہ بھی استثناء سے خالی
نہ تھا - کلیسا نے خود کشی کو دو صورتوں میں جائز
رکھا، یا کم از کم ان کے متعلق سکوت سے کام لیا - پہلی
صورت تو شہداء سے متعلق تھی - اس عقیدہ کے جوش
میں کہ شہادت فوراً تمام پچھلے گناھوں کو دھو دیتی
ھے، بیخود ھو کر صدھا پر جوش مسیحی مشرک حکام کے
سامنے دوڑ جاتے تھے اور ان سے التجا کر کر کے اپنے تئیں
شہید کراتے تھے اور بعض بزرگان کلیسا نے اس طرز عمل
کا استحسان کیا ھے - ایک صورت جواز خود کشی کی یہ
ھوئی - دوسری صورت اس سے زیادہ اھم و بحث طلب
یہ نکلی کہ دو شہزہ مسیحی لڑکیوں کی عصمت پر جب

دھبہ آنے لگے تو کیا کرنا چاھئیے ؟ بے عصمتی کو گوارا کرنا چاھئیے یا اپنی جان دیدینا چاھئیے ؟ سینٹ پلیمیا یک پانزدہ سالہ لڑکی تھی جس کی تعریف میں سینٹ ایمبروز و سینٹ کریز وستم رطب اللسان ھیں اسے ایک مرتبہ سپاھیوں نے پکڑ کر اپنی شہوت رانی کا آلہ بنانا چاھا اس وقت اس نے کہا کہ " میں اپنے کمرہ میں جا کر اچھی طرح پوشاک پہن لوں ' تب آتی ھوں " - یہ کہکر وہ گئی اور مکان کی چھت سے اپنے تئیں نیچے گرا کر ھلاک کر ڈالا - اسی طرح انطیوخ میں ایک مسیحی خاتون ڈومینڈیا نامی رھتی تھی جس کی دو لڑکیاں نہایت حسین و نہایت با عصمت تھیں - وہ ڈایو کلیشن کے زمانہ تعدی میں گرفتار ھوئیں اور جس وقت انھیں یہ اندیشہ ھوا کہ ان کی عصمت خطرہ میں ھے ان تینوں نے راستہ میں دریا میں گر کے جان دیدی - پھر اسی طرح ظالم و جابر میکر نیٹنتس روم کے اسقف اعظم کی حسین بیوی پر عاشق ھو گیا اور جب اور سب تدبیریں نا کام رھیں تو زبردستی کرنا چاھی - خدام شاھی اسے اس کے مکان سے اڑا لاے - اس وقت اس نے ایک علیحدہ کمرہ میں ایک منٹ کے لئے جانے کی مہلت مانگی اور وھاں جا کر بہ کمال مردانگی اپنے سینہ میں خنجر بھونک لیا - آج کل کے مناظرہ پسند پادری جو کچھہ کہیں واقعہ یہ ھے کہ قدیم مورخین کلیسا ان حالات کو انتہائی مدح و ستایش کے ساتھہ لکھتے ھیں —

کلیسا کے ابتدائی دور میں کسی حد تک صریحی طور پر خود کشی کی اسی صورت کو جواز کا فتوی ملا تھا - چنانچہ سینٹ ایمبروز نے دبی زبان سے اور سینٹ جیروم نے کھلم کھلا اس کی مدح سرائی کی ھے لیکن امتداد زمانہ

کے ساتھہ ساتھہ جوں جوں اس مسئلہ کو زیادہ اھمیت حاصل ھوتی گئی اس کا جواز مشتبہ ھونے لگا تا آنکہ سینٹ آگستائین نے اپنے مبسوط رسالہ میں یہ فیصلہ کردیا کہ حفظ عصمت کے لئے جاں دیدینا ھے تو بے شبہ بڑی ھمت و جوانمردی کا کام، تاھم اس سے اس کی مجرمانہ حیثیت زایل نہیں ھوجاتی - اس قول فیصل کو تقریباً سارے کیتھولک کلیسا نے تسلیم کرلیا اور اس پر اجماع ھوگیا کہ پلیجیا و دومیڈیا کے افعال کسی خاص الہام کی تعمیل میں تھے - غرض کلیسا کے دور ابتدائی میں اصولاً اگر خود کشی کی کوئی صورت جائز تھی تو وہ صرف یہی تھی اور اس کے سوا تمام صورتیں قطعاً ناجائز تھیں لیکن انسان بھی عجیب متناقض الخیال ھستی ھے - ایک طرف تو براہ راست وفوری خود کشی پر یہ لعنت ملامت تھی اور دوسری طرف اس طرز زندگی پر جو آھستہ آھستہ خود کشی کی طرف لے جاتی ھے چاروں طرف سے تحسین و آفرین ھوتی تھی - سینٹ جیروم نے اس سلسلہ میں ایک نو عمر راھبہ بلیلا کی عجیب داستان بیان کی ھے - یہ خاتون اس جرم کی مرتکب ھوئی جسے چوتھی صدی عیسوی میں لوگ تعیش سے موسوم کرتے تھے یعنی اس نے اپنی شادی کر لی - مگر سات ھی مہینہ کے بعد بیوہ ھو گئی اور اور اس طرح بقول اھل کلیسا کے "دو شیزگی کے ثواب اور ازدواج کی لذت دونوں سے محروم ھو گئی" - اسی زمانہ میں بیمار پڑی اور بیماری نے اس میں مذھبیت کا غیر معمولی جوش پیدا کردیا اپنی عمر کے بیسویں سال ایک خانقاہ میں بیٹھہ کر اس نے راھبانہ زندگی اختیار کرلی اور مذھبیت میں اسے اس قدر غلو حاصل ھوا کہ اب اسے جو

کچھ رنج و صدمہ تھا، وہ شوہر کی وفات کا نہ تھا بلکہ اس امر کا تھا کہ اس کی دو شیزگی غارت ہو گئی۔ کثرت روزہ داری و فاقہ کشی کا یہ نتیجہ ہوا کہ نوجوانی ہی میں زندگی ختم ہو گئی۔ اہل شہر کو جب اس کی موت کے اصلی سبب کی اطلاع ہوئی اور اس کی ماں کا ناقابل برداشت صدمہ دیکھا تو اہل شہر سخت برہم و متاسف ہوے شہر میں ایک ہنگامہ برپا ہوگیا اور لوگوں نے جنازہ پر ہجوم کرکے چلانا شروع کردیا کہ "مردود راہبوں کا گروہ یا شہر خالی کردے یا اس سے سنگسار یا غرق کردیا جاے" - یہ خیال عوام کا تھا مگر اہل کلیسا کا نہ تھا۔ وہ اس تدریجی و غیر محسوس خود کشی پر اظہار بیزاری کرنا کیسا اس سے اور خوش ہوتے تھے اور قرون اولیٰ و وسطیٰ کے راہبوں کی بابت جو روایات مشہور ہیں اگر ان کا عشر عشیر بھی صحیح مان لیا جاے تو معلوم ہوگا کہ بے شمار انسانوں نے اپنے ہاتھوں اپنی زندگیوں کا یوں ہی خاتمہ کرلیا تھا سینٹ فرانسس اسیسی جو اسی رہبانیت کا شہید ہے اس کی بابت یہ منقول ہے کہ اس نے اپنی موت کے قریب اپنے لاغر جسم کی طرف دیکھ کر کہا کہ "میں نے حقوق‌العباد میں اپنے ہی جیسے بندے گدھے کے ساتھ اداے حق میں کمی کی ہے"۔ اس کے بعد اس پر حالت کشف طاری ہوئی - جس میں اس نے دیکھا کہ وہ شب کی نماز میں مشغول ہے اور ہاتف غیب اس سے کہہ رہا ہے کہ "فرانسس دنیا میں کوئی گنہگار ایسا نہیں ہے جسے مسیح پر ایمان لے آنے کے بعد خدا نہ بخشے گا، البتہ وہ شخص جو اپنے تئیں استہلاک ریاضت میں گرفتار رکھتا ہے عذاب دایمی کا مستحق ہوگا" - فرانسس جب چونکا تو اس نے کہا کہ یہ صداے ربانی نہ تھی صداے شیطانی تھی —

اس تدریجی خود کشی کو تو انسان کی تناقض خیالی نے جائز رکھا لیکن یہ واقعہ ہے کہ کلیسا نے خود کشی کے صریحی طریقوں کا اپنے حدود کے اندر بالکل سد باب کردیا - لیکن بعض اہل اعتزال نے اسے جائز رکھا اور نہ صرف جائز رکھا بلکہ اس پر عملدرآمد بھی کرتے رہے - مثلاً چوتھی صدی میں ایک گروہ ایسا پیدا ہوا جس کے افراد جوق جوق مشرکوں کے معابد و مجالس میں جا جاکر قصداً ان کی توہین کرتے اور اس کی پاداش میں قتل پر قتل ہوتے چلے جاتے - اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ لوگ سینکڑوں بلکہ ہزاروں کی تعداد میں پہاڑوں پر چڑھ کر نیچے کودتے اور ان مرنے والوں کی تعداد اس قدر کثیر ہوتی کہ نشیب کی وادیاں خون سے سرخ ہوجاتیں - اس سے صدیوں بعد ایک فرقہ اور نکلا جس کا اصول یہ تھا کہ مہلک امراض میں گرفتار ہوکر یہ لوگ فاقہ کشی کر کرکے یا فصد کھلا کھلا کر موت کے بلانے میں عجلت کرتے تھے - قرون وسطیٰ میں یہود نے کیتھولک عیسائیوں کے مظالم سے تنگ آکر جو خودکشی شروع کردی ان کا شمار سب سے زیادہ ہے - فرانس میں سنہ ۱۰۹۵ع میں ہزارہا یہود نے مسیحی عقوبتوں سے بچنے کے لئے اپنے تئیں ہلاک کر ڈالا - صرف بہ مقام یارک ایک موقع پر ۵۰۰ یہود خوداپنے ہاتھوں قتل ہوے - اسی طرح ۱۳۴۰ع میں بھی ایک محاصرہ کے موقع پر ان کے خود کشوں کی تعداد اتنی ہی تھی - اس باب میں مشرکوں کا جو قدیم قانون تھا وہ تو تھیوڈوسیس و جیسٹینین کے قانون میں بدستور قایم رہا - البتہ پانچویں صدی میں پادریوں کی کونسل نے یہ فتویٰ صادر کیا کہ خود کشی کرنے والا حرام موت مرتا ہے اس کی لاش پر نہ نماز جنازہ جائز ہے اور نہ اس کی قبر پر فاتحہ خوانی - یہ اور اسی طرح کے اور فیصلے جو متعدد کونسلیں یکے بعد دیگرے

صادر کرتی ہیں بالآخر شارلیمین اور وحشی فاتحین کے ضابطہ تعزیرات کا جزو بن گئے - سینٹ لوئیس نے یہ بات نکالی کہ حرام موت مرنے والے کی ساری املاک و جائداد سرکار میں ضبط ہونا چاہئے رفتہ رفتہ ایسے شخص کی نعش کی بے حرمتی ہونے لگی - کہیں لوگ اسے گلی گلی گھسیٹتے پھرتے تھے، کہیں اسے لٹکا دیتے تھے کہیں اُسے مزبلہ بول و براز میں ڈال دیتے تھے اور کہیں اس میں آگ لگا دیتے تھے۔

ان بیہودہ و نفرت انگیز طریقوں پر زور دینے کا اور خصوصاً اس ناانصافی کا کہ مرنے والے کے ورثاء بے قصور جائداد سے محروم کردیے جاتے تھے، لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ اٹھارھویں صدی میں رد عمل کا آغاز زوروں سے ہوا - خود کشی کی اخلاقی حیثیت سے ایک معصیت کبیرہ ہونے میں تو کوئی شبہ نہیں لیکن میرے نزدیک یہ ایسا جرم نہیں جس میں سرکار کی مداخلت جائز ہو خصوصاً وہ حکومتیں جو اپنی رعایا کو اس کی پوری آزادی دیے ہوے ہیں کہ اپنے وطن کو چھوڑ کر جس ملک میں چاہیں جاکر آباد ہوجائیں، کیا حق رکھتی ہیں کسی شخص کو ترک دنیا سے روکنے کا؟ با ایں ہمہ میرے نزدیک یہ قول صحیح نہیں کہ قرون وسطیٰ کے قوانین مذکورہ بالا نفرت انگیز ہونے کے ساتھ ناکام بھی رہے - ناکام وہ ہرگز نہیں رہے خود کشی کے مرتکب عموماً وہ لوگ ہوتے ہیں جن کی عقل ضعیف اور متخیلہ قوی ہوتا ہے - ایسے لوگوں کو قابو میں رکھنے کا اس سے بہتر کوئی اور ذریعہ نہیں کہ ان پر دہشت و ہیبت طاری کردی جاے - باقی کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں، جو خوب سوچ سمجھ کر اس کا ارتکاب کرتے ہیں - ان کو بھی اس اثر سے باز رکھنے کا یہ نہایت بر اثر طریقہ ہے کہ ان کی وفات کے بعد ان کے اعقاب و پس ماندگان کو ہر طرح کی ذلت اور مالی و جسمانی نقصانات کا سامنا

کرنا ہوگا - قانون کے نفاذ کے جاری رہنے سے یہ تو ضرور معلوم ہوتا ہے کہ خودکشیوں کا سلسلہ برابر جاری رہا تاہم اس میں شبہ نہیں کہ کیتھولک دائرہ کے اندر اس کا ارتکاب صدیوں تک شاذ و نادرالوقوع رہا - البتہ اسپین میں گوتھک سلطنت کے آخری و پرآشوب زمانہ میں اس کا زور ہوا علی ھذا انگلستان میں ساتویں اور چودھویں صدی میں جب وباء طاعون پھیلی ہے یا پھر اسی طرح جب ھلڈیبرانڈ نے ہزارہا بیویوں کو ان کے راہب شوہروں سے علیحدہ کردیا ہے تو اُن میں سے بھی بہتوں نے اپنے ہاتھوں اپنے تئیں ختم کرڈالا - طبقۂ اُناث میں خودکشی اور بھی شاذ تھی - بلکہ ایک فاضل مورخ نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ بجزاندلس کی ایک نوعمر خاتون کے جو اپنے شوہر سے عرصہ دراز سے جدا تھی اور جو اپنی طبیعت کو اب قابو میں نہیں رکھہ سکتی تھی اور اس خیال سے خودکشی کرلی تھی ' کئی صدیوں تک اور کوئی مثال خودکشی کی نہیں ملتی خانقاہوں میں خودکشی کا ایک محرک یہ بھی ہوتا تھا کہ اکثر راہب جب یہ دیکھتے تھے کہ لذایذ دنیوی اب اُن کے ترک کئے نہیں ترک ہوتے ہیں یا جذبات و شہوات پر انہیں قابو نہیں حاصل ہوتا یا وساوس شیطانی سے نجات نہیں ملتی تو ان سب حالتوں میں مایوسی کا علاج وہ خودکشی ہی کو قرار دیتے تھے ۔ بعض مثالیں گو وہ اب شاذ ہیں اس کی بھی ہیں کہ محبت میں ناکامی یا شدت رہبانیت کا پیدا کردہ اختلال حواس بھی خودکشی کا باعث ہوا ہے ۔ لیکن بہ حیثیت مجموعی یہ کہنا بالکل قرین صحت ہے کہ خانقاہوں نے مایوسوں اور شکستہ خاطروں کو اپنے

سایۂ عاطفت میں پناہ دے کر زیادہ جانیں بچائیں ،
بہ مقابلہ اس کے کہ لیں - کلیسا کی اس تعلیم کی اس
کی دیگر تعلیمات کی طرح ، اسلام نے بڑی تقلید کی ،
اور نہ صرف تقلید کی بلکہ اس میں خاص غلو سے کام
لیا - چنانچہ خودکشی کی صریح ممانعت کا حکم انجیل
میں نہیں بلکہ قرآن میں ہے اور مسیحیت نے جو توکل
و رضا کی تعلیم دی تھی اُسے اسلام نے مبالغہ کرکے جبریت
و تقدیر پرستی تک پہنچا دیا اسلام و مسیحیت کی
متعدد کوششوں کا یہ اثر ہوا کہ متمدن و شائستہ
دنیا میں صدیوں تک کسی نے خود کشی کا نام بھی نہیں
سنا جب ہم مسیحیت کے اس کارنامہ کو پیش نظر
رکھتے ہیں اور ساتھ ہی یہ یاد کرتے ہیں کہ یونان و رومہ
کی دنیائے متمدن میں یہ رواج کس قدر عام تھا ، اور
ڈنمارک سے لیکر اسپین تک کے غیر متمدن قبائل میں
یہ وبا کس قدر عالمگیر تھی تو بے شبہ ہم اس کا پورا
اندازہ کرسکتے ہیں کہ مسیحیت کا اثر تاریخ اخلاق پر
کیسا عمیق ، وسیع و مفید پڑا ہے —

اس افسوسناک رواج کی تاریخ کے آخری ابواب
ابھی ذکر کرنے سے رہ گئے - اصلاح کنیسہ کی تحریک سے
یورپ میں خودکشیوں کی تعداد میں کچھ اضافہ نہیں
ہوا - کیونکہ اب کیتھولک و پروٹسٹنٹ دونوں فرقوں میں
وہ مذہبی جذبات پوری طرح پیدا ہوگئے تھے جو خودکشی
کے موانع ثابت ہوتے ہیں - اس زمانہ میں اس کا زور یورپ
میں نہیں بلکہ امریکا میں تھا جو ابھی نیا دریافت
ہوا تھا اسپین والوں نے یہاں کے باشندوں کو فتح
کرکے یہ کیا کہ ان کو اپنا غلام بنانے لگے اور اُن پر

طرح طرح کے مظالم توڑنا شروع کئے - اس پر مفتوحوں نے بھی انتہائے مظلومیت میں خودکشی کا طریقہ اختیار کیا کہ اس سے کم از کم وہ عقوبتوں سے تو بچ جائیں گے - ہزارہا امریکی باشندے اس طرح خود اپنے ملک الموت ثابت ہوئے تا آنکہ اسپین والوں نے اپنی چالاکی سے انھیں یہ یقین دلایا کہ انھیں مرنے کے بعد بھی عذاب سے نجات نہیں ملے گی کیونکہ یہی اسپینی آقا آسمان پر بھی موجود ہونگے اور وہاں بھی انھیں غلامی پر مجبور کریں گے - یورپ میں اس زمانہ میں اگر یہ دستور کسی فرقہ میں رائج تھا تو جادوگرنیوں میں - یہ بد نصیب لاغر اندام و ضعیف العقل عورتیں جن کی ساری عمر عموماً تکالیف و مصائب میں گزرتی ' اور جنھیں نہ آخرت میں کسی چین و آرام کی توقع ہوتی اکثر ھجوم یاس وقنوط میں اپنے تئیں ھلاک کرداتیں ایک فرنچ جج کا بیان ھے کہ صرف اس کے علم میں ایک سال کے اندر پندرہ سائرہ عورتوں نے خودکشی کی - اس طرح کے واقعات کے اسباب عموماً خوف و دہشت و اختلال حواس ہوتے رہے ھیں-لیکن اکثر ایسا بھی ھوا کیا ھے کہ جنون خود کشی کی وبا پھوٹتی ھے حال میں مارسیلز وایونس کی عورتوں میں اور قدیم زمانہ میں فلسطین کی عورتوں میں دفعتاً اس وبا کا پھوٹنا اسی کی مثالیں ھیں - اسی طرح پندرھویں صدی کے خاتمہ سے لے کر سترھویں صدی کے خاتمہ تک بعض اضلاع میں یہ جنون جاری رھا کہ ھزارھا آدمی سمندر کی طرف جوق جوق جاتے تھے اور دور سے اس کی لہریں دیکھکر دفعتاً بے اختیار اس کی طرف فرط مسرت سے گاتے ہوئے دوڑتے اور جاکر اس میں کود پڑتے

خیر ان واقعات کا ذکر تو ہم نے یوں ہی بہ سبیل تذکرہ کر دیا ان کی اصلی جگھہ تاریخ امراض دماغی ہے - تاریخ اخلاق نہیں - یہاں کہنے کی بات یہ ہے کہ بعض موثرات ایسے بھی جمع ہوگئے - جنھوں نے یہہ مجنونانہ خود کشی کی تھی بلکہ دیدہ دانستہ خود کشی کی تعداد میں غیرمعمولی اضافہ کردیا - یونانی و رومی لٹریچر کی طرف جو تازہ توجہ ہوئی اس نے اس مبحث کو خصوصیت کے ساتھہ منظر عام پر لا کھڑا کیا - اب کیتھولک موءلفین اور ان کے بعد گرو شیس و پفنڈورت کے اتباع نے یہ کہنا شروع کردیا کہ خود کشی بعض صورتوں میں جائز ہے مثلاً گناہ یا فحش سے بچنے کے لئے ' اپنے دوست کی جان بچانے کے لئے یا اس قیدی کو جو جانتا ہو کہ اسے سخت عقوبتوں سے ہلاک کیا جاے گا - یا پھر اس قیدی کے لئے جو جانتا ہے کہ جو سرنگ وہ اڑا رہا ہے اس میں خود اس کی جان جانا یقینی ہے - اس زمانہ کی خود کشیوں میں مشرکانہ خود کشیوں کے اثر کی جھلک صاف نظر آرہی ہے - چنانچہ فاپ استروزی پر جب الگزنڈر اول کے قتل کا جرم عاید ہوا ہے تو اس خوف سے کہ کہیں تشدد و عقوبت کی تاب نہ لا کر وہ اپنے رفقاء کا نام ظاہر کردے - اس نے خود کشی کرلی اور ایک خط اس مضمون کا لکھہ کر چھوڑ گیا کہ " میں اپنی روح خدا کے سپرد کرتا ہوں اور یہ دعا کرتا ہوں کہ اگر میرا مرتبہ اور زیادہ بلند نہ ہو تو کم از کم وہ درجہ تو ضرور عطا ہو جو کیٹو و دیگر قدیم خود کشوں کو عطا ہوا تھا - " یہ حال تو عام یورپ کا تھا - خود انگلستان میں یہ رواج سترھویں صدی اور اٹھارھویں

صدی کی ابتدا میں نسبتاً اور زیادہ عام تھا بلکہ اس کی تائید میں رسالے تک لکھے گئے - سر ٹامس مور نے اپنی کتاب میں جہاں ایک بے عیب جمہوریت کا مرقع کھینچا ہے، وہاں ایک منظر یہ دکھایا ہے کہ لا علاج مریضوں کو حکام و پادری بہ خوشی خود کشی کی اجازت دے رہے ہیں البتہ جو لوگ بغیر حصول اجازت اپنے تئیں ہلاک کر رہے ہیں ان کی تجہیز و تکفین نا جائز ہے۔ اسی زمانہ میں ڈاکٹر ڈون نے بھی جو سینٹ پال کے گرجا کے متولی تھے، ایک عالمانہ مگر مغلق رسالہ خود کشی کی تائید میں لکھا اور مرتے وقت اپنے بیٹے سے یہ وصیت کی کہ اسے بجنسہ اسی حالت پر رہنے دیا جاے اور نہ شایع کیا جاے نہ ضایع کیا جاے - لیکن بیٹے نے باپ کی وصیت کے ایک ٹکڑے کو نہ مانا اور سنہ ۱۶۴۴ ع میں اسے شایع کردیا - دو تین انگریز خود کشوں نے بھی اپنے پیچھے اپنے فعل کی حمایت میں رسالے چھوڑے علیٰ ھذا ایک باشندہ سویڈن نے جس کا نام روبک تھا سنہ ۱۷۳۵ ع میں اپنے تئیں غرق کرکے جان دی اور آیندہ سال خود کشی کی تائید میں اس کا رسالہ شایع ہوا جسے بہت مقبولیت حاصل ہوئی - لیکن ان سب سے بڑھ چڑھ کر اور سب سے زیادہ موثر فرنچ حکماء انقلابئین کی تحریریں ثابت ہوئیں - مانٹین اصولاً تو خود کشی کو جائز نہیں ٹھیراتا، البتہ قدیم خود کشوں کی مدح و ستایش میں نہایت رطب‌اللسان نظر آتا ہے - مانٹسکیو نے اپنی نو عمری میں ایک رسالہ تصنیف کیا جس میں اس کی پرزور حمایت کی - روشو کا طرز عمل اس باب میں در حقیقت عجیب و غریب رہا ہے اس نے ہو

رسالے اس موضوع پر لکھے ھیں پہلے میں شد و مد سے خود کشی کی تائید کی ھے اور دوسرے میں خود ھی اپنے سابقہ دلائل کی تردید کی ھے' انھیں پرفریب بتایا ھے اس عمل کو فرض شناسی کے نقطۂ خیال سے انتہائی غداری و خود غرضی کا نمونہ بتایا ھے اور جو لوگ اس کی طرف میلان رکھتے ھیں انھیں مشورہ دیا ھے کہ وہ رفاہ عام کے کسی کام میں اپنی طبیعت کو مشغول کرلیں - والٹیر اپنے بہترین کلام میں مخصوص حالات میں اسے جائز سمجھتا ھے - اس کا یہ عقیدہ ملاحدہ میں بہت مقبول ھوا اور ھولبک و ڈی لینڈس اس کی تائید پر زور شور سے کمربستہ ھو گئے رفتہ رفتہ کچھہ تو انحطاط مذھبیت کے اثر سے کچھہ طبایع میں عموماً نرمی و لینت پیدا ھو جاتی اور پھر کچھہ اس باعث بھی کہ لوگوں کو اب قانونی مداخلت کے صحیح حدود نظر آ نے لگے تھے خود کشی کے خلاف جو سخت قوانین نافذ تھے ان کی مخالفت میں رد عمل شروع ھوا گروشنیس نے ان کی تائید کی تھی - مانٹسکیو نے ان کی پر زور تردید کی ' گو آخر میں اس کا یہ جوش کسی قدر مدھم ھوگیا تھا - بیکاریا نے جسے جماعت حامیان رد عمل کا اصلی نمایندہ کہنا چاھئے - ان قوانین کی دو باتوں کی بنا پر مخالفت کی ایک تو اس لئے کہ یہ بے قصور اعقاب وپس ماندگان کےحق میں نا منصفانہ ھیں' دوسرے اس لئے کہ جو شخص خودکشی کا تہیہ کر چکتا ھے - یہ اُسے اس قصد سے باز رکھنے کے لئے بالکل ناکافی ھوتے ھیں یہ جماعت فوراً کامیاب نہیں ھوئی کیونکہ ھم پاتے ھیں کہ سنہ ۱۷۴۹ ع تک میں جب کہ یہ جماعت اپنے شباب پر تھی

خاص پیرس کی گلیوں میں ایک خودکش بوریتو کی لاش بہ کمال بے حرمتی گھسیٹی گئی۔ اور پرانے قوانین برابر جاری رہے تا آنکہ سنہ ۱۷۸۹ ع میں انقلاب عظیم برپا ہوا جس نے ان قوانین کو منسوخ کر دیا اور جس، نے جہاں رعایا کو اور ہر قسم کی آزادی دلائی وہاں اسے حریت موت بھی عطا کی۔ انقلاب کے زمانہ میں جہاں اور ہر شے میں ہیجان وتلاطم برپا ہو گیا وہاں خودکشی کرنے والوں کی تعداد بھی کئی گنی بڑھ گئی اور جوں جوں اس عام طوفان میں سکون پیدا ہوتا گیا خود کشیوں کی رفتار بھی اپنے معمولی درجہ پر آ گئی۔ لیکن وہ قوانین جو ایک مرتبہ منسوخ ہو گئے تھے پھر دوبارہ نافذ نہ ہو سکے۔ چنانچہ فرانس میں اب تک اس بارہ میں کوئی قانون نہیں۔ دوسرے ممالک میں جہاں ایسے قوانین ہیں اُن کا مقصد ہی محض اس قدر ہے کہ حرام موت مرنے والے کی لاش پر مذہبی مراسم نہ ادا کئے جائیں۔ خود انگلستان میں لاش کی بے حرمتی و تذلیل کے قوانین جارج چہارم کے عہد میں منسوخ ہوے۔ لیکن یہ ظالمانہ دفعہ اب تک یہاں کے قانون میں درج ہے کہ خود کشی کرنے والے کی ساری جائداد سرکار میں ضبط ہو جائے گی۔ گو یہ ضرور ہے کہ جمہور کا رجحان عام اس قانون پر عمل در آمد بالکل نہیں ہونے دیتا —

مسیحی دنیا کے احساس عام نے البتہ اس نقطۂ نظر کا کسی قدر کفارہ کر دیا ہے جس سے معلمین مسیحیت اس فعل کو دیکھتے تھے؛ گو اسی کے ساتھ اُس نے قدیم سختیوں کو نرم کر دیا ہے اور قدیم طرز استدلال کو متروک کردیا ہے۔ اس میدان میں ایک خاص کار نامہ

میڈم دی استیل کا ھے - اس فرنچ ادیبہ نے اپنی ایک ابتدائی تصنیف متعلق بہ جذبات میں خودکشی کے فعل کو سراہا تھا - لیکن آگے چل کر اس نے اس خاص موضوع پر ایک نہایت فلسفیانہ سنجیدہ و عمیق رسالہ لکھا جس نے انقلاب کی پیدا کردہ تخریب اخلاقی کی ایک تعمیری شکل پیدا کردی - اس نے ان تمام قدیم مسلمات کو ترک کردیا کہ خودکشی ایک طرح کا قتل عمد ھے یا یہ کہ یہ أم الجرایم ھے یا یہ کہ نامردی و بزدلی کی دلیل ھے - اس نے مذھبی تخویف و ترھیب اور عالم آخرت کی وعیدوں سے بھی بالکل قطع نظر کرکے یہ بتایا ھے کہ ایک بااخلاق شخص کو کن شرایط کا جامع ھونا چاھئے - اور یہ شرایط کیونکر اُسے خودکشی سے مانع ثابت ھونگے - اُس نے نہایت موثر و دل نشین پیرایہ میں یہ دکھایا ھے کہ انسان جن چیزوں کو مصائب و آلام سمجھتا ھے وہ درحقیقت اس کی اصلاح سیرت و تزکیۂ اخلاق میں نہایت معین ھوتے ھیں نیز یہ کہ تسلیم و رضا کی خو ڈالنا اور شداید پر تحمل و صبر کرنا انسان کا بزرگ ترین فرض اور لازمۂ اصلاح اخلاق ھے - اس کے بعد وہ تفصیل کے ساتھہ انجیل کی تعلیمات پر نظر کرکے بتاتی ھے کہ انسان کی عظمت و شرافت کا اصلی معیار اس کی عدم خود غرضی اور دوسروں کی بھی خواھی ھے - شہادت و خودکشی میں موازنہ کرکے وہ دکھاتی ھے کہ اول الذکر نام ھے فرض کی قربان گاہ پر جان دینے کا اور آخرالذکر کہتے ھیں حالات غیر مساعد کے مقابلہ سے اُکتا کر جان سے گزر جانے کو اور اس بنا پر وہ کیٹو کی خودکشی کو خودکشی کے مخالفین و موافقین دونوں کے علی‌الرغم شہادت سے تعبیر کرتی ھے

کہ اس سے مقصود دوسروں کی بھلائی تھی - پس ایک نیک با اخلاق و پاکباز شخص کا مطمح نظر دوسروں کی نفع رسانی ہونا چاہئیے ، اسی غرض کے لئے اُسے زندہ رہنا چاہئیے ، اس مقصد کے پیچھے اُسے اپنی ہر طرح کی لذات و مسرات میں ایثار سے کام لینا چاہئیے اور اسی خاطر اُسے زندگی کے بار کو برداشت کرتے رہنا چاہئیے خواہ وہ کتنا ہی ناگوار ہو —

اس طرح کے جذبات مسیحیت کی وساطت سے یوروپین معاشرت کے خمیر میں داخل ہو گئے ہیں اور ہمارے زمانہ میں خود کشی تمام تر نتیجہ رہ گئی ہے یا تو جنون کا یا اور ایسے دماغی امراض کا جن سے انسان کا توازن ذہنی قایم نہیں رہتا اور یا پھر یاس و قنوط کے اُس ہجوم کا جس میں اُمید بالکل رخصت ہو جاتی ہے - اُن امور کو پیش نظر رکھہ کر میرے نزدیک اُن لوگوں کی مسرت زیادہ حق بجانب نہیں جو واقعات خود کشی کی کمی پر مسرور ہورہے ہیں کیونکہ اعداد کی شہادت اس کے بالکل برعکس ہے - اور وہ پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ جو اقوام علمی و تمدنی حیثیت سے جتنی زیادہ ترقی یافتہ ہوتی ہیں اسی نسبت سے اُن میں خود کشیوں کی کثرت ہوتی ہے - ایک آدہ جگھہ شدید مذہبیت نے اسے ذرا دبائے رکھا ہے لیکن مختلف ممالک ، مختلف اقوام ، مختلف ازمنہ اور ایک ملک کے مختلف ضلعوں اور ایک ہی ضلع کے شہر و دیہات کے حالات کے موازنہ سے اس کلیہ کی تصدیق ہو جاتی ہے - اس صورت حال کے اسباب میرے نزدیک متعدد ہیں - مثلاً یہ کہ —

(۱) دماغی مشاغل عموماً جنون و امراض دماغی کی پیدایش

میں معین ہوتے ہیں —

(۲) متمدن ملکوں میں خود کشی کے ہر واقعہ کو جو شہرت دی جاتی ہے۔ اس سے ضعیف الدماغ افراد میں خواہ مخواہ ریس اور تقلید کی تحریک ہوتی ہے —

(۳) متمدن ممالک میں جس طرح دولت و ثروت کی فراوانی ہوتی ہے۔ اسی طرح افلاس و فلاکت کی بھی شدت ہوتی ہے۔ تجارتی کشمکش، کاروباری مقابلہ و مسابقہ جس طرح دفعتاً پست کو بلند کرتا ہے۔ اُسی طرح یک بیک بلند کو پست بھی کر دیتا ہے —

(۴) پہلے جو چیزیں تکلف و آرایش میں شامل ہوتی ہیں، تمدن انھیں ضروریات میں داخل کردیتا ہے اور اس لئے انسان ان کے فقدان کا صدمہ دل سے محسوس کرتا ہے۔

(۵) مختلف سہولتیں اور نزاکتیں پیدا ہو جانے سے متمدن قوم کا ہر فرد ایسی خیالی و فرضی تکالیف کا شکار رہتا ہے جن کی طرف غیر متمدن افراد کا وہم و گمان بھی نہیں جاتا۔

(۶) مذہبی بے اعتنائی، تشکیک و دہریت کے پھیل جانے سے دل سے وہ دہشت مٹ جاتی ہے جو خود کشی کی بڑی روک رہتی ہے —

(۷) رشک و مسابقت ترفع و حریت اور عدم قناعت کے جذبات جو لوازم تمدن ہیں رضا و تسلیم کے دشمن ہیں اور اس لئے قدرتی طور پر خود کشی کی تحریک میں معین ہوتے ہیں —

§*§

فصل (۳)

مسیحیت کا دوسرا سبق : اخوت انسانی

مسیحیت کا سب سے بڑا کار نامہ یہ تھا کہ اس نے حیات بشری کا احترام قایم کیا دوسرا کار نامہ یہ تھا کہ نوع انسان میں مساوات و اخوت پھیلائی۔ پہلے کا ذکر پچھلی فصل میں گزر چکا دوسرے کا بیان اب کرتے ہیں اور اس سلسلہ کا آغاز عنوان غلامی سے کرتے ہیں۔

مشرکوں کے زمانہ میں غلاموں کی جو حالت تھی اس سے ناظرین روشناس ہو چکے ہیں مختصر یہ کہ غلامی اس وقت پوری طرح جائز تھی گو سینکا و دیگر حکماء اخلاق نے شد و مد سے مساوات انسانی کی تعلیم دی تھی اور بہ آواز بلند کہا تھا کہ آقا و غلام کی تفریق محض سطحی و غیر حقیقی ہے۔ اور آقا کو غلام کے ساتھ پوری انسانیت سے پیش آتے رہنا چاہئے یہ تو نظری تلقین تھی، عملی زندگی میں ظلم و شقاوت اور رحم و راحت دونوں کی کافی نظیریں ملتی ہیں۔ مظالم کے انسداد کے لئے ہڈرین، انطونیوں، اور الگزنڈرسیورس کے زمانہ میں قوانین پاس ہوے تھے اور یہ طے ہو گیا تھا کہ آقا کو غلام کی جان پر کوئی اختیار نہیں اور غلام کشی اسی قدر قابل نفرت ہے جتنا کہ قتل عمد ہوتا ہے۔ اور گو یہ صحیح ہے کہ مقنن پارٹی نے اس میں یہ شاخ نکال

کے کہ جرم قتل عمد کے لئے یہ لازمی ہے کہ ہلاکت کی نیت بھی ہو اور اس لئے غلام اگر سزا پانے کے دو چار روز بعد مرے تو مالک سے باز پرس نہیں ہوسکتی، کیونکہ اس کی نیت ہلاکت کی نہیں ثابت ہوتی - آقاؤں کو بڑی آزادی دی تھی، لیکن اس آزادی کی تحدید اُن قوانین سے ہو گئی تھی جن کا منشاء غلاموں کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید اور خانگی زندانوں کی ممانعت تھی -

قانونی حیثیت سے اس باب میں قسطنطین کے قبول مسیحیت سے دو سو سال تک رفتار اصلاح بہت ہی سست رہی - مسیحی فرماں رواؤں نے دو مرتبہ یعنی سنہ ۳۱۹ و ۳۲۶ میں اس طرف توجہ کی، لیکن قدما، جو کچھ کہہ گئے تھے، اُس سے ایک قدم آگے نہ بڑھ سکے - ان کے قوانین کا خلاصہ یہ تھا کہ اگر آقا فلاں فلاں طریقہ پر تعذیب کرے اور اُس میں غلام مرجائے تو آقا پر قتل عمد کا جرم عاید ہوتا ہے لیکن اگر سزا دہی کا مقصد محض تادیب و تنبیہ ہو اور تعزیر معمولی قسم کی ہو جس سے غلام مر جائے تو اس میں آقا بالکل بے قصور ہے اور اس پر کسی طرح کا جرم نہیں عاید ہوتا - بعض شارحین اس قانون کا یہ منشا سمجھتے ہیں کہ صرف مناسب و تادیبی سزاؤں کی اجازت تھی مثلاً سزاے تازیانہ، یا سزاے قید، لیکن میرے نزدیک اس قانون کی تعبیر صحیح نہیں در حقیقت اس میں تا وقتیکہ غلام ہلاک نہ ہو جاے کسی طریقہ تعذیب و عقوبت کی ممانعت نہ تھی اور نہ آقا پر کسی طرح کی گرفت تھی - ایک عجیب بات یہ ہے کہ اس کو یہودیوں کے اس قانون سے پورا توارد و توافق حاصل ہے کہ غلام اگر آقا کی تعذیب سے

فوراً نہ مرے بلکہ دو ایک دن کے وقفہ کے بعد مرے تو آقا سے کسی طرح کا مواخذہ نہیں ہوسکتا۔

غلامی کا دستور جس زمانہ میں بت پرستی سے منتقل ہوکر مسیحیت میں آیا ہے اس میں یہ دو نقائص انتہا درجہ کے شدید تھے، ایک یہ کہ غلاموں کے ازدواج کا کوئی قانونی جواز نہ تھا؟ دوسرے یہ کہ آقا کو اب تک تعذیب و عقوبت کا پورا حق حاصل تھا۔ جستینین سے قبل مسیحی سلاطین نے ان نقائص کے دور کرنے کی کوئی خاص کوشش نہیں کی اور زنا کاری کی روک تھام کے لئے جو کار روائیاں جاری تھیں غلام ان سے اس بنا پر محروم رکھے گئے کہ "ان کی نجاست انھیں حدود قانون کے اندر لانے کی روادار نہیں ہوسکتی" البتہ ایک قانون کی رو سے غلاموں کو سولی دینے اور قسطنطین کے ایک رحیمانہ قانون کے مطابق ان کے اہل خاندان کے یکجا نہ رکھنے کا دستور اٹھ گیا تھا۔ ایک اور قانون ان سے زیادہ اہم یہ منظور ہوا کہ غلاموں کو آزاد کرنا ایک کار ثواب ہے اور اتوار کے روز گرجا میں یہ رسم ادا کی جاسکتی ہے۔ بعض احکام ایسے بھی جاری کئے گئے جن کی بنا پر یہودی آقاؤں کے مسیحی غلاموں کو آزادی حاصل ہوگئی اور دو چار بار غلاموں کو بطور رشوت کے آزادی دی گئی تاکہ وہ اپنے آقاؤں کے جرائم کی مخبری کریں۔ غلاموں اور آزادوں کے درمیان ازدواج قطعاً ممنوع تھا۔ اور اگر کسی آزاد عورت اور غلام سے آشنائی پائی جاتی تو عورت قتل کرڈالی جاتی اور غلام زندہ جلادیا جاتا مشرکانہ قوانین میں عورت کا مرتبہ غلاموں کے مساوی تھا اور غلامان مفرور کے لئے بڑی سخت سزائیں تھیں —

مسیحی قانون نے بت پرستوں کے قانون پر شروع شروع کچھ اصلاح ضرور کی، لیکن یہ ایسی اصلاح نہ تھی جیسی بعض

متاخرین مسیحی مصنفین مبالغہ آمیزی سے بیان کرتے ھیں۔ مسیحیت نے اپنے وجود کے دو سو سال بعد تک جو کچھہ اصلاحیں کیں ان کا ماحصل یہ تھا کہ تعذیب و عقوبت میں کسی قدر نرمی کردی گئی اور غلاموں کو آزادی دلانے میں کچھہ سہولتیں پیدا کردی گئیں - لیکن انھیں کے پہلو بہ پہلو اس باب میں بہت سخت قوانین نافذ کردیے گئے کہ کوئی غلام اپنے آقا کے خلاف کسی قسم کی قانونی چارہ جوئی نہ کرسکے - بلکہ گریشین کے زمانے میں تو یہ قانون پاس ہوگیا کہ جو غلام بجز اس کی غداری و بغاوت کے اور کسی قسم کا استغاثہ اپنے آقا کے خلاف عدالت میں لاے گا وہ بلا اس استغاثہ کی تحقیقات کے زندہ جلا دیا جاے گا —

یہ حالت دو صدیوں تک رہی - اس کے بعد جستینین کے زمانہ میں البتہ نئے نئے اور اهم قوانین پاس ہوے اور یہ بے شبہ اصلاحات سے صحیح طور پر موسوم کئے جاسکتے ھیں - اس کی اصلاحات تین عنوانات کے تحت میں آتی ھیں - اول یہ کہ غلاموں کو آزاد کرنے میں جتنی رکاوتیں تھیں اس نے انھیں دور کردیا - بلکہ لوگوں کو اس کار ثواب کی طرف خاص طور پر متوجہ کیا اور کلیسا کو اس باب میں خاص اختیارات دیے - دوسرے یہ کہ آزاد شدہ غلاموں کو پورے وهی حقوق دے دیے جو معمولاً آزاد شہریوں کو حاصل تھے یہ در حقیقت بہت بڑی اصلاح تھی - اس کے بموجب یہ ایک معزز خاتون کے لئے بالکل جائز ہوگیا کہ آج ایک غلام کو آزاد کرے اور کل ھی اس کے ساتھہ شادی کرلے - وقس علی ھذا - تیسرے یہ کہ اب غلام کے لئے بالکل جائز قرار پاگیا کہ وہ اپنے آقا کی اجازت سے کسی آزاد عورت سے شادی کرسکتا ھے اور اُس کی غلامی کے زمانہ کی جو اولاد

ھو وہ اس کی آزادی پا جانے پر اُس کی وارث جائز ھوسکتی ھے - لونڈیوں کے ساتھہ زناکاری بھی اب ویسا ھی جرم قرار پاگئی جیسا کہ آزاد عورتوں کے ساتھہ یعنی دونوں کی سزا سزاے موت ھوگئی —

یہ اصلاحات قانونی اگرچہ بجائے خود نہایت اھم تھیں تاھم مسیحیت کا اصلی کارنامہ اس باب میں ان قانونی اصلاحات کے اندر تھیں ، کیونکہ یہودیوں کے ھاں غلامی سرے سے معدوم تھی اور بعض رواق حکماء نے موروثی غلامی کو بالکل ناجائز قرار دیا تھا - بہ خلاف اس کے مسیحیت کے ھاں غلامی بالکل جائز تھی بلکہ اس نے سرشت انسانی میں اطاعت کیشی و غلامی کا مادہ اور زیادہ پیدا کر دیا تھا - رھی پادریوں کی یہ تعلیم کہ کل انسان آپس میں بھائی ھیں تو یہ تعلیم تو رواقیہ بہت پیشتر دے چکے تھے - غرض اس حیثیت سے غلاموں پر مسیحیت کا کوئی خاص احسان نہیں - اُس کے اصلی احسانات یہ تین تھے —

(۱) اس نے انسانی اخوت و مساوات کا ایک نیا تخیل پیش کیا جس نے ذات پات اور درجہ بندی کی تعریف کو مٹایا —

(۲) اس نے غلاموں کی اخلاقی عظمت قایم کردی —

(۳) اُس نے غلاموں کو آزادی دلانے کی خاص تحریک کی —

ذیل میں ھم ان تینوں کو علیحدہ علیحدہ بیان کرتے ھیں -

(۱) پہلا مقصد مسیحیت نے اس طرح پر حاصل کیا کہ عملی زندگی کے ھر شعبہ میں آقا و غلام کی تفریق کو مٹا دیا - اصطباغ لینے یا تبرکات حاصل کرنے ، نماز

پڑھنے اور دعائیں مانگنے میں دونوں برابر و ہم درجہ تھے - جرایم کی سزا جیسی ایک کو ملتی ' ویسی ہی دوسرے کو - پہلے یہ قاعدہ تھا کہ قانون بھی آقا و غلام میں فرق کرتا تھا ' لیکن مسیحیت نے مجرم و مستغیث کی حیثیت سے قانون کی نظر میں دونوں کو ایک کردیا - جن آقاؤں کی سزاے تازیانہ سے غلام مرجاتے تھے وہ ہمیشہ کے لئے گرجا میں حصول تبرکات سے محروم کردیے جاتے تھے - لونڈیوں کی عصمت پیشتر ایک ناقابل لحاظ شے تھی - گرجا نے اسے خاص اہمیت دی اور غلاموں کے لئے یہ بالکل جائز ہوگیا کہ آزادی حاصل کرکرکے پادری ہوجائیں - چنانچہ یہ بارہا دیکھنے میں آیا کہ ایک آقا نزع کے وقت اپنے آزاد شدہ غلام کے جو اب پادری ہوگیا ہے ' قدموں پر سر رکھے اپنے لئے دعائے مغفرت کرا رہا ہے —

(۲) دوسرا مقصد مسیحیت نے یوں حاصل کیا کہ اُس نے انہیں خصوصیات کو اخلاقی عظمت دیدی جو غلاموں میں پائے جاتے ہیں - مشرکوں کے ہاں غلامانہ زندگی مرادف تھی تحقیر و تذلیل کی اور ایسا ہوتا بالکل بجا تھا - کیونکہ قدماے روم کے نزدیک جو معیار اخلاق تھا ' اس میں وہی خصوصیات شامل تھیں جو غلامانہ زندگی کی بالکل منافی اور آزاد زندگی کے لوازم ہیں ' مثلاً بلند نظری ' خود داری ' خود اعتمادی ' بیباکی ہمت و اقدام وغیرہ - مسیحیت نے جو معیار اخلاق قایم کیا - وہ اس کے بالکل برعکس تھا - اس کے نزدیک اس کے عناصر ترکیبی وہ تھے جن کے ڈانڈے غلامانہ زندگی سے بالکل ملے ہوے ہوتے ہیں - مثلاً انکسار فروتنی' اطاعت کشی' صبر' تسلیم و رضا اس بنا پر یہ بالکل قدرتی امر تھا کہ پہلے

جس تحقیر و تذلیل کا غلامی کے ساتھہ تلازم تھا وہ اب مٹ جاے - میرے نزدیک مسیحیت کا یہ اثر انتہائی اہمیت رکھتا ہے - قدیم رومی معیار اخلاق کے پھیلنے کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ گو عروج و امن کی حالت میں اہل روم اپنے اعلیٰ اخلاق کا پورا ثبوت دیتے لیکن مصیبت و شورش کے وقت وہ ضبط وتحمل سے کام نہ لے سکتے - مسیحی معیار اخلاق کے رایج ہوجانے کا یہ نتیجہ نکلا کہ تحمل و صبر کی مثالیں کثرت سے پائی جانے لگیں - چنانچہ غلاموں نے یہ دیکھہ کر کہ مسیحی معیار اخلاق ان کی طرز زندگی کے عین مطابق ہے، مسیحیت میں جوق جوق داخل ہونا شروع کردیا (یہاں تک کہ آزادگان رومہ یہ طنز کرنے لگے کہ مسیحیت تو غلاموں کا مذہب ہے) اور اس وقت کے شہداے مسیحیت کی فہرست میں ایک آدہ نہیں متعدد غلاموں کے نام نظر آتے ہیں - اور اٹلی میں باز نطینی طرز کی جو بہترین و اولین عمارت ہے یعنی سینٹ وینال کا گرجا وہ ایک غلام شہید کی یادگار میں بنا ہے —

(۳) تیسرے مقصد کے حصول کی یہ صورت ہوئی کہ قسطنطین نے غلاموں کی آزادی دلانے کو جو کلیسا کے تعلق کردیا اور اس راستہ میں ہر طرح کی سہولتیں پیدا کردیں اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس رسم نے ایک مذہبی حیثیت اختیار کرلی - مذہبی حیثیتوں اور تہواروں کے موقع پر یہ رسم خصوصیت کے ساتھہ ادا کی جانے لگی اور گناہوں کے کفارہ کا یہ ایک نہایت عمدہ طریقہ قرار دیا گیا - اب جس کثرت سے غلام آزاد کئے جانے لگے اس کا اتنا اندازہ ان اعداد سے ہوسکتا ہے - سینٹ ملینیا نے ۸۰۰۰ غلام آزاد کئے - سینٹ اویدس

نے ۵۰۰۰، کرومینٹس نے ۱۴۰۰، ھرمس نے ۱۲۰۰، اور سینٹ آگستائن و متعدد اشخاص نے بھی بہت کثرت سے محض حصول ثواب کی غرض سے رفتہ رفتہ یہ رواج اتنا پھیل گیا کہ شادی وغیرہ کی ھر تقریب میں اس سے کام لیا جانے لگا - کوئی بیماری سے اچھا ہوگا ایک بردہ آزاد کرے گا - کسی گھر میں ولادت ہونے والی ھے وہ ایک بردہ آزاد کرے گا - کسی کی شادی ہوئی ھے وہ ایک بردہ آزاد کرے گا - کوئی حالت نزع میں ھے وہ اپنے غلاموں کو آزاد کرے گا - قرون وسطیٰ کے بہت سے وصیت نامے ملے ھیں جن میں یہ صاف لکھا ھے کہ ''بہ غرض ایصال ثواب اتنے غلام آزاد کئے جائیں - '' اس رسم کا یہاں تک گہرا اثر پڑا کہ تیرھویں صدی میں جب فرانس میں کوئی غلام آزادی کے لئے باقی نہیں رہ گیا تو لوگ ایسی مذھبی تقریبات کے موقع پر پرندوں کو قفس سے رھا کرنے لگے —

قسطنطین کے بعد غلامی یورپ میں ۸۰۰ سال تک رھی - اس مدت میں گو غلاموں کی تعداد بدستور رھی لیکن ان کے مرتبہ و حیثیت کی نوعیت میں کسی قدر فرق ہو گیا - پہلے غلام محض غلام ہوتے تھے - مگر اب وہ زیادہ تر کاشتکاری کے کام پر لگائے جانے لگے اور ان کی حیثیت محض غلام کی نہیں رھی بلکہ مزدوروں کی سی ہوگئی - مغرب میں اس کے دو سبب ہوئے - ایک طرف یہ ہوا کہ وحشی اسیران جنگ کی آمد رک گئی - بڑے بڑے امیر خاندان مفلوک الحال ہوگئے شہری زندگی کی چہل پہل کم ہوگئی اور وحشی فاتحین زیادہ غلاموں اور خادموں کے عادی نہیں رھے دوسری طرف خود کاشتکاروں نے شدت افلاس سے اپنے تئیں بڑے

زمینداروں کے ہاتھہ کاشتکاری کے کام کے لئے فروخت کرنا شروع کیا ان دونوں اثرات سے مغرب میں قدیم طرز کی غلامی کا رواج از خود کم ہو گیا - مشرق میں یہ صورت پیش آئی کہ بڑے خاندانوں نے اپنی تنگدستی دیکھہ کر کچھہ تو خود غلاموں کی تعداد میں تقلیل شروع کی اور کچھہ ملک میں زراعت زیادہ پھیلانے کے لئے سرکاری طور پر بہت سے غلام کاشتکاری کے کام پر لگا دیے گئے - غرض مغربی و مشرقی دونوں حکومتوں میں اب غلامی محض کی جگہہ کاشتکارانہ غلامی نے لے لی - رفتہ رفتہ ایسے بھی اقتصادی تغیرات پیش آتے گئے - جنھوں نے غلامانہ کاشتکاری پر آزادانہ کاشتکاری کو ترجیح دیدی ایک طرف یہ ہوا دوسری طرف جو ایصال ثواب کے لئے بکثرت غلاموں کو آزادی مل رہی تھی اُس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غلاموں کی تعداد روز بروز گھٹنے لگی ، تا آنکہ بارھویں صدی میں یورپ میں گنتی کے چند غلام رہ گئے اور چودھویں صدی میں تو غلام ایک ایسا اسم رہ گیا جس کا مسمیٰ یورپ بھر میں گویا ایک بھی نہ تھا —

اسی سلسلہ میں یہ ذکر کرنا بھی غالباً بے محل نہ ہو گا کہ غلاموں کو آزادی دینے کے علاوہ قیدیوں کو فدیہ دے کر چھڑانے میں مسیحیت کا جو احسان ہے اُسے بھی دنیا نہیں بھول سکتی - ایسے وقت میں جب کہ وحشیوں کے متواتر حملوں سے ساری جماعت کا شیرازہ منتشر ہو رہا تھا - جب کہ بڑے بڑے شاندار و پر رونق شہروں میں دیکھتے دیکھتے سناٹا چھا جاتا تھا ، جب کہ اٹلی کی نئی نسل یا تو نذر شمشیر ہو رہی تھی اور یا پابہ زنجیر ، پادریوں کی کوشش ہمہ وقت یہ رہتی تھی

کہ اسیروں کو راحت پہنچائیں اور انھیں رہائی دلائیں۔ سینٹ ایمبروز نے ایک بار تمام اہل کلیسا کے علی الرغم یہ کیا کہ جب حملہ آوران گوتھ نے بہت سے اسیران جنگ گرفتار کر لئے تو اُس نے میلان کے شاندار گرجا کا تمام سامان آرایش فروخت کرکے ان قیدیوں کو فدیہ دے کر چھڑا لیا۔ اُس وقت تو اس کے اس فعل پر بڑی شورش ہوئی لیکن جب سے سینٹ گری گوری نے اس پر اپنی منظوری کی مہر لگا دی کسی کو مجال اعتراض نہ رہی اور یہ دستور عام ہو گیا۔ اس طرح جب روسی فوج نے ۷۰۰۰ ایرانی گرفتار کئے اور اُن کے کھانے پہننے کا کوئی انتظام نہیں کیا تو باوجودیکہ اہل ایران مسیحیت کے جانی دشمن تھے آسیدا کے پادری اکیسیس نے یہ کہہ کر کہ "خدا زیورات سے مستغنی ہے" اپنے کلیسا کا تمام ساز و سامان فروخت کر ڈالا اور اس کے فدیہ سے ان قیدیوں کو رہائی دلا کر انھیں پھر ان کے ملک میں بہ خیر و خوبی واپس کر دیا۔ اس کے بعد سے پھر تو بیسیوں مثالیں ملتی ہیں۔ ڈیوگوتیس، سینٹ آگسٹائن، سینٹ گریگوری، سینٹ قیصر یئس، سینٹ اکسوپیریس، سینٹ ہیلیسری، سینٹ ریمی، سینٹ سایبرین، سینٹ ایپنیفیس، سینٹ آویٹس، سینٹ ایلیجیس، سینٹ ڈیا لینس، غرض کوئی کہاں تک نام گنائے۔ ان سب نے اپنا طرز عمل یہی رکھا۔ مدت دراز کے بعد جب مسلمان حملہ آوروں کے ہاتھ میں ہزارہا قیدی پڑنے لگے تو پھر پادریوں کے اسی فیاضانہ جذبہ کو تحریک ہوئی اور وہ اسی سرگرمی سے اس میں حصہ لینے لگے۔ بارھویں صدی میں جان آف ماتھا، اور تیرھویں صدی میں پیٹر نولسکو کی زیر صدارت خاص اسی مقصد کے لئے انجمنیں قایم ہوئیں۔ مسیحی احسانات کی فہرست کا آخری عنوان خیرات

ھے صفحات بالا میں ضمناً کہیں کہیں اس کا ذکر آ چکا ھے لیکن اب اسی پر هم مستقل طور سے کچھہ کہنا چاھتے ھیں - سب سے پہلے یہ سمجھہ لینا چاھئے کہ مشرکانہ و مسیحیانہ طرز خیرات میں عظیم‌الشان فرق تھا - خیرات وسیع پیمانہ پر صرف وھیں جاری ھوسکتی ھے' جہاں ایک بڑی جماعت مفلس و بیکار موجود ھو - رومہ میں جتنے مفلس تھے وہ سب کے سب غلام تھے' یا رئیسوں کے طفیلیوں میں ھوتے تھے - غرض بیکار کوئی بھی نہ تھا - اس بنا پر اس زمانہ میں خیرات خانوں کے اجراء کا کوئی محل نہ تھا اور ان کی تعداد کی بنا پر مسیحی و مشرکانہ خیرات کا موازنہ صحیح نہیں ھو سکتا - البتہ قدماء کے نزدیک یہ امر فرائض سلطنت میں داخل تھا کہ اهل ملک کی کفالت کی جاے - یونان نے اس بارہ میں جو کچھہ کیا اس سے قطع نظر کیجئے - خود رومہ کے مفلسوں کی حالت دیکھئے تو معلوم ھوگا کہ صدیوں تک ھزارھا لاکھوکھا مخلوق کو سرکار کی طرف سے مفت غلہ تقسیم ھوتا رھا - یہ دستور یوں تو رومہ میں شروع سے موجود تھا لیکن رومی سال کے سنہ ۶۳۰ میں یہ قانون باضابطہ منظور ھوا کہ ناداروں کو برائے نام قیمت پر غلہ دیا جایا کرے - دو سال کے بعد امرا نے جوڑ توڑ کر کے اسے منسوخ کرادیا لیکن سنہ ۶۷۹ میں یہ بالآخر از سر نوجاری ھوا - سنہ ۶۹۱ میں اسے اور وسعت دی گئی - سنہ ۶۹۵ میں کلوڈیس پٹلچر نے برائے نام قیمت کو بھی اڑا دیا' اور تقسیم کو جو ماھوار ھوتی تھی بالکل مفت کردیا جو لیس سیزر کے کے زمانہ میں ان خیرات پانے والوں کا شمار ۳۲۰۰۰۰

تھا - اور گو اس نے ان کی تعداد نصف کردی لیکن آگسٹس کے وقت میں وہ پھر بڑھ کر ۲۰۰۰۰۰ تک پہنچ گئی - اس تاجدار نے تقسیم کو بجائے ماھانہ کے سہ ماہی کردینا چاھا! لیکن عام رائے کے سامنے اسے اپنی تجویز کو مغلوب کردینا پڑا - رفتہ رفتہ یہ دستور رومی زندگی کا ایک جزو اھم بن گیا - اور متعدد عہدہ داروں کا ایک خاص محکمہ اس کے لئے قایم کردیا گیا - انتونانیس کے زمانہ میں خیرات پانے والوں کا شمار ۵۰۰۰۰۰ سے بھی متجاوز ھو گیا - سورس نے غلہ کے ساتھہ روغن کا بھی اضافہ کردیا آریلین نے ماھانہ تقسیم غلہ کے بجائے روزانہ روٹی اور سور کے گوشت کی تقسیم جاری کی رفتہ رفتہ روم کے علاوہ قسطنطنیہ، اسکندریہ، انطیوخ اور غالباً اور اکثر شہروں میں بھی یہ دستور رائج ھوگیا —

غرض رومہ قدیم میں خیرات کے وجود سے انکار نہیں اس کا وجود تھا اور بہ افراط تھا لیکن ناظرین کو یہ معلوم ھوچکا ھے کہ یہ شے معین ھوئی رومی اخلاق کے انحطاط میں خیرات خواہ کیسی ھی بے محل و مسرفانہ عمل ھو مگر عموماً اس کا اثر یہ ضرور ھوتا ھے کہ کم از کم خیرات دینے والے پر اس کا اچھا اثر ضرور پڑتا ھے - مگر رومہ میں تقسیم غلہ سے چونکہ خیرات مطلقاً بھی مقصود نہ تھی بلکہ اس کی غایت محض سیاسی اثر و اقتدار تھی اس لئے نتیجہ بھی یہی نکلا خیرات پانے کے لئے اس کی مطلق ضرورت نہ تھی کہ آدمی کام کے قابل نہ ھو بلکہ محض رومی ھونا اس کے لئے کافی تھا اور یہ صاف کاھلی اور اپاھج پن کی

تعلیم دیتا تھا - جب ہر شخص کو کھانے بھر کو بلا ہاتھ پیر ہلائے مل جاتا تھا اور ضرورت سے زیادہ تفریح و تماشہ کے مناظر ہر وقت سامنے رہتے تھے تو کون ایسا احمق تھا جو خواہ مخواہ محنت کرتا؟ نتیجہ یہ ہوا کہ کاروباری زندگی پر مردنی چھا گئی - زراعت کی طرف سے لوگ غافل ہوگئے تجارت و صنعت و حرفت کی طرف سے بے اعتنائی پھیل گئی اور جب کبھی اتفاق سے تقسیم میں دیر ہوجاتی تو شہر پر قیامت گذر جاتی - اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ لوگوں نے جب دیکھا کہ ان کے حصہ میں اولاد بھی شریک ہوا چاہتی ہے تو اسقاط حمل، طفل کشی وغیرہ مختلف طریقوں سے اولاد کی تعداد محدود کرنا شروع کردی —

روما کی کل آبادی ۱۵۰۰۰۰۰ سے زاید نہ تھی ان میں سے غریب اہل شہر کی ایک تعداد کثیر غلاموں میں شامل تھی ان کا بھی حصہ نکال ڈالنے کے بعد اگر ۲۰۰۰۰۰ شخص محض خیرات چاہنے والے تھے تو کوئی شخص قدماے روم پر خست کا الزام نہیں عاید کرسکتا - لیکن ان کی فیاضیاں صرف تقسیم غلہ تک محدود نہ تھیں بلکہ خیرات کے اور طریقہ بھی رایج تھے - مثلاً نمک کی قیمت براے نام لی جاتی تھی - زمین کو جولیس سیزر، نیرو، و سیورس نے خرید کر رعایا کو مفت تقسیم کیا تھا جولیس سیزر، آگسٹس وغیرہ نے رعایا کے لئے بڑے بڑے ترکے چھوڑے تھے اور مختلف تقریبات کے موقعوں پر خوب خیرات کی جاتی تھی بڑے بڑے حمام وقف عام تھے جن میں بعض بالکل مفت تھے اور بعض میں براے نام اجرت لی جاتی تھی- وسپیسین نے تعلیم عام کا ڈھنگ ڈالا انٹونانیس نے اسے اور زیادہ وسعت دی اور

بچوں کی تربیت کا انتظام جس کا میں پیشتر ذکر کرچکا ہوں بہت وسیع پیمانے پر ہو گیا۔ اسے سب سے پہلے آگسٹس نے شروع کیا تھا - لیکن یہ اس کی ایک ذاتی و ہنگامی فیاضی تھی - اس کی ایک مستقل و باضابطہ شکل سب سے پہلے نروا نے قایم کی - اُس نے نہ صرف روم بلکہ اٹلی کے تمام شہروں میں نادار بچوں کی کفالت کے لئے حکم جاری کیا - ٹریجن نے اسے اور وسعت دی - اس کے زمانہ میں اکیلے شہر روم میں ۵۰۰۰ بچے سرکاری خرچ سے پرورش پاتے تھے اور یہی طریقہ افریقہ و اٹلی میں ہر جگہہ جاری تھا ' جن کی تفصیل کا ہم کو علم نہیں - ویلیا ایک حقیر قصبہ تھا ' صرف اس میں ۲۷۰ بچوں کی پرورش کا سرکاری انتظام ٹریجن کے زمانہ میں تھا سرکاری فیاضیوں کے علاوہ خانگی طور پر اشخاص کی ذاتی فیاضیوں کا سلسلہ بھی جاری تھا - آج گو ہم ان کی مفصل تاریخ نہیں لکھہ سکتے تاہم مختلف کتبات سے اُن کا وجود تو قطعی طور پر ثابت ہوتا ھے پلینی نے علاوہ مدارس و مکاتب کے ایک زبردست سرپرست ہونے کے اپنے شہر میں نادار بچوں کے لئے ایک اسکول کھولا تھا ' جس کے لئے اپنی جائداد وقف کردی تھی - خاتون سیلیا میکرنیا نے ٹریکنا میں ۱۰۰ بچوں کے لئے ایک خیرات خانہ کھولا تھا - ھیڈرین نے ان خیرات خانوں کو جو امدادی رقم ملتی تھی اس میں اضافہ کردیا اور نادار عورتوں کے ساتھہ جو جو سلوک وہ کرتا تھا وہ آج تک مشہور ھیں - انٹونیس ۴ فی صدی کی شرح پر غربا کو قرض دیتا تھا جو اس وقت کی عام شرح سود کو دیکھتے ہوئے بہت ھی خفیف تھی - انٹونیس

و مارکس آریلیس دونوں نے اپنی اپنی بیویوں کی یادگار میں لڑکیوں کے لئے پرورش گاھیں قایم کیں - اسی طرح الگزنڈر سیورس نے اپنی والدہ کی یادگار ، بچوں کے لئے ایک خیرات خانہ کی شکل میں بنوائی عام شفا خانوں اور اسپتالوں کا رواج تو یورپ میں مسیحیت سے قبل غالباً نہ تھا - مگر اس کے ثبوت موجود ھیں کہ غربا کو دوائیں مفت تقسیم ھوتی تھیں ، معطل العضو غلاموں کے لئے محتاج خانے قایم تھے اور غالباً جنگی اسپتالوں کا بھی وجود تھا - قحط ، سیلاب ، زلزلہ وغیرہ کے موقع پر سرکار کی طرف سے رعایا کو امداد ملتی تھی اور روساء اپنی جائدادیں رفاہ عام کے لئے ترکہ میں چھوڑ جاتے تھے --

یہ تمام مثالیں بجاے خود کیا کم ھیں لیکن ھمیں یہ بھی خیال رکھنا چاھئے کہ یہ واقعات و حالات کی مکمل فہرست ھرگز نہیں - صدھا کتبے ایسے ھوں گے جو آج مٹ گئے ھیں - ھزارھا یادگاریں ایسی ھوں گی جن کے آج نشان تک نہیں پاے جاتے - پھر خیرات و فیاضی کی تاریخ میں کوئی ایسی عجیب و غریب بات بھی نہ تھی جو ھمارے مورخین اسے خصوصیت کے ساتھ قلمبند کرتے - خود ھمارے معاصر مورخین کب اپنے معلومات میں اس طرح کے واقعات کو لکھتے ھیں ؟ اور آج سے دو چار ھزار سال کے بعد اگر کوئی آج کل کی تصانیف سے موجودہ فیاضیوں کی تاریخ لکھنا چاھے گا ، تو اُس کے سامنے کس قدر ناقص ، نامکمل اور ادھورا مواد ھوگا ! لیکن ان اعتراضات کے باوجود بھی ھمیں یہ کہنے میں ذرا تامل نہیں کہ مسیحیت نے خیرات کا جو درجہ مقرر کیا جس پیمانہ پر اسے پھیلایا ، جس اسلوب پر اسے چلایا ، ان میں کسی لحاظ سے قدما ان کی ھمسری

نہیں کر سکتے - اُس وقت خیرات تقریباً تمامتر ایک سرکاری کارروائی ہوتی تھی جس کا مقصد رفاہ خلق نہیں بلکہ سیاسی حکمت عملی ہوتی تھی - اور جس کثرت سے ملک میں قحط پڑا کرتے تھے یا جس تعداد میں غربا سپاہی کا پیشہ اختیار کرتے تھے اور جس افراط سے لوگ اپنی اولاد کو فروخت کر ڈالتے تھے، ان سب سے اندازہ ہوتا ہے ملک کا کس قدر کثیر حصہ خیرات سے مستفید ہوتا تھا، اور کس قدر فیاضیوں کی ضرورت باقی تھی - بے شبہ چند مشرک فیاضوں کے واقعات ہم تک پہنچے ہیں - مثلاً یونانیوں میں ایپیمنڈس قیدیوں کو فدیہ دیکر چھڑاتا تھا اور نادار لڑکیوں کو جہیز کا سامان دیتا تھا، سیمن غربا کی کھانے کپڑے سے کفالت کرتا تھا، بیاس، مسینا کی گرفتار شدہ لڑکیوں میں خرید کر کے اور جہیز کا سامان دے کر آزاد کردیتا تھا اسی طرح کی مثالیں رومہ میں بھی جا بجا ملتی ہیں - اور یہاں مہمان نوازی کی تو خاص طور پر تعلیم دی جاتی تھی - لیکن با ایں ہمہ اشخاص کی خانگی فیاضیاں افراد کی ذاتی خیراتیں جو مسیحی جماعات کی ہر ملک و زمانہ میں اجزاء غیر منفک رہی ہیں ان کا قدماء کے یہاں کہیں نام و نشان بھی نہ تھا اور ان کے حکماء اخلاق میں، بجز دو ایک کے اور کسی نے ان کا ذکر تک نہیں کیا ہے - ان دو ایک میں سب سے زیادہ قابل ذکر سسرو ہے - اس نے اس موضوع پر پورے دو باب لکھے ہیں، جن میں گو دقت نظر سے کام لیا ہے لیکن گرمجوشی کا کہیں پتہ نہیں وہ کہتا ہے کہ انسان کی کوئی خصلت سخاوت سے بہتر نہیں - لیکن شرایط ذیل کے ساتھہ :-

(۱) جس شخص کو ہم اپنی فیاضی کا مورد بنا رہے

هیں وہ واقعتاً اُس سے مستفید ہورہا ہے —
(۲) ہم اپنی چادر سے باہر تو پاؤں نہیں پھیلا رہے ہیں —
(۳) وہ آمدنی جائز ذرایع سے حاصل کردہ ہے ' سیزر کی طرح ناجائز ذرایع سے تو نہیں آئی ہے —
(۴) اُس کا مقصد رفاہ و بہبود خلق ہو ' اپنی نمود و نمایش نہ ہو —
(۵) اور خیرات پانے والے کی ضروریات و حیثیت کا پورا لحاظ کر لیا گیا ہو —

دنیا میں سب سے اول بار مسیحیت نے یہ بتایا کہ سخاوت انسان کے فرائض اخلاق میں داخل ہے اور تمام معلمین مسیحیت اس تعلیم کو زور کے ساتھہ پیش کرتے رہے - اس سے بھی زیادہ پر اثر طریقہ مسیحیت نے یہ اختیار کیا کہ خود مسیح کو فقرو مسکنت کا مجسمہ قرار دیا اور اس لئے جو لوگ فقراء و مساکین کی امداد کرتے تھے وہ گویا خود مسیح کی خدمت کرتے تھے - اُس کا یہ نتیجہ ہوا کہ سخاوت و فیاضی ' مسیحیت کا جزو غیر منفک ہوگئی جس سے مسیحی کسی وقت اور کسی حال میں بھی غافل نہیں ہوتے تھے - خود تعدیوں کے پر آشوب زمانہ میں ہر اتوار کو فقراء کے لئے چندہ جمع کرنا ضروری تھا - مسیحی روزہ رکھتے تھے مگر مقصد یہ ہوتا تھا کہ جو کچھہ کھانا بچے محتاجوں کی نذر ہو خیرات کا ایک بڑا وسیع نظام جس کے صدر پادری لوگ تھے اور جس کی باگ اسقفوں کے ہاتھہ میں تھی ' اپنی صدہا شاخوں کے ساتھہ قایم ہوا اور کلیسا کے دور و دراز ٹکڑوں کے درمیان خیرات و

فیاضی کا رشتہ اتحاد قرار پایا - قسطنطین کے زمانہ سے بہت پیشتر کا واقعہ ہے کہ مسیحیوں کی فوق العد فیاضیوں کو دیکھکر صدھا منافقین اُن کے گروہ میں شریک ہونے لگے اور جب مسیحیت کو پورا تسلط ہوگیا تب تو اُس کی فیاضیوں کا کوئی شمار ہی نہیں رہا - دنیا میں سب سے پہلا شفاخانہ ایک روسی خاتون فیبیولا کے ہاتھوں چوتھی صدی میں قایم ہوا - اور اس کی تقلید عام طور پر ہونے لگی - چند روز میں متعدد شفاخانے اور اسپتال جگہہ جگہہ کھل گئے - سرائیں اور مہمان خانے جو بننے لگے - وہ علیحدہ - نایس کی انجمن کلیسا نے یہ فیصلہ کیا کہ ہر شہر میں ایک ایک سرا تعمیر ہونا چاہئے - سینٹ کریزوسٹم کے زمانہ میں اکیلے انطیوخ کے گرجا سے علاوہ مریضوں و مسافروں کے ۳۰۰۰ بیواؤں اور کنواریوں کی پرورش ہوتی تھی - اسی زمانہ میں لوگ عام طور پر اپنی بڑی بڑی جائدادیں غربا و مساکین کے لئے وقف کرنے لگے - اندھوں ' برص و جذام کے مریضوں و قحط زدوں کے علاج و پرورش کے لئے متعدد راہبوں (مثلاً سینٹ افریم و تھیلیسیس وغیرہ) نے شفاخانے و محتاج خانے کھول دیے اور ایک تاجر اپولوئیس نے خود راہبوں کے لئے ایک اسپتال جاری کردیا - ہر عیسائی پر یہ واجب تھا کہ اپنی آمدنی کا کم از کم $\frac{1}{10}$ حصہ ضرور اہل حاجت کے لئے وقف رکھے اور آج کل کے اشتراکئین کا سا خیال اس وقت بالعموم مسیحیوں میں شایع ہوگیا تھا کہ زمین پر قدرتاً تمام انسانوں کو برابر درجہ کا حق حاصل

ہے اور جو لوگ امیر و زمیندار ہیں وہ محض اس لئیے کہ اپنی دولت و زمین میں دوسروں کو شریک کریں - وہ گویا اپنے ابنائے جنس کے امین ہیں اور اس سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتے —

مسیحیوں کے اس جوش ایثار و سخاوت نے بت پرستوں کو خاص طور پر متاثر کیا جنھوں نے اپنے یہاں بھی اس کی تقلید کی کوشش کی مگر وہ کامیاب نہ ہوئی سنہ ۳۲۶ میں قرطاجنہ میں یا گیلینیس و میکزیمین کے عہد حکومت میں جب اسکندریہ میں وبا پھیلی ہے اور جب کہ فرط اضطراب سے بت پرستوں کی تمام دنیا میں نفسی نفسی پڑی ہوئی تھی ' یہ ہمت و پامردی صرف عیسائیوں میں تھی کہ وہ اپنے پادریوں کی زیر سر کردگی ' مریضوں کی آخر وقت تک دوا علاج و تیمارداری کرتے انہیں تسلی و تشفی دیتے اور جب وہ مرجاتے تو اُن کی تجہیز و تکفین کرتے تھے - غلاموں کے بہ کثرت آزاد ہونے سے جب ملک میں گداگروں کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہوا اور اس پر وحشی حملہ آوروں کے حملے اور مستزاد ہوے تو اس وقت بھی گرجا نے اپنی فیاضیوں کا انتہائی ثبوت دیا جنسیرک نے جب افریقہ کو مسخر کرلیا تو اٹلی میں غلہ کی درآمد موقوف ہوگئی اور بڑا سخت قحط پڑگیا - اب حالت یہ تھی کہ ملک میں اس سرے سے اُس سرے تک تباہی و بربادی پھیل رہی تھی - ہزارہا اشخاص وبا کے شکار ہو رہے تھے آباد و پر رونق شہروں کی اینٹ سے اینٹ بج رہی تھی - اور ہر ہر گلی میں قحط زدوں کی لاشیں اور فاقہ

کشوں کی صورتیں نظر آتی تھیں لیکن اس عام ھلچل اس عام محشر اضطراب کے درمیان گرجا کے خادموں کی پرسکون شکلیں دکھائی دیتی تھیں جو یا تو حملہ آوروں کے قہر و غضب کو ٹھنڈا کرتی ہوتی تھیں یا پھر مصیبت‌زدوں کی دستگیری میں مشغول نظر آتی تھیں - الارک کی فوج نے جب روم پر قابض ہوکر قتل و غارت کی گرم بازاری شروع کردی تو صرف مسیحیوں کا گرجا ایک ایسا مامن و ملجا تھا جو حملہ آوروں کی دست درازیوں سے ہر طرح پر محفوظ تھا پھر جب شہر کو الارک سے بھی زیادہ مہیب دشمن اٹیلا کا سامنا ھوا اور اس کے قہر کے آگے سارا شہر لرزہ بر اندام تھا اس وقت پاپاے اعظم سینٹ لیو اپنے مقدس لباس میں اپنے ہم وطنوں کی حفاظت کے لئے باھر نکلا - مہیب فاتح پر پاپا کی ھیبت چھا گئی ارر شہر دست درازیوں سے محفوظ رہ گیا دو برس بعد جنسیرک کا حملہ ھوا اور اس وقت بھی پاپاے موصوف کی سفارش سے قتل و غارت میں بہت تخفیف کردی گئی - اسی طرح تو تیلا پر حملہ کے وقت پیلاگیس کی ترروس پر حملہ کے وقت سینٹ لوپس کی آرلینس پر حملہ کے وقت سینٹ ایگستان کی اور انگلستان پر قوم پکٹ کے حملہ کے وقت سینٹ جرمن کی سفارشیں کام آئیں —

فاتحین و حملہ آوروں کے علاوہ حالت امن میں خود حکام و رعایا کے درمیان پادریوں کی وساطت سے بارہا مصالحت ھوئی ھے - شہر انطیوخ کو جب بغاوت کے جرم میں تھیوڈوسیس نے سزا دینی چاھی تو تمام خادمان کلیسا اپنے اپنے خلوت کدوں سے نکل نکل کر وزراے سلطنت کی خدمت

میں عرض و معروض کے لئے حاضر ہوئے ہیں اور خود آرچ بشپ فیلیوین پادشاہ کے پاس التجاے استرحام کے لئے گیا اسی تھیوڈوسیس نے جب تھیالونیکا میں خونریزی کی ہے تو سینٹ ایمبروز نے اسے مجبور کیا کہ اپنے اس گناہ کا کفارہ دے۔ متعدد مثالیں اس کی بھی ملتی ہیں کہ جو حکام و اُمراء رعایا پر جبر و تشدد کرتے تھے وہ گرجا کی برادری سے خارج کردیے جاتے تھے تا آنکہ کفارہ دے کر وہ دوبارہ اپنے تئیں اس کی شرکت کے قابل بنا سکیں آخر کار جب پادریوں اور راہبوں کے اثر کی یہ حالت پہنچ گئی کہ وہ بارہا مجرموں کو چھڑا لاے اور اس سے ملک کی سیاست متاثر ہونے لگی تو ان کے لئے کچھ مخصوص قوانین کا نفاذ کرنا پڑا - یتیموں اور رانڈوں کی دستگیری کرنا گرجا کا مذہبی فرض تھا اور دنیوی حکام کے لئے ان پر بغیر پادریوں کی صلاح و مشورے کے مقدمہ چلانا ایک گناہ قرار پا گیا - پانچویں صدی میں کلیسا کی ایک کونسل نے یہ فیصلہ کیا کہ جو حکام غربا کے ساتھہ بد سلوکی سے پیش آئیں گے، یا پادریوں کی سفارشوں سے بے اعتنائی کریں گے وہ گرجا کی برادری سے خارج کردیے جائیں گے - پادریوں کے دولت و تمول کا سبب یہ تھا کہ امرا اپنے ترکہ انہیں کے پاس چھوڑ جاتے کہ یہ اس کے مصرف صحیح کے امین رہیں - رفتہ رفتہ حالت یہ ہوگئی کہ اُمراء ان پادریوں سے ڈرتے تھے غربا انہیں اپنا دستگیر جانتے تھے، مجرم انہیں اپنا شفیع سمجھتے تھے، مریض انہیں اپنا معالج و تیماردار یقین رکھتے تھے اور مسافر ان کے مکانات کو مہمان سرا تصور کرتے تھے اور ان کے علاوہ خیرات کے اور جتنے مظاہر ممکن تھے مثلاً ایک راہب نے اپنے ذمہ یہ کام لیا تھا کہ کشتی کھیتا تھا اور بلا محصول مسافروں کو دریا پار

اُتارا کرتا تھا - یا پھر اسی طرح جب یورپ میں جذام کا نفرت انگیز مرض پھیلا اور اس نے وبائی شکل اختیار کرلی، اور لوگ گھروں کو چھوڑ چھوڑ کر بھاگنے لگے - نہ صرف اس خیال سے کہ یہ مرض متعدی ہے، بلکہ اس خیال سے کہ یہ ایک شیطانی عذاب ہے تو نئے نئے اسپتالوں میں مریضوں کی خدمت و تیمار داری کرنے والے اگر کوئی ہوتے تھے تو یہ راہب ہوتے تھے —

آج مسیحی فیاضیوں کے مورخ کے لئے اس سے زیادہ افسوسناک کوئی واقعہ نہیں کہ اسے جن چیزوں کی سب سے زیادہ تلاش ہے انہیں میں اس کے پیشروں نے سب سے زیادہ بخل سے کام لیا ہے - حکومتوں کے انقلاب، فاتحین کے حملے، جنگ و جدل کے کارنامے، محاربات کے واقعات ان کی تصویر کا ایک ایک خط و خال تاریخ کے مرقع میں محفوظ ہے اور کیوں نہ ہوتا؟ یہ چیزیں ہی ایسی ہیں جو متخیلہ کو متاثر کرتی ہیں - بہ خلاف اس کے کتنے لوگ ایسے ہیں جو بیماروں کی آہ، رانڈوں کے بین، یتیموں کے نالہ، اور بے نواؤں کی فریاد پر توجہ کرتے ہیں؟ پھر ان کی تاریخ جمع ہوتی تو کیونکر؟ دنیا کے حقیقی اور شان دار ترین کام شاید ہمیشہ غیر مکتوب رہ گئے ہیں اور اس سے کون انکار کرسکتا ہے کہ مسیحیت کا روشن ترین کارنامہ یہی ان کی سخاوت و فیاضی کی تعلیم و عمل ہے - یہ اسی کا کام تھا کہ اس نے اسے مذہب کا جزو بنایا اخلاق کی بنیاد اسی پر رکھی، سطح ارض پر سخاوت و خیرات کا ایک سیلاب بہادیا اور اس کا انتظام اپنے مقتدایان مذہب کے فرائض مذہبی میں داخل کردیا —

—— ❋ ❋ ❋ ——

فصل (۴)

مناقب بالا کا تاریک پہلو

مسیحی فیاضیاں ، گو نہایت وسیع پیمانہ پر تھیں تاہم غیر محدود نہ تھیں - کوئی کلیہ استثناء سے خالی نہیں ہوتا ، اور اس فیاضی کے کُلیہ سے خاص طبقہ کے مجانین مستثنیٰ تھے - یہ خیال بہت قدیم سے چلا آتا ھے کہ دیوانگی کوئی عام معمولی بیماری نہیں بلکہ کسی مافوق‌الفطرت قوت کا نتیجہ ہوتی ھے - اس بنا پر یہ بالکل قدرتی تھا کہ مسیحی دنیا میں دیوانے مشتبہ نظروں سے دیکھے جائیں یہ سبب بجائے خود کافی تھا - اس پر مستزاد یہ ہوا کہ بھوت ، پریت ، جن و پلید سحر و جادو کا اعتقاد کتب یہود میں مسلم تھا - اور تمام مسیحیوں کو ان کے وجود پر پورا یقین تھا - اُن میں سے ہر شخص یہ جانتا تھا کہ اس کے گرد و پیش ایک غیر مرئی دنیا ھے ، جس میں یہ شیاطین چلتے پھرتے رہتے اور بستے ھیں . اب اگر کسی کے دماغی توازن میں ذرا بھی اختلال ہوتا ، اُس کے لئے بلا تامل التباس حواس سے یہ غیر مرئی ہستیاں ، مرئی ہوجاتیں - خصوصاً وہ لوگ جو تنہائی میں بیٹھکر عبادت میں مصروف رہتے تھے ، یا زاویوں اور غاروں میں چلہ باندھ کر ریاضتوں میں لگے رہتے اور تمام لذاید و نعایم دنیوی سے دست بردار

ہوکر اپنی جسمانی صحت خراب کرچکے ہوتے ' وہ اور زیادہ اس التباس حواس کے شکار ہوتے چنانچہ صدہا زاہدان مرتاض کو یہ خواب بیداری نظر آتے رہتے کہ شیاطین کا اُن کے گرد حلقہ ہے اور وہ ان کی عبادت و ریاضت میں وسوسہ اندازی کر رہے ہیں - یہ کیفیت جنونی جب تک مذہب کی تعلیمات سے متصادم نہ ہوتی اُس وقت تک تو کوئی ہرج نہیں ہوتا تھا لیکن جب یہ مذہب کے کسی جزو سے آکر ٹکرا جاتی تھی تو غریب دیوانہ کو اپنی دیوانگی کے جرمانہ میں اپنی جان نذر کردینا پڑتی تھی - سنہ ۱۳۰۰ میں ایک لڑکی کی ' جس نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ روح القدس نے مجھہ میں جنم لیا ہے تاکہ میں جنس اُناث کو نجات دلاؤں ' لاش کھود کر نکالی گئی اور جلائی گئی اور دو عورتوں کو جو اس کے دعوے پر ایمان لے آئی تھیں قتل کردیا گیا - اسی طرح سنہ ۱۳۵۹ میں اسپین کے ایک شخص نے یہ دعویٰ کیا کہ " میں میکائیل فرشتہ کا بھائی ہوں اور معلم الملکوت کا جو عہدہ تھا اب اُس پر میرا تقرر ہونے والا ہے - میں روزانہ جنت و دوزخ کی سیر کرتاہوں - قیامت عنقریب آیا چاہتی ہے اور اُس وقت میں تنہا دجال سے مقابلہ کروں گا " یہ غریب مجنوں تولیڈو کے پادری کے ہاتھہ میں پڑ گیا اور ان کلمات کفر کی پاداش میں زندہ جلادیا گیا بعض مرتبہ یہ جنون ' وحی و الہام کی شکل میں ظاہر ہوتا اور اس کا بھی وہی حشر ہوتا - یعنی زندہ آگ میں جلادیا جاتا ' جیسا کہ جون آف آرک کا واقعہ شاہد ہے - سولھویں صدی میں اسپین کے ایک مشہور طبیب و عالم کو خبط سوار ہوا کہ ایک فرشتہ اُس کی مصاحبت میں رہتا ہے - خیر یہ خود تو توبہ و استغفار کرکے اور

کفارہ دے کر جان بچا لے گیا لیکن اسی نوعیت کا ایک دوسرا خبطی جو لیما میں علم فقہ کا پروفیسر تھا، زندہ جلا دیا گیا۔ اسی طرح صدہا ہزارہا غریب بیوائیں ضعیف و نا چار عورتیں جن کے حواس صحیح نہیں رہے تھے جو کبر سنی کی باعث طرح طرح کے توہمات کی شکار ہو جاتی تھیں، اور جن کو گرجا سے ہر طرح کی اعانت و دستگیری کی توقع تھی، اسی جرم جنون میں مدتوں مختلف تعذیبات جھیلتی تھیں اور پھر آگ میں جھونک دی جاتی تھیں —

یہ مجانین کے متعلق عام طرز عمل تھا۔ بعض صورتیں جنوں کی داخل امراض سمجھی جاتی تھیں، اور اُن کی بابت یہ یقین تھا کہ اطبا کے علاج و معالجہ سے اچھی ہو سکتی ہیں۔ لیکن ان بدنصیبوں کے ساتھ بھی وہ ہمدردانہ برتاؤ مفقود تھا، جس کے یہ مستحق تھے، اور جس کی مسیحیانہ فیاضیوں سے بالکل بجا طور پر توقع رکھی جا سکتی تھی۔ قدماء کے ہاں مجانین معابد میں یکجا رکھے جاتے تھے۔ اور جھاڑ پھونک، دعا تعویذ سے ان کا علاج کیا جاتا تھا۔ یونانی اطباء نے اس میں شبہ نہیں کہ طبی حیثیت سے اس موضوع پر نہایت محققانہ رسائل و مقالات چھوڑے ہیں۔ لیکن عملی طور پر پاگلخانہ وغیرہ کی تعمیر کی طرف انھوں نے کوئی توجہ نہیں کی۔ راہبوں کی تاریخ میں ہمیں اس کی طرف ایک نظیر ملتی ہے۔ وہ یہ کہ جب صحرا نشین زاہدوں کی تعداد کثیر مجنون ہونے لگی، تو ان کے واسطے بیت المقدس میں ایک علحدہ مکان بنا دیا گیا۔ بس اس ایک مثال کے سوا جو ایک محدود جماعت سے متعلق تھی اور مسیحی تاریخ میں

اس کی شہادت پندرھویں صدی تک نہیں ملتی۔ اصل یہ ھے کہ اس باب خاص میں مسلمان مسیحیوں پر سبقت لے گئے۔ بنجمن آف ٹوڈیلا جس نے بغداد کی بارھویں صدی میں سیاحت کی تھی، لکھتا ھے کہ اس شہر میں ایک خاص محل "دارالرحم" کے نام سے موسوم ھے، جس میں تمام ملک کے مجانین پا بہ زنجیر رکھے جاتے ھیں ھر مہینے اُن کا معائنہ ھوتا ھے اور جو جو شفایاب ھوتے جاتے ھیں، رھائی پاتے جاتے ھیں۔ قاھرہ میں مسلمانوں نے پاگل خانہ سنہ ۱۳۰۴ میں تعمیر کرایا۔ لیو فرایکینس لکھتا ھے کہ سولھویں صدی کی ابتدا میں شہر فیض میں بھی ایک پاگل خانہ موجود تھا اور یہ بالکل قرین قیاس ھے کہ اس وقت دیوانوں اور پاگل خانوں کی نگہداشت کرنا تمام اسلامی ممالک میں رائج تھا۔ خود مسیحیوں میں یہ دستور اول اول انھیں ممالک میں پھیلا جو اسلامی ممالک کے متصل تھے۔ گو اس کا کوئی قطعی ثبوت نہیں ملتا کہ انھوں نے یہ دستور مسلمانوں ھی سے لیا۔ اھل مالٹا کی اس باب میں خاص شہرت ھے کہ وہ اپنے اسپتالوں میں مجانین کو داخل کرتے تھے، لیکن اس کی کوئی شہادت نہیں کہ سنہ ۱۴۰۹ سے پیشتر مسیحی ممالک میں کہیں علحدہ پاگل خانہ کا بھی وجود تھا۔ مسیحی دنیا میں سب سے پہلا پاگل خانہ اسپین میں ایک راھب جون گیلیبر ٹوڑو فرے نے پاگلوں کو گلی گلی درد ناک حالت میں پھرتے دیکھ کر قایم کیا۔ یہ شہر ویلنشیا میں قایم ھوا، اور پھر اس کی تقلید اور شہروں میں ھونے لگی۔ چنانچہ سنہ ۱۴۲۵، سنہ ۱۴۳۶، و سنہ ۱۴۸۳ میں اسپین کے مختلف صوبوں میں دارالمجانین قایم ھوگئے

اور اس وقت تک مسیحی دنیا کے اور تمام حصے اس کے نام تک سے نا آشنا تھے - اهل اسپین اپنے جائز فخر پر ان دو واقعات کا بھی اضافه کرسکتے هیں که خود حوالی رومه میں پہلا پاگل خانه انهیں نے سنه ۱۵۴۸ میں تعمیر کرایا - دوسرے یه که ان کا برتاؤ مجانین کے ساتھه نہایت دانشمندانه و همدردانه رها هے ' جیسا که نپل نے اتھارهویں صدی کے خاتمه پر اعتراف کیا هے —

اسپین کو مستثنی کرکے بعد اور تمام مسیحی ممالک میں مجانین کی حالت نہایت هی ابتر تھی هزار ها اشخاص تو ساحری کے الزام میں زندہ جلادئے گئے - باقی جن کی بابت یه طے هی هوگیا که وہ واقعی مجنون هیں ان کا بھی قید و زندان ' مار پیٹ ' اور فصد کے ذریعه سے علاج کیا جاتا شفقت و همدردی کا کیا ذکر هے ' سیکڑوں کو اپنی عمریں تنگ و تاریک کوٹھریوں کے اندر قید تنہائی میں گزار دینا پڑیں - اور اس برتاؤ سے ظاهر هے که مرض گھٹنے کی جگه اور ترقی پکڑتا تھا - یه حالت اٹھارهویں صدی تک قایم رهی - اٹھارهویں صدی میں جب ایک طرف سائنس و روشن خیالی پھیلنے لگی ' اور دوسری طرف سحر و جادو وغیرہ کے توهمات دلوں سے مٹنے لگے تب جاکر کہیں اٹلی میں مور گیگنی ' اسکاٹ لینڈ میں کولن ' اور فرانس میں نپل کی کوششوں سے اس باب میں اصلاح هوئی —

غرض مسیحی فیاضیوں کی غیر محدود مدح و ثنا میں همیں جو رکاوٹ هوتی هے ' اس کا ایک سبب تو یہی تھا ' دوسرا سبب جو اس سے زیادہ اهم و وسیع هے یه هے که خیرات اپنے مصرف صحیح میں نہیں صرف کی جاتی تھی - خیرات کے جا و بیجا هونے کے متعلق یوں

تو دنیا میں بہت طویل و مفصل مباحث موجود ہیں لیکن اقتصادیات کا جو علم ہے اس سے ہم کو ہدایات ذیل حاصل ہوتی ہیں :-

(الف) اس نے بیکار و باکار صرف میں تفریق کرکے بتایا ہے کہ اول‌الذکر سے صرف کرنے والے کا مقصد کبھی حاصل نہیں ہوتا، بلکہ جس شے کو وہ روکنا چاہتا ہے اسی کو اور ترقی ہوتی ہے - مثلاً جہاں بے روزگاروں کی اعانت کی جاتی ہے وہاں بے روزگاری اور پھیلتی ہے - جہاں ہر شخص کو ضعیف‌العمری میں پنشن ملنے کی توقع ہوتی ہے وہاں کوئی شخص خرچ میں احتیاط و کفایت شعاری سے کام نہیں لیتا - وقس علیٰ ہذا —

(ب) تعیش و تفریح میں جو روپیہ صرف کیا جاتا ہے وہ بھی اس لئے بیکار جاتا ہے کہ اس میں زیادتی نہیں ہوتی بلکہ وہ وہیں ختم ہو جاتا ہے —

(ج) البتہ باکار صرف وہ ہوتا ہے جس سے سرمایہ برابر بڑھتا جاتا ہے مثلاً کلوں اور کارخانوں کے قایم کرنے، یا آب پاشی و زراعت وغیرہ میں جو کچھہ صرف ہوتا ہے اس سے برابر منافع کا سلسلہ پیدا ہوتا رہتا ہے —

(د) پس ملک میں افزایش ثروت کا یہی ایک طریقہ ہے کہ سرمایہ صرف باکار مصارف میں لگایا جائے —

ان حقایق سے بعض حضرات نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ خیرات سرے سے ایک فضول بلکہ مضر شے ہے - لیکن میرے نزدیک یہ خیال دو وجہوں سے باطل ہے - اول

یہ کہ خیرات کی ہر صورت صرف بیکار ہی نہیں ہوتی بلکہ بہت سے طریقے ایسے بھی ہیں جن سے اصل سرمایہ میں اضافہ کی توقع رکھنا بالکل درست ہوتی ہے - مثلاً بلا فیس تعلیم عامہ کے لئے مدارس کھولنا ' سیونگ بنک اور بیمہ کی کمپنیاں قائم کرنا قحط کے زمانہ میں عمارت کا کام جاری کر دینا ایک طرف یہ سب خیرات کی مسلمہ صورتیں ہیں ' اور دوسری طرف ان سے ملک میں افزایش ثروت بھی ہوتی ہے - دوسرے یہ کہ خیرات کا مقصد اصلی انسان کی راحت و مسرت میں اضافہ کرنا ہے ' اور ہر ایسی خیرات جس سے یہ مقصد حاصل ہوتا ہو - بالکل جائز و مناسب ہے - عام اس سے کہ کاروباری حیثیت سے اس سے افزایش ثروت ہوتی ہو یا نہ ہو - اور یہ ظاہر ہے کہ خیرات مروجہ کی بعض شکلیں ایسی ہیں جن سے مسرت انسانی میں یقیناً اضافہ ہوتا ہے گو ملک کی دولت میں نہیں ہوتا - مثلاً ایسے لوگوں کی امداد کرنا جو محض اتفاق سے لنگڑے ' اندھے ' یا اور کسی طرح پر اپاھج ہو گئے ہیں یا جنھیں قحط ' سیلاب ' وبا جنگ وغیرہ نے مفلوک‌الحال بنا دیا ہے - یا مثلاً اسپتال جاری کرنا کہ ان سے ایک طرف تو مریضوں کو علاج میں سہولت ہوگی اور دوسری طرف ان کے امراض ملک میں متعدی نہ ہونے پائیں گے - غرض خیرات مروجہ کے ایسے متعدد طریقے ہیں جو خواہ غیر اقتصادی ہوں ' لیکن اخلاقی حیثیت سے یقیناً محمود و لایق ستایش ہیں - خیرات کا یہ طریقہ بے شبہ مضر ہے کہ ایک متمول شخص جو روپیہ کی افزایش سے اُکتا رہا ہے اُسے بے موقع و بے محل داد و دھش میں لٹا رہا ہے اور یوں اپنی

جماعت کو کاہل بنا رہا ہے - لیکن اس میں اور اس شخص میں زمین و آسمان کا فرق ہے جو افلاس تنگدستی و پریشانی کو اُن کے بلوں میں ڈھونڈتا ہے اور جب تک اُنھیں دور نہ کر لے چین نہیں لیتا - اقتصادیات نے اس میں شک نہیں اس موضوع پر بہت کاوش و تحقیق سے نظر کی ہے لیکن ہمیں تو اس سارے دفتر سے اُنہیں حقایق کی صدائے باز گشت سنائی دیتی ہے جنہیں دو ہزار سال گزرے سیرو قلم بند کر چکا ہے —

میرے نزدیک خیرات کے مفید ہونے کے لئے اصلی ضروری شرط صرف یہ ہے کہ دینے والے کے ذہن میں فی الواقع لینے والے کو فائدہ پہچانا مقصود ہو - لیکن افسوس ہے کہ مسیحی سخاوت و فیاضیوں میں یہی عنصر غائب رہا ہے - مسیحیت نے خیرات کے مفہوم کو حقوق العباد میں نہیں بلکہ حقوق اللہ میں رکھا ، اُس نے اس کی غایت رفاہ خلق نہیں رکھی بلکہ حصول ثواب رکھی - اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ لوگ اس طرف سے بالکل غافل ہوگئے کہ کون مستحق اعانت ہے اور کون غیر مستحق - ان کے لئے صرف اتنا جاننا کافی تھا کہ ہمیں نیت کا ثواب بہر حال ملے گا - اس لئے مستحق کی تلاش ایک محنت بے سود ہے - خیرات ، کفارہ معاصی کا تو بہر صورت کام دے گی —

اس طرز خیرات کے اثرات کا وجود گو شروع ہی سے تھا ، البتہ وہ نمایاں چند صدیوں بعد ہوئے - تقسیم غلہ کا رومی دستور اقتصادی نقطۂ خیال سے ہر طرح معیوب تھا جس کے مقابلہ میں مسیحیوں کا طریق خیرات بہت غنیمت معلوم ہوا - محنت و مشقت کی پادری بھی لوگ تعلیم

دیتے تھے بلکہ آخر زمانہ میں تو بہت سے راھبوں نے اس کی ذلت کو لوگوں کے دلوں سے مٹانے کے لئے خود محنت مزدوری کا پیشہ اختیار کرلیا تھا - با ایں‌ہمہ گرجا کی ان مسرفانہ فیاضیوں کا یہ نتیجہ بغیر ظاہر ہوئے نہ رہ سکا کہ جوگیوں ' مصنوعی فقیروں اور پیشہ ور گداگروں کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہوگیا ' اور راھبوں کی بے شغلی و کاھلی ایک شہرت عام کی شے ہوگئی - ھر مخیر شخص کی تعریف کئے جانے کا حشر یہ ھوا کہ ھزاروں موٹے تازے مسٹنڈے گداگر گلی کوچہ میں دکھائی دینے لگے اور خانقاھوں کے اجراء نے ان کی تعداد کو اور بڑھادیا - یہاں تک کہ ویلینٹینیئن ' ایک سخت قانون بنانے پر مجبور ھوا کہ مضبوط و توانا گداگروں کی سزا غلامی ھے- اب مقتدایان کلیسا نے یہ چاھا کہ گداگری کے دامن سے اس ذلت کے دھبہ کو دور کریں ' چنانچہ خود ھزارھا راھبوں نے گداگری کا پیشہ اختیا کرلیا تاکہ اُمرا سے روپیہ لے کر غربا کو تقسیم کریں - اس طرز عمل کا یہ نتیجہ نکلا کہ جن ممالک میں خانقاھوں کي تعداد زائد تھی وھاں کی دولت و ثروت انھوں نے گویا بالکل چوس لي - جس ملک کے ھزارھا مضبوط و توانا جوان کاروباری زندگی کی طرف سے بے التفات ھاتھہ پیر نہ ھلانے اور مفت کی روٹیاں کھانے کے خوگرھوں وھاں تمدن اور مادي ترقیوں کا کیونکر گزر ھوسکتا ھے ؟ مسرفانہ فیاضی درحقیقت ملک میں تمول نہیں بلکہ افلاس پھیلاتی ھے - انگلستان سے خانقاھوں کا استیصال اگرچہ بالکل بے موقع وبیجا طور پر ھوا تاھم اس سے یہ فائدہ ضرور ھوا کہ اشخاص کے لئے خیانت و تغلب کے مواقع بہت کم ھوگئے اور ملک کے افلاس میں نمایاں کمی ھوگئی - غرض کلیسا

کی خدمت خلایق میں جو عظیم الشان کارنامے ہیں اگرچہ ان کا پورا اعتراف ہے اور دنیا کی آرام رسانی و رفع تکلیف میں اُس کا اہم حصہ ہے گو اس کا پورا احساس ہے - تاہم یہ حقیقت بھی بالکل غیر مشتبہ ہے کہ اس نے دنیا میں افلاس تمول سے زیادہ پھیلایا —

با ایں ہمہ اس میں شک نہیں کہ خیرات پانے والے کے حق میں مفید ہو یا نہ ہو - دینے والے کے لئے بہر صورت ہوتی ہے - اس کا مصرف خواہ کتنا ہی بیجا ہو مگر اُس کے اخلاق پر یقیناً اس کا ایک بہتر و لطیف اثر پڑتا ہے - چنانچہ اس کا ثبوت قرون وسطیٰ کی پر آشوب تاریخ میں قدم قدم پر ملتا ہے - ایسے زمانہ میں جب کہ شقاوت ' جہالت ' تعصب و توحش کا دور دورہ تھا گرجا کی یہ سخاوت ہر شعبہ میں اپنی تاثیر دکھا رہی تھی - گریگوری آف تورس کی تاریخ سے بڑھکر ظلم و توحش کے واقعات کا تسلسل اور کہاں ملے گا ؟ لیکن اس دفتر مظالم کے شاید ہر صفحہ میں چند سطریں ایسے سلاطین و امراء دولت کے ذکر کي ضرور ملتی ہیں جنھوں نے فقراء کی دستگیری کرنا اپنا مقصد زندگی قرار دے لیا تھا - خود محاربات صلیبی سے زیادہ پر آشوب زمانہ اور کون ہوگا لیکن ظلم و شقاوت غلو و تعصب ' نفس پرستی و درندگی کی اس گرم بازاری میں بھی مسیحی دنیا میں خیرات کے مصارف بدستور اعلیٰ پیمانہ پر جاری تھے جن میں سے ایک اسپتالوں کا وجود تھا جن میں برص و جذام کا خاص طور پر علاج ہوتا تھا - سینٹ پیٹر نویسکو شخصاً ظلم و شقاوت میں کسی سے کم نہ تھے - تاہم

قیدیوں کی طرف سے فدیہ دینے میں سب سے آگے آگے تھے (جیسا کہ پیشتر بھی ذکر آچکا ہے) اسی طرح شین اونیل ' آیرلینڈ کے مشہور سفاک امیر کی بابت مشہور ہے کہ بایں سفاکی و خون آشامی ' جب وہ کھانے پر بیٹھتا تو اپنے منہ میں لقمہ رکھنے کے قبل کھانے میں سے کچھہ حصہ خیرات کے نام سے ضرور نکال دیتا اور دروازہ پر جو سایل بھی کھڑا ہوتا اُسے پہلے بھجوا کر خود کھانا شروع کرتا —

مسرفانہ فیاضیوں کے نقصانات جب زیادہ پھیلنے لگے اور گداگروں کی تعداد جب روز بروز بڑھنے لگی تو حکومت کو بار بار ان کی روک تھام کے لئے وضع قوانین کی ضرورت پیش آئی - سب سے پہلے نکولس آف پر فورڈ نے غیر مستحق گداگروں کے خلاف آواز بلند کی اور اصلاح کلیسا کے قبل ہی ان کے انسداد کی کچھہ کارروائیاں شروع ہوگئی تھیں اس کے بعد انگلستان میں نہایت ظالمانہ قوانین باضابطہ طور پر پاس ہونے لگے کہ شاید ان کے خوف سے گداگری کا رواج کم ہو - ہنری ہشتم کے زمانہ میں پارلیمینٹ نے یہ قانون بنایا کہ خیرات کا ایک باقاعدہ نظام قائم ہے اُس سلسلہ سے الگ ہوکر جو کوئی متفرق طور پر گداگر کو کچھہ دے گا اُس پر اُس شے کا دس گنا جرمانہ ہوگا اور مضبوط و توانا گداگروں کی سزا پہلی بار یہ ہوگی کہ اُن پر تازیانے لگائے جائیں گے - دوسری بار یہ کہ تازیانہ بازی کے علاوہ ان کے بنا گوش کاٹ لی جائے گی اور سہ بارہ وہ قتل کردئے جائیں گے - ایڈورڈ ششم کے زمانہ میں ایک قانون جو اگرچہ کچھہ ہی عرصہ میں

منسوخ بھی ہوگیا یہ پاس ہوا کہ ہر توانا گداگر جو روزگار میں لگنے سے بھاگے گا اُس کی پیشانی پر داغ لگایا جائے گا - اور جو شخص اس کی اطلاع دے گا اُس کی دو برس تک اُسے غلامی کرنا پڑے گی - اور اگر اس درمیان میں وہ مفرور ہونا چاھے تو پہلی مرتبہ کی سزا دائمی غلامی ھے اور دوسری مرتبہ کی سزا موت - اس اثنا میں مالک اس کا پورا مجاز ہوگا کہ اُس کے گلے میں طوق آھنی ڈالے، اسے پا بہ زنجیر رکھے اور اُس کے کوڑے لگائے - ایلز بتھہ کے عہد میں پہلے یہ قانون نافذ ھوا کہ اٹھارہ سال سے کم عمر کا جو مضبوط شخص گداگری کرتا ھوا پایا جائے اُسے تیسری مرتبہ کے جرم میں سزائے موت ملے گی - کچھہ عرصہ کے بعد اس قانون میں یہ ترمیم کی گئی کہ اس کی سزا بجائے قتل کے دائمی غلامی یا جلاوطنی ہوگی، البتہ اگر وہ بھاگے یا واپس آنے کی کوشش کرے تو سزائے موت ملے گی - اسی ملکہ کے زمانہ میں قانون مفلسان پر نظر ثانی ہوئی گو جیسا کہ مالتھس نے بعد میں ثابت کیا اس کا اثر کچھہ یونہیں سا مفید پڑا - انگلستان کے علاوہ اور ممالک میں بھی گداگری کے انسداد کے لئے سخت سخت قوانین پاس ہونے لگے میکسٹس پنجم نے جس سے بڑہ کر پاپایان روم میں کوئی مدبر نہیں ھوا ھے اپنے شہر میں اس کے روکنے کی خاص طور پر کوششیں کیں - چارلس پنجم نے سنہ ۱۵۳۱ ع میں گداگروں کے خلاف ایک سخت قانون نافذ کیا - اسی طرح لوئی چہاردھم نے فرانس کے لئے بھی سخت قوانین جاری کئے - لیکن یہ عجیب بات ھے کہ ضوابط و قوانین کی مدد

سے اس کی روک تھام کی تو بہت کوشش کی گئی - لیکن اٹھارھویں صدی سے پیشتر کسی نے فلسفیانہ حیثیت سے اس کے اسباب پر غور کرنے کی کوشش نہ کی - سب سے پہلے انگلستان میں لاک اور آئرلینڈ میں برکلے نے اس پر اجمالی نظر ڈالی - اُس کے بعد سنہ ۱۷۰۴ ع میں ڈیفو نے اس موضوع پر رسالہ لکھا کہ محض خیر و خیرات کوئی فیاضی نہیں جس میں اس نے یہ دکھایا کہ انگلستان میں گداگروں کی تعداد کس قدر زاید ہے - حالانکہ یورپ کے دوسرے ممالک میں مزدوری یہاں سے زیادہ گراں ہے - اور سنہ ۱۷۸۷ ع میں ایک اور کتاب اس سے بہتر رسی قامی کسی مصنف نے بہ مقام موڈینا شائع کی جس میں اُس نے نہایت تفصیل سے یہ دکھایا کہ اٹلی میں گداگری کا پیشہ حد سے زیادہ پھیلا ہوا ہے اور اس کی علت خیرات بے محل ہے جو مذہب کے اثر سے پیدا ہوئی ہے - اس سے بہت پیشتر ملحد مینڈیوبل نے خیر و خیرات اور اعانت غربا کے دستور پر اعتراضات کی بارش کردی تھی - اس کے بعد مالتھوس کی تحریروں سے اس موضوع پر خوب خوب موشگافیاں ہوئیں - لیکن میرے نزدیک مسیحیت پر کوئی اور نیا اعتراض وارد نہ ہوسکا - بجز اُن اعتراضات کے جن کا ذکر اوپر گزر چکا —

غربا کے ساتھ مسیحیت کے حسن سلوک کی تاریخ ناتمام رہ جائے گی اگر اس میں اس سوز و گداز کا ذکر نہ کیا جائے جس سے کلیسا نے انسانی متخیلہ کو متاثر کیا - ہماری اخلاقی زندگی پر سب سے زیادہ اثر ہمارے افعال و مشاغل کا ہوتا ہے - لیکن اُس کے بعد ہی تخیل کا درجہ ہے - تخیل کا اثر اخلاق پر عقاید و استدلالات سے کہیں زاید ہوتا ہے - اس لئے غربا کی تخئیل کو صحیح

اصول پر نشو و نما پہنچانا اُن پر ایک احسان عظیم کرنا ہے - اُن پڑہ دیہاتیوں کی مفلس جماعت جن کی نہ سوسائٹی وسیع ہوتی ہے نہ جن کی نظر بلند ہوتی ہے اور جو بیچارہ کولھو کے بیل کی طرح ہمیشہ ایک محدود دائرہ میں چکر لگانے پر مجبور رہتے ہیں اور جن کے سامنے کوئی مستقبل اپنی خوش آیند توقعات کے ساتھہ موجود نہیں ہوتا ان کی تخئیل کو وسیع کرنے اور ان کے دل کو خوش رکھنے کا مذہب سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں - ان بد نصیبوں کو اگر کہیں راحت و تسکین نصیب ہوسکتی ہے تو مذہبی خوش اعتقادیوں اور وہم آرائیوں ہی سے اس نکتہ سے مقتدایان ملت شوک بھی غافل نہ تھے - ان کے یہاں بھی ہر دہقان کا یہ اعتقاد تھا کہ فصل و موسم ' بارش و پیداوار ' غرض اس کی کھیتی سے متعلق ہر چیز کا ایک مخصوص دیوتا ہے اور وہ تمام دن دیوتاؤں کی معیت میں رہتا ہے - مسیحیت نے اس میں اتنی اصلاح کی کہ تخئیل میں سوز و گداز پیدا کردیا تاکہ ساتھہ ساتھہ اخلاقی زندگی کی بھی درستی ہوتی جاے - خود اپنے بانی یعنی مسیح کی مظلومیت ' مریم کی زندگی کی دلگدازی - اور انبیاء اولیاء کی مظلومیت و بیکسی پر جو کتب مقدسہ میں بار بار زور دیا گیا ' اس کا منشاء صرف یہ تھا کہ مظلومیت و تحمل شداید کی تصاویر مسیحی زندگی کی جزو بن جائیں اور غربا اپنی حالت پر مطمئن اور ان سے صبر حاصل کرتے رہیں - گرجا کے اندر ' نماز و عبادت کے وقت' شادی کی تقریب پر ' تکفین و تدفین کے موقع پر ' قبرستان میں' نظروں کے سامنے پہاڑ و

سمندر کے سفر میں، جلوت و خلوت میں، غرض غربا کو ہر جگہ اپنے سامنے اور گرد پیش مظلومیت و بیکسی کی مقدس تصویریں نظر آتی تھیں تو لازمی طور پر ان کے تقدس و احترام کا نقش ان کے دلوں پر بیٹھ گیا اور انھیں بجائے تکلیف کے اپنی مصیبتوں سے تسکین و تشفی حاصل ہوتی تھی —

یورپ کی تاریخ اخلاقی پر کلیسا کی فیاضیوں کے جو جو اثرات پڑے انھیں کافی تفصیل سے دکھایا جا چکا۔ جہاں جہاں اثرات مضر ہوئے ہیں۔ میں نے ان سے اغماض نہیں کیا ہے لیکن بحیثیت مجموعی ہمیں یہ کہنے میں مطلق تامل نہیں کہ گرجا کے احسانات کا پلہ بہت ہی وزنی رہا ہے۔ قلوب میں حیات بشری کا تقدس و احترام، طفل کشی و اسقاط کے دستور کی بیخکنی، غلاموں کے مرتبہ کی بلندی، اور بالآخر ان کی آزادی و سپاہی کے خون ریز مناظر کا استیصال خیرات کا ایک اعلیٰ و وسیع پیمانہ پر اجزاء غرباء کے تخیل کی اصلاح و تقویت، یہ تمام کار نامے ایسے ہیں کہ قدماء ان کے لگ بھگ بھی نہیں پہنچ سکتے۔ انھوں نے دنیا کی مسرت و راحت میں غیر معمولی اضافہ کیا اور شاید اس سے بھی زیادہ پاکیزگی اخلاق میں کیا — اخلاق کے جن شعبوں کا تعلق گداز و درد اور راحت و ہمدردی سے ہے وہ تو گویا تمامتر مسیحی معیار اخلاق ہی کی تخلیق ہیں۔ قرون اولیٰ میں مسیحیت کی یہ خصوصیت بدرجۂ اتم قایم رہی۔ لیکن تیسری صدی سے جب کہ رہبانیت کا زور ہوا، اس میں کافی فرق پڑ گیا اور اب اس کی توجہ دوسری چیزوں کی طرف ہٹ چلی —

فصل (۵)

رہبانیت کی تاریخ

ترتولین دوسری صدی عیسوی میں لکھتا ہے کہ " ہم لوگوں کا طرز معاشرت ہندوستان کے جوگیوں سے کس قدر مختلف ہے - وہ لوگ دنیا سے الگ تھلگ جنگل و بیابان میں تنہا رہا کرتے ہیں - ہم لوگ برابر دنیا کے کارو بار میں شریک اور مشرکوں تک سے ملتے جلتے رہتے ہیں - " ترتولین کے یہ الفاظ اگرچہ بیان واقعہ کے لحاظ سے صحیح ہیں کیونکہ مسیح کے دو سو سال بعد تک کلیسا میں کوئی راہب نہ تھے' تاہم اس میں بھی شبہ نہیں کہ جو جذبہ راہبانہ زندگی کو اختیار کرنے کا محرک ہوتا ہے - اس کا تخم اس سر زمین میں شروع ہی سے موجود تھا - رہبانیت کے اصل الاصول یہ دو ہیں - عورت سے ہمبستری نہ کی جاے - دنیا کے تعلقات کو ترک کیا جاے - اب غور کرو کہ ان میں سے کونسا خیال ایسا ہے جو ابتدا ہی سے کلیسا کی زندگی میں موجود نہ تھا ؟ دوشیزگی کا احترام ' عظمت و تقدس روز اول سے مسیحیت کی گھٹی میں پڑا تھا - اور یہ صاف رہبانیت کے پہلے اصول کی تائید تھی - رہا دوسرا اصول سو اس بارہ میں بھی مسیحیوں کو شروع ہی سے تاکید تھی کہ اپنے گرد و پیش ملک

و وطن کے غیر مسیحیوں سے علحدہ رہیں - اس بنا پر یہ بالکل قدرتی امر تھا کہ کچھ لوگوں نے اپنی امتیازی حیثیت کو قایم کرنے کے لئے مسیحیت کے عروج و اوج کے زمانہ میں بھی اپنی علحدگی و خلوت پسندی کو جو ابتداً عام طرز معاشرت تھی بر قرار رکھا - یہ سبب بجائے خود کافی تھا - دوسرا سبب یہ ہوا کہ رہبانیت کی ہوا اُس وقت ساری دنیا پر محیط ہو رہی تھی اور نا ممکن تھا کہ کوئی ایک خاص جماعت اس عام و با کے اثرات سے غیر متاثر رہے - خود یہودیوں میں حالانکہ ان کی شریعت اس کے بالکل مخالف تھی ایک فرقہ ایسا موجود تھا جو بالکل خانقاہ نشین تھا ، اور تجرد و ترک تعلق کی زندگی بسر کرتا تھا - رومہ کا یہ حال تھا کہ گو اصولاً وہ رہبانیت کا بالکل مخالف تھا تاہم اُس کے حکماء متاخرین اپنا رجحان اسی طرف ظاہر کرنے لگے تھے بلکہ کلبیہ تو علانیہ ترک دنیا کی تعلیم دینے لگے تھے - مصری فلسفہ جو چند روز میں یورپ پر حاوی ہو گیا تھا - یونانی فلسفہ سے ابھی زیادہ اسی زاہدانہ طرز زندگی کا موید تھا - ان کے علاوہ اور ابھی متعدد فرقے جن کے عقاید کے ڈانڈے ، مسیحی عقائد سے ملے ہوئے تھے اسی طرز زندگی کی تائید کر رہے تھے - غرض دنیا رہبانیت کے استقبال کے لئے ہمہ تن تیار تھی اور مسیحیت میں یہ استعداد تو شروع ہی سے موجود تھی - صرف قوت سے فعل میں منتقل ہونے کی ضرورت تھی اور یہ انتقال ڈیسین تعدیوں کے زمانہ میں واقع ہو گیا - روایت ہے کہ سب سے پہلے راہب پال نے صحرا میں جا کر سکونت اختیار کی ، اس کی تقلید انتونی نے کی اور پھر تو

کچھہ روز بعد صحرا میں اچھی خاصی آبادی قایم ہو گئی - مشرکانہ تعدیوں کا مسیحی نفوس پر ایک اثر یہ بھی پڑا کہ جو شخص مذہب کے لئے جتنی زیادہ تکالیف اُٹھاتا ہے اُسی قدر اُسے ثواب ملتا ہے - پس تعدیوں کے خاتمہ پر جب مظالم برداشت کرنے کا کوئی موقع نہیں رہا تو خوش اعتقاد ہستیوں نے جنگل میں جا جا کر طرح طرح کی تکالیف اپنے لئے پیدا کیں - لوگوں کی تخیل کو اس طرز زندگی سے خاص طور پر کوشش کرکے متاثر کیا گیا - نئے لوگ اس میں اہتمام سے بھرتی کئے جانے لگے اور اس داخلہ میں عورتوں نے پوری سر گرمی سے کوشش شروع کی عورت پر جب مذہب کا رنگ غالب آ جاتا ہے تو وہ کسی محبت کسی رشتہ کا لحاظ نہیں کرتی - کسی گزشتہ باب میں ہم دیکھہ چکے ہیں کہ بت پرست شوہروں کی مسیحی بیویاں اپنے شوہروں سے چھپا چھپا کر مسیحیوں سے ربط رکھتی تھیں - یہی صورت اب بھی پیش آئی - راہبوں نے اپنا جادو عورتوں پر ڈالا اور مائیں چرا چرا کر اپنی اولاد کو راہبانہ زندگی کے لئے تیار کرنے لگیں - باپ اپنی اولاد کو کسی ملکی، سیاسی یا جنگی خدمت کے لئے تجویز کرتا ہی رہ جاتا تھا اور اُدھر ماں سب ٹھیک ٹھاک کرکے اُس کا ہاتھہ کسی راہب کو پکڑا دیتی تھی - بیسیوں راہب معلموں کا بھیس بدلے ہوئے پھرتے تھے اور بچوں کو پھسلا پھسلا کر اپنے حلقہ میں شامل کرتے تھے - جمہور پر اب خطیبوں کے بجائے واعظوں کا اثر تھا اور ایسے ایسے ذی اثر واعظین جیسے - ایمبروز ، اگستا ین ، کریزوستم ، بیسل ، و گری گوری تمامتر رہبانیت کی حمایت میں وعظ کرتے تھے - پھر ہر عمل کے لئے رد عمل بھی ضروری ہوتا ہے ملک کے عام

تعیش و انہماک دنیا داری کے خلاف رد عمل ہونا لازمی تھا اور وہ یوں ہوا کہ صدہا افراد شہر کی زندگی سے اُکتا کر جنگل میں جا کر بس گئے - بہت سے غلام و مجرمین بھی قانونی گرفتوں سے بچنے کے لئے وہاں جا کر آباد ہو گئے - چند روز کے بعد رہبانیت کے وجوب و استحسان پر مذہبی استدلالات بھی قایم ہونے لگے - اس اعتراض کے جواب میں کہ ''خود مسیح تو تارک الدنیا نہ تھے - بلکہ اچھی خاصی طرح اسی دنیا کے کارو بار میں رہتے تھے' ان کے بعض اتباع مخصوص میں عورتیں تھیں اور خود حضرت نے اپنے فرض تبلیغ و ارشاد کی ابتدا ایک شادی کی تقریب سے کی تھی'' موتیدان رہبانیت مسیح کے تجرد' مریم کے کنوارپن' اور نو جوان اُمرا' کو مسیح جو خاص طور پر پند نصائح کرتے تھے' ان چیزوں کو سنداً پیش کرتے تھے - حواریان اعظم میں سینٹ پیٹر (پطرس) کا جو درجہ ہوا ہے وہ مخفی نہیں' حالانکہ وہ متاہل تھے - اس اعتراض کی تاویل یوں کی جاتی تھی کہ وہ شرف حواریت حاصل کرنے کے بعد کبھی اپنی بیوی سے ہم بستر نہیں ہوئے' بلکہ دیگر حواریوں کی طرح ہمیشہ ہم بستری سے محترز رہے - سینٹ پال خود بھی غالباً مجرد تھے اور تجرد کی تائید میں عجیب و غریب دلایل پیش کرتے تھے - اس طرز استدلال کی ایک دلچسپ مثال سینٹ جروم کے الفاظ میں ملتی ہے - فرماتے ہیں کہ کشتی نوح پر پاک جانور جو سات سات کی تعداد میں سوار کئے گئے اور ناپاک جانوروں کے جوڑے لئے گئے' اس کے ذریعہ سے خدا نے تجرد کی افضلیت دکھا دی پھر جو جانور جفت عدد میں لئے گئے اُن کا بھی ایک ھی ایک جوڑا رکھا گیا تاکہ ازدواج مکرر کی معصیت کبیرہ

کا کبھی ارتکاب نہ ہوسکے اس زمانہ سے تمام دنیا کی مسیحیت کے لئے اُسوہ حسنہ سینٹ جیمس کا وجود قرار پایا - جس کی ذات میں تمام فضائل انسانی مجتمع تھے اور جو " رحم مادری سے مقدس و مطہر پیدا ہوا تھا"۔ اس کے اوصاف یہ تھے کہ -

" وہ شراب مسکرات و لحم حیوانات سے محترز تھا ۔ اس کے سر پر کبھی استرہ نہیں لگا وہ نہ کبھی حمام میں گیا اور نہ اپنے جسم میں روغن لگنے دیا ، اس نے ہمیشہ سوتی کپڑے پہنے - اون کی پوشاک کبھی نہیں پہنی - گرجا کے اندر وہ روز تنہا جایا کرتا - اور گھٹنوں کے بل جھک کر گھنٹوں خلقت کی مغفرت کی دعائیں کیا کرتا - اس عمل کی مزاولت کا یہ نتیجہ ہوا کہ اس کے گھٹنے اونٹ کے گھٹنوں کی طرح سخت ہو گئے "۔

اس تحریک رہبانیت کی اشاعت میں گبن نے خوب کہا ہے کہ اسی قدر تیز یا اسی قدر سست تھی ، جتنی خود تحریک مسیحیت کی تھی - اس وقت کے کل زاہدوں کا مجموعی شمار ظاہر ہے کہ مورخین کے اختلات بیان کے باعث قطعی طور پر نہیں معلوم ہوسکتا - تاہم اس کا اندازہ اعداد ذیل سے ہوسکتا ہے سینٹ پیکو میس کے زیر تربیت (۷۰۰۰) راھب تھے - سینٹ جروم کے زمانہ میں ایسٹر کی تقریب پر تقریباً ۵۰۰۰۰ راھبوں کا مجمع ہوتا تھا - چوتھی صدی میں اکیلے صحرائے نیٹریا میں صرف ایک راھب کی ماتحتی میں ۵۰۰۰ راھب تھے۔

مصر کے ایک شہر کی ساری آبادی انہیں لوگوں کی تھی اور ان کی تعداد ۱۰۰۰۰ راہبوں اور ۲۰۰۰۰ کنواریوں کی تھی - سینٹ سراپین کی ماتحتی میں ۱۰۰۰۰ راہب تھے اور چوتھی صدی کے خاتمہ پر تو یہ حالت ہوگئی کہ جتنی خود مصر کے شہریوں کی آبادی تھی تقریباً اسی قدر ان زاہدوں و راہبوں کی تھی - مصر رہبانیت کا وطن اصلی تھا - لیکن تھوڑی ہی مدت میں یہ ہوا تمام مسیحی ممالک میں چل گئی - سینٹ زینو ' و سینٹ تھیینس نے اسے اٹلی میں روشناس کیا اور پھر سینٹ جروم نے اسے یہاں خوب ترقی دی سینٹ هلوین نے اس کی تخم ریزی فلسطین میں کی اور دیکھتے ھی دیکھتے وهاں هزارها اشخاص اس حلقه میں داخل ہوگئے اور اس کا دائرہ میاپرس تک وسیع ھو گیا - آرمینیا اور اس کے مضافات میں اسے سینٹ بوسٹیتھیس نے پھیلایا اور دریائے یوکسین کے کنارہ سینٹ بیسل نے گال میں اس کی بنا سینٹ مارٹن کے هاتھوں پڑی اور جب انھوں نے وفات پائی تو ۲۰۰۰ راہبوں نے ان کی نماز جنازہ پڑھی اور صدها نامعلوم الاسم مشنریوں نے اسے حبش ' جزائربحرروم آیرلینڈ و ویلس میں رواج دیا —

اسی سلسله میں حیرت انگیز صرف ان تارکان دنیا کا شمار ھی نہیں ' بلکه اس سے عجیب تر یہ کہ جو لوگ اپنے مزاج و طبیعت کے لحاظ سے اس طریق زندگی کے دشمن شدید تھے وہ تک ان لوگوں کا احترام و اکرام کرتے تھے - سینٹ آگستاین جو تجربہ کے خطرات و نقصانات سے پوری طرح واقف تھا ' سینٹ ایمبروز جو ایک

دور اندیش مدبر تھا' سینٹ جروم و سینٹ بیسل جو عالم متبحر تھے' سینٹ کریزوستم جو جمہور روم پر ایک زبردست خطیبانہ اثر رکھتا تھا' یہ سب کے سب اس راہبانہ طریق زندگی کے پر جوش وکیل ہوئے ہیں - اور سینٹ آرسینس جو مدتوں شاہ ارکیڈیس کے دربار میں رہ چکا تھا' خود ایک زبردست زاہد مرتاض ہوگیا - ہزارہا زائرین ان بزرگان صحرا کے شوق زیارت میں بیابان نوردی کرتے پھرتے اور لوٹ کر ان کے خوارق عادات کرامات و معجزات کی عجیب عجیب داستانیں ملک میں پھیلاتے —

فصل (۶)

راہبان صحرا

دنیا کی تاریخ اخلاق میں شاید اس وبائے رہبانیت سے زیادہ پردرد پر اثر کوئی داستان نہیں غضب ہے کہ وہ قومیں جو فلاطون و خسرو کے خم کدہ سے سرشار تھیں اور جن کی نظروں کے سامنے سقراط وکیٹو کی پاک و محترم سیرتیں موجود تھیں اب ان کا مطمح نظر' ان کا نصب العین' ایک ایسا حقیر و دنی و فرومایہ مراقی وجود رہ گیا تھا جو جہالت کا پتلا' حب وطن سے معرا اور لطایف خلقی سے بے بہرہ ہو جس کی زندگی تمام تر ظالمانہ خود آزاریوں کے لئے وقف اور جسے شدت وہم و جلون سے خود اپنے سایہ پر دیو و جن کا گمان ہوتا ہو - دو چار سال نہیں کوئی پورے دو سو سال تک جسم کشی منتہائے اخلاق

سمجھی جاتی رہی - سینٹ جروم کس مزہ سے بیان فرماتے ہیں کہ ایک راہب صاحب نے ۳۰ سال تک صرف نان جویں اور خاک آلوہ پانی پر بسر کی تھی - ایک اور بزرگ مدۃالعمر ایک تنگ و تاریک غار میں رہا کئے اور کبھی روزانہ غذا میں پانچ انجیروں سے زیادہ نہ کھایا - ایک تیسرے بزرگوار اِن سے بھی بڑہ چڑھکر تھے - یہ حضرت سال بھر میں صرف ایک بار ایسٹر کے دن اپنی حجامت بنواتے تھے نہ کبھی کپڑے دھوتے تھے اور نہ کبھی لباس بدلتے تھے، تاوقتیکہ وہ خود ھی پارہ پارہ ھو کر جسم سے علحدہ نہ ھو جائے آنکھوں کی بصارت نے شدت فاقہ کشی سے جواب دے دیا تھا اور جسم کی جلد مثل پتھر کے سخت اور کھر کھری ھوگئی تھی - اسی طرح سینٹ میکیریس اسکندروی کی بابت مشہور ھے کہ وہ چھہ ماہ تک برابر ایک دلدل میں سویا کئے تا کہ اُن کے برھنہ جسم کو زھریلی مکھیاں ڈسیں - نیز یہ کہ یہ ھمیشہ ایک من لوھے کا وزن اپنے اوپر لادے رھتے تھے - اُن کے مرید سینٹ یوسیبس اس سے بھی بازی لے گئے تھے کہ یہ حضرت ھمیشہ تقریباً دومن لوھے کا وزن لادے رھتے تھے اور تین سال تک ایک خشک کنوئیں کے اندر مقیم رھے - سینٹ سیبینیس ھمیشہ وہ غلہ استعمال کرتے تھے جو ایک مہینہ تک پانی میں پڑے پڑے سڑگیا ھو - سینٹ بیسیرین نے چالیس شبانہ روز خار دار جھاڑیوں کے اندر گزارے اور چالیس سال تک سونے کے وقت کبھی لیٹتے نہیں - سینٹ پیکومیس بھی پندرہ سال تک اس ریاضت پر عامل رھے بعض حضرات نے سینٹ مارکیسن کی طرح یہ عادت ڈالی لی تھی کہ رات دن میں صرف

ایک بار کھانا کھاتے تھے اوو وہ بھی صرف اس مقدار میں کہ رشتۂ حیات منقطع نہ ہونے پائے - چنانچہ اسی جماعت کے ایک رکن کی بابت منقول ھے کہ ان کی روزانہ غذا صرف ۳ چھٹانک روٹی اور چند جڑی بوٹیاں تھیں وہ کبھی بستر یا چٹائی پر نہیں سوئے بلکہ کبھی استراحت کے طریقہ پر لیٹے تک نہیں یہاں تک کہ اکثر فرط بیداری سے یہ حالت ہوتی کہ کھانا کھاتے کھاتے انھیں نیند کا جھونکا آجاتا اور منہ سے نوالہ بے اختیار گر جاتا - بعض حضرات ایک دن ناغہ دے کر کھانا کھاتے - بلکہ ایک گروہ کی بابت تو یہاں تک مشہور ھے کہ ایک ایک ہفتہ تک وہ منہ میں دانہ نہیں ڈالتے تھے - چنانچہ سینٹ بیکیرہس کی بابت روایت ھے کہ وہ ہفتہ بھر فاقہ کرتے تھے اور اتوار کے دن چند کچھی جڑی بوٹیاں کھاتے تھے اسی طرح ایک اور مشہور راھب یوحنا کے متعلق منقول ھے کہ وہ متصل تین سال تک کھڑے ہوئے عبادت کرتے رہے اس مدت میں ایک لمحہ کے لئے بھی نہ بیٹھے نہ لیٹے بلکہ جب بہت تھک جاتے تو چٹان پر اپنے جسم کو سہارا دے لیتے اور ہفتہ میں صرف ایک بار کھانا کھاتے اور وہ کھانا کیا ہوتا ؟ صرف وہ تبرکات جو گرجا سے اتوار کے روز لائے جاتے تھے - راھبوں کے مسکن علی العموم اُس وقت مکانات نہیں ہوتے تھے - بلکہ وحشی درندوں کے غار ، خشک کنوئیں یا قبرستان - بعض زاھد لباس کسی قسم کا نہیں استعمال کرتے تھے - ستر پوشی کا کام اپنے جسم کے بڑے بالوں سے لیتے تھے اور چوپایوں کی طرح ھاتھ پیر کے بل چلتے تھے - عراق و شام میں

ایک اور طایفہ اہل زہد کا رہتا تھا جس کا مسلک یہ تھا کہ یہ لوگ ہمیشہ کھلے میدانوں میں پہاڑوں کی وادیوں میں رہتے تھے اور گوشت یا روٹی کے بجائے صرف گھاس کھاتے تھے - جسم کی طہارت ' روح کی پاکیزگی کے منافی سمجھی جاتی تھی اور جو زاہد مرتبۂ زہد میں جتنی زیادہ ترقی کرتے جاتے تھے - اُسی قدر وہ مجسمۂ عفونت و غلاظت ہوتے جاتے تھے - سینٹ انھیٹیس نہایت فخر سے بیان کرتا ہے کہ سینٹ انتونی بہ ایں کبیر سنی ' کبھی مدۃالعمر اپنے پیر دھونے کے عصیاں کا مرتکب نہیں ہوا - سینٹ پیمسن میں اس قدر استقلال نہ تھا اُس سے آخر میں ایک بار یہ گناہ سرزد ہوگیا تھا اور جب اپنی بریت میں اُس نے یہ کہا کہ میرا مقصود جسم کشی نہیں بلکہ جذبات کشی ہے تو زاہدین و راہبین کی جماعت فرط حیرت سے اس کا منہ دیکھنے لگی - سینٹ ابرہام جن کی بابت خوش عقیدہ راویوں کا بیان ہے کہ وہ حسن و جمال میں اپنی نظیر نہ رکھتے تھے اور اُن کے چہرہ سے نور باطن ٹپکتا تھا اپنی وضع کے ایسے پکے تھے کہ پنجاہ سالہ مسیحی زندگی میں انھوں نے اپنے چہرہ یا پیر پر پانی کی کبھی چھینٹ نہ پڑنے دی - سینٹ ایمن نے کبھی اپنے تئیں برہنہ نہیں دیکھا - پیلویا ایک مشہور دوشیزہ ہوئی ہیں - ان کا سن شریف ساٹھ سال تک پہنچ گیا تھا اور بارہا کثافت کے باعث سخت بیمار ہوئیں - لیکن کبھی بجز اپنی اُنگلیوں کے اور کسی حصہ جسم میں پانی نہیں لگنے دیا - سینٹ بوفریکسا ۱۳۰ کنواریوں کی ایک جماعت میں شریک ہوئی جن کا اصول یہ تھا کہ یہ کبھی اپنے پیر

نہیں دھوتی تھیں اور غسل کے نام سے تو لرز اٹھتی تھیں - ایک زاھد صاحب ایک بار رستہ میں چلے جاتے تھے کہ حضرت کی نظر اپنے عکس پر پڑی تو یہ دیکھا کہ جنگل میں ان کے آگے آگے ایک ننگا دھڑ نگا مرد جس کا سارا جسم شدت کثافت و غلاظت سے سیاہ پڑگیا ہے چلا جارھا ہے مگر خوش عقیدگی کابھلاھوکہ حضرت اسے بجائے اپنا عکس سمجھنے کے یہ سمجھے کہ کوئی شیطان وسوسہ اندازی کے لئے ان کے ساتھہ ساتھہ چل رہا ہے - مصر کی سینٹ میری اپنے زمانہ میں ایک بہت حسین عورت تھی اس نے اپنے گناھوں کا کفارہ یوں کیا کہ پورے ۴۷ سال تک کبھی اپنے کسی حصۂ جسم کو نہیں دھویا - بعض زاھد کبھی جرأت کر کے صفائی جسم پر اگر کبھی توجہ کرنے بھی لگتے تو ان پر سخت لعن طعن ھوتی - راھب الگزنڈر کس تاسف وتحیر سے فرماتے ھیں کہ " ایک وہ زمانہ تھا جب ھمارے اسلاف منہ دھونا حرام جانتے تھے اور ایک ھم لوگ ھیں کہ حمام جایا کرتے ھیں " - اسی ضمن میں ایک روایت یہ مشہور ہے کہ ایک صحرا کے خانقاہ نشین زاھدوں کو پانی کی سخت تکلیف تھی تھیوڈو سیس نے جناب باری میں اس کی فریاد کی - دعا قبول ھوئی اور ایک چشمہ جاری ھو گیا - پانی دیکھہ کر زاھدوں کے دل میں لہر آئی اور وہ اس میں غسل کرنے لگے - ابھی ایک ھی بار غسل کیا تھا کہ غضب الٰہی نازل ھوا یعنی چشمہ بند ھو گیا توبہ و استغفار - کفارہ و روزے شروع ھوے - لیکن سال بھر تک یہ تمام چیزیں بے اثر رھیں - آخر کار جب حمام مسمار کردیا گیا تب چشمہ دو بارہ رواں ھوا - اس طرح کی اور بھی بہت سی روایات منقول ھیں - مگر شاید سب

سے زیادہ حیرت انگیز واقعہ سینٹ سمیو کا ہے جس کے متعلق یہ بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ رہبانیت کی تاریخ میں اس سے بڑھکر غلاظت و نجاست کی کوئی اور مثال نہیں ملتی۔ حضرت نے اپنے جسم کے گرداگرد ایک رسی اس قدر مضبوط اور کس کر کے باندھی تھی کہ وہ گوشت کے اندر پیوست ہو گئی تھی اور سارا گوشت سڑ گیا تھا یہ سڑاند اس قدر تیز تھی کہ پاس بیٹھنے والے ناک نہیں دے سکتے تھے اور زخموں میں سے کیڑے برابر ٹپکا کرتے تھے۔ بعض دفعہ آپ خانقاہ کا قیام چھوڑ کر ایک خشک کنوئیں میں جو شیاطین کی بستی سمجھا جاتا تھا سکونت اختیار فرماتے تھے۔ حضرت نے تین منارے بنوائے تھے جن میں سے ایک ۶۰ فٹ بلند اور صرف ۲ گز کے دور کا تھا آپ اس کے اوپر ۳۰ سال تک سکونت گزیں رہے اور اکثر اس تیزی سے سجدہ کرتے رہے کہ ایک شخص نے جب ان سجدوں کو شمار کرنا چاہا تو اس نے ۱۲۴۴ تک شمار کیا تھا کہ تھک گیا۔ یہی بزرگ پورے سال بھر تک صرف ایک پیر کے بل کھڑے رہے اور دوسرا پیر زخموں اور ناسوروں سے چور ہو گیا تھا لیکن ایک مرید کو جو ہر وقت پاس ہی رہتا تھا یہ حکم تھا کہ جوں ہی اس زخم سے کوئی کیڑا نکل کر گرے اُسے پھر اٹھا کر اُسی جگہہ پر رکھدے اور خود اُس کیڑے سے فرماتے جاتے تھے کہ "خدا نے تجھے جو رزق دیا ہے اُسے کھا"۔ ان حالات کو سن سن کر صدہا زائرین دور دراز ممالک سے اس کی زیارت کو آتے تھے اور جب ان کا وصال ہو گیا تو زاہدین و راہبین کے ایک جم غفیر نے جنازہ کی مشایعت کی۔ ان کے تعمیر کردہ

ستون کے اوپر ایک ستارہ درخشاں طلوع ہوا۔ سب نے انہیں آیات من آیات اللہ قرار دیا اور صدہا راہبین ان کے نقش قدم کی پیروی پر کمر بستہ ہو گئے —

راہبوں کے سوانح زندگی یہاں جو ذرا تفصیل سے بیان کئے گئے اس کا سبب یہ ہے کہ میرے نزدیک درج - خلاق پر جتنی ان سے روشنی پڑتی ہے اتنی کسی اور شے سے نہیں پڑتی - خالص تاریخی حیثیت سے ممکن ہے کہ یہ کچھہ بھی اہم نہ ہوں - لیکن اخلاقی حالت کا سراغ لگانے کے لئے بے حد اہمیت رکھتے ہیں - ان سے یہ بے شبہہ نہیں معلوم ہوسکتا ہے کہ اس زمانہ میں لوگوں کے اعمال و افعال کیا تھے تاہم ان کی اندرونی زندگی کا اگر پتہ چل سکتا ہے تو اسی ذریعہ سے - پادریوں کی تصانیف گرجا کے فرامین اور تحریروں سے صرف ظاہری حالات معلوم ہوسکتے ہیں - یعنی یہ کہ اہل کلیسا اپنے تئیں دنیا کے سامنے کس رنگ میں ظاہر کرنا پسند کرتے تھے لیکن اس امر پر کہ وہ فی الواقع کیا تھے اگر کچھہ روشنی پڑ سکتی ہے تو صرف ان کی سوانح عمریوں پر نظر کرنے سے ان کے اعمال دست و زبان کا سراغ اور طریقوں سے بھی چل سکتا ہے لیکن اسرار دل و دماغ کا صرف اسی ایک طریقہ سے اور اس ذریعہ سے جو کچھہ حالات ہم تک چشم دید گواہوں کے ذریعہ سے پہنچے ہیں گو ان کی جزئیات و تفصیلات میں رنگ آمیزیوں سے کام لیا گیا ہے - تاہم ہمیں یہ کہنے میں ذرا تامل نہیں کہ بحیثیت مجموعی یہ بالکل صحیح و مطابق واقعہ ہیں - خود آزادیوں کی چند مثالیں جو اوپر درج کی گئی ہیں انہیں صرف مشتے نمونہ از خروارے سمجھنا چاہئے - ورنہ اس قسم کے واقعات اگر

هم تفصیل سے درج کرنا چاہیں تو کئی ضخیم جلدیں تیار ہو جائیں اور ہو جائیں کیا معنی، واقعتاً تیار ہوئی ہیں - سینٹ بندق یکتا کے وقت تک یہ معیار اخلاق تمام دنیائے مسیحیت پر مسلط رہا کہ جو جتنا زیادہ جسم کو مبتلائے آزار و تکلیف رکھے گا اسی قدر روحانی ترقی حاصل کرے گا - مغرب کی آب و ہوا ایسی نہ تھی کہ وہاں کے راہبین عملاً مصری راہبوں کا زہد و ریاضات میں مقابلہ کر سکتے - تاہم معیار اخلاق ان کا بھی یہی تھا اور وہ عملی زندگی میں اپنے ریاضتوں کی کمی کی تلافی معجزات و کرامات میں افراط کے ذریعہ سے پوری کر دیتے تھے - سینٹ جروم اور اس کے بعض رفقا نے زہد و ریاضات کی ان ناقابل برداشت سختیوں کو کسی قدر ہلکا کرنا چاہا جن کے نتائج جنون خود کشی کی شکل میں ظاہر ہونے لگے تھے - اور جن کے باعث بیسیوں راہب گرجائی حکومت سے آزاد ہوکر ادھر ادھر اب مانگتے پھرتے تھے - لیکن ان مصلحین کی کوششیں کچھہ زیادہ چلنے نہ پائیں - اکثر راہبوں نے تاڑ کے کے پتوں کی چٹائیاں بنانے کو اپنا ذریعہ معاش قرار دیا لیکن بادیہ نشینی نے ان کی ضروریات زندگی تو کچھہ رکھی ہی نہ تھیں اس لئے رفتہ رفتہ انھوں نے یہ پیشہ بھی ترک کردیا - اور اب سب سے زیادہ تقدس و احترام کا حقدار وہ سمجھا جانے لگا جو سب سے زیادہ خود آزاریوں کا عادی ہو - لیکن اس اخلاقی معیار کی یکسانیت و یکرنگی کے باوجود اختلاف طبائع بھی اپنا اثر دکھائے بغیر نہ رہا - مثلاً بعض جاہل، کاہل، اپاہج و کندۂ ناتراش راہب ایسے بھی ہوتے تھے جو دنیا کی جد و جہد سے رہبانیت کی پناہ میں آجانا غنیمت جانتے تھے اور اپاہج پن کی زندگی پڑے پڑے گزارا کرتے تھے - اسی طرح کچھہ لوگ ایسے بھی ہوتے تھے جو خوشنما کیاریاں

اور چمن وغیرہ کے بنانے میں مشغول رہتے تھے - سینٹ سراپئین کے متبعین کاشتکاری میں مصروف رہتے تھے اور غربا کے لئے غلہ کی کثیر مقدار مفت روانہ کیا کرتے تھے - ایک راہب زندہ دلی میں اس قدر مشہور تھا کہ لوگ اس کی صورت دیکھتے ہی اپنے غم و حزن کو بھول جاتے تھے - لیکن یہ ایک استثنائی مثال تھی - ورنہ عام حالت یہ تھی کہ راہب کا حجرہ ایک دہشت کدہ رہا کرتا تھا - شیاطین کے وسوسہ اندازی کا خوف، عالم آخرت کی دہشت، آہ و اشکباری، نالۂ و فریاد، یہ ان زاہدوں کا اوڑھنا بچھونا تھا - علم و تعلیم کے تذکرہ گویا بالکل ممنوع تھے - سینٹ جروم کا مقولہ تھا کہ راہب کا فرض تعلیم دینا نہیں بلکہ رونا رلانا ہے" - ایک بڑی بات یہ تھی کہ التباس حواس کے اثر سے دیو و شیاطین کی خیالی صورتوں کا نظر آنا برگزیدگی و تقدس کی سب سے بڑی دلیل سمجھی جاتی تھی - اور چونکہ تعلیم یافتہ دماغوں پر یہ اثر کم ہوتا تھا - اس لئے راہبین کی جماعت میں جہلا اور جہالت کو خاص فروغ حاصل تھا - سینٹ انتونی نے ابتدی طالب علمی کے زمانہ میں محض اس بنا پر پڑھنا چھوڑ دیا تھا کہ پڑھنے لکھنے میں دوسرے طالب علموں کا ساتھہ ہوگا اور ان سے مکالمت و مجالست کرنا پڑے گی سینٹ جروم ایک زمانہ میں سسرو کے بڑے معترف تھے - خود بیان فرماتے ہیں کہ ایک روز شب کے وقت انھیں فرشتہ آسمان پر مسیح کے سامنے اٹھالے گئے اور وہاں یہ فرد جرم عاید کی گئی کہ یہ مسیح کے بجائے سسرو کے کلام کو پڑھتا ہے - چنانچہ اس جرم پر فرشتوں نے اچھی طرح ان کی تازیانہ بازی کی - ان کے اوپر ان کے رفقا کی طرف سے بھی ایک خاص اعتراض یہ ہوتا

تھا کہ وہ مشرک مصنفوں سسرو، ورجل وغیرہ کو پڑھتے اور ان کی تعلیم دیتے ھیں - بعض راھبوں کا کتب خانے تمام تر انجیلوں پر مشتمل ھوتا تھا، جسے وہ فروخت کرکے غربا کی اعانت کرتے تھے - ایک مرتبہ ایک راھب نے کسی دوسرے راھب کے پاس چند کتابیں رکھی ھوئی دیکھ لیں اور اس پر وہ نہایت برھم ھوا - ایک اور راھب کی بابت روایت ھے کہ وہ علم‌اللسان کا بڑا ماھر تھا - راھب ھوکر اُس نے اس گناہ کا کفارہ یوں کیا کہ ۳۰ سال تک سکوت مطلق اختیار کئے رھا —

یہ طرز معاشرت و زندگی رکھنے والوں کے لئے معجزات و کرامات میں کوئی استبعاد باقی ھی نہیں رہ‌سکتا تھا - اور التباس حواس کے جتنے عناصر ھیں وہ سب کے سب آکر اس طرز معاشرت میں اکھٹا ھوگئے تھے - جہالت وھم پرستی، خلوت نشینی، استہلاک زھد و ریاضت اور دیو و شیاطین کے وجود پر مذھبی حیثیت سے اعتقاد، ان سب چیزوں کے مجموعہ کا قدرتاً یہ اثر پڑتا تھا کہ خیالی صورتیں حقیقی نظر آنے لگتی تھیں - پھر قبرستانوں میں لاشوں کے انبار کے درمیان سکونت اختیار کرنے سے اور شب تار میں سنسان و لق و دق صحرا میں تنہا ریاضت کرتے وقت جب کہ کان میں صرف وحشی درندوں کی آواز ھر طرف سے آتی ھوتی تھی - ایسی حالت میں اکثر ان عابدوں کا واھمہ یہاں تک زور پکڑتا تھا کہ شہوت انگیز یا دھشت ناک مناظر متشکل ھو ھوکر ان کی آنکھوں کے آگے چلتے پھرتے نظر آنے لگتے تھے - متخیلہ پر فوق‌الحد بار ڈالنے اور جسم کو بے حد کمزور و ناتواں رکھنے کا لازمی

نتیجہ یہ تھا کہ مختلف و متضاد جذبات مثلاً فرط طرب و وفور غم دفعتاً تیزی کے ساتھ ان عابدوں کے نفوس پر مسلط ہو جایا کرتے تھے اور یہ انھیں کسی فوق الفطرت قوت کی کرشمہ سازیوں کا خیال کرتے تھے - بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا تھا کہ اس تنہائی اور سناٹے میں جب کہ یہ اہل تقویٰ اپنی توجہ کی یکسوئی و استغراق کی کوششوں میں مصروف ہوتے تھے - یک بیک ان کے ذہن میں پچھلی مسرتوں کی یاد آجاتی - کبھی یہ یاد اُن پیاری صورتوں کی ہوتی جن پر ایک زمانہ میں اُن کی نگاہ محبت پڑا کرتی تھی کبھی اُن نغمہ ہائے شیریں کی ہوتی جن کی آواز کو ایک وقت میں یہ جان کے برابر عزیز رکھتے تھے اور کبھی یہ عباد یہ خواب بیداری دیکھتے کہ گویا سپاہی کے اکھاڑے میں موجود ہیں اور سامنے جوڑیں ہورہی ہیں - ایک طرف یہ سب کچھ تھا اور دوسری طرف ہر خفیف سے خفیف امر کا انتساب شیطانی مداخلت کی طرف کیا جاتا تھا - ایک راہب کی بابت روایت ہے کہ جب وہ جنگل میں چلتے چلتے بہت خستہ ہوگیا تو اُس نے اپنے دل میں کہا کہ اگر اس وقت تازہ شہد کہیں مل جاتا تو طبیعت کو کیسی تفریح ہوجاتی - اتنے میں اس کی نگاہ سامنے کی چٹان پر پڑی تو دیکھا کہ واقعی مکھیوں کا چھتا لگا ہوا ہے - یہ ایک معمولی سی بات تھی - لیکن راہب پر ایک دہشت طاری ہوگئی - وہ اسے قطعاً شیطان کی وسوسہ اندازی سمجھا اور رد سحر کی دعائیں پڑھتا ہوا بھاگا - اس طرح کی بیسیوں روایات ہیں مگر ان سب میں زیادہ دردناک روایات نوجوان راہبوں کی ہیں - ان غریبوں کے خون میں بدستور حدت ہوتی تھی طبیعت میں بدستور

اُمنگ و جوش ہوتا تھا اور اوایل عمر میں پری جمالوں کی ہم صحبتی و نازبرداری کی خو پڑچکی ہوتی تھی ایسے لوگوں کے لئے محال تھا کہ فطرت کے پر قوت جذبات کو اکبھار کی مٹادیں - یہ جذبات بڑے بڑے جتنوں سے دبائے جاتے - لیکن رہ رہ کر اُبھرتے اور اس زور سے اُبھرتے کہ عابدان شب زندہ دار کے نظام دماغی کو تخیل اور ان کی جمعیت حواس کا شیرازہ یکسر منتشر کردیتے - جنون و خود کشی یہ دو نتائج علی العموم ظہور پزیر ہونے لگتے تھے - ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ سینٹ پلیمین وسینٹ پیکومیس جنگل میں کھڑے ہوئے باتیں کر رہے تھے کہ یک بیک ایک نو عمر راہب جس کے چہرہ سے آثار و حشت و جنون عیاں تھے دوڑا ہوا آیا اور رو رو کر اور ہچکیاں لے لے کر اُس نے اپنا پر آلم دکھڑا یہ سنایا کہ ایک حسین عورت اُس کے حجرہ میں چلی آئی اور اسے اپنے سے ملوث کرکے دفعتاً غائب ہوگئی یہ کہہ کر اُس نے زور سے ایک چیخ ماری اور تیزی سے بھاگا بھاگتے بھاگتے سارا جنگل ختم ہوگیا اور وہ ایک موضع کے سرحد پر پہنچا جہاں حمام کے سامنے خوب آگ روشن تھی اس آگ میں اُس نے اپنے تئیں جھونک دیا اور چند لحظہ میں تودۂ خاکستر ہوگیا - یہ بھی خیال رکھنا چاہئے کہ اس قبیل کے واقعات صرف نوعمر و نومشق ہی عباد کو نہیں پیش آتے تھے بلکہ بڑے بڑے پرانے زاہدان مرتاض بھی بسا اوقات ان کا شکار ہوجاتے تھے - چنانچہ ایک راہب کا واقعہ مشہور ہے جو زہد و تقویٰ میں خاص شہرت رکھتا تھا اور جس کی ریاضات ضرب المثل تھیں یہاں تک کہ اسے خود بھی اپنی جذبات کشی پر غرہ ہوگیا تھا کہ ایک روز ایک راہ گم کردہ اور تھکی ماندی عورت نے آکر اس کے حجرہ پر دستک

دی اور دو گھڑی کے لئے جنگلی جانوروں کے خوف سے اس کی پناہ میں آجانا چاہا - زاہد نے رحم کھا کر یہ درخواست منظور کرلی اور اس عورت نے بہ کمال عقیدت اس کے دست مبارک کو مس کرنا چاہا - ہاتھہ کا ہاتھہ سے مس ہونا تھا کہ حضرت زاہد کے جسم میں گویا ایک برقی رو دوڑ گئی اور چشم زدن میں سارا زہد و تقویٰ کافور ہوگیا - ہاتھہ ہم آغوشی کی تمنا میں بڑھے - لیکن قبل اس کے کہ جسم سے جسم مس ہو وہ عورت نظروں سے اوجھل تھی - گویا ایک چھلاوا تھا جو معاً نظر سے غائب ہوگیا اور شیاطین و ارواح خبیثہ کی جماعت سے قہقہوں کی آوازیں چلی آنے لگیں - اب حضرت زاہد کو نظر آیا کہ ان کی سرشت میں ریاضت و زہد کے علاوہ بھی کوئی اور عنصر شامل ہے جسے کوئی ورع و تقویٰ مغلوب نہیں کرسکتا - کوئی اور شخص اس کی جگہ پر ہوتا تو فرط حسرت و ندامت سے مجنوں ہو جاتا یا خود کشی کرلیتا - لیکن اس کی طبیعت پر یہ اثر پڑا کہ اس نے اسی وقت زاہدانہ زندگی کو خیر باد کہا اور عام دنیوی طرز معاشرت اختیار کرکے بقول مورخین مسیحیت کے جہنم لئے اپنے تئیں تیار کرنے لگا —

اس طرز کے قصص و روایات کی اشاعت کا نتیجہ یہ ہوا کہ جنس اناث سے ربط و تعلق رکھنا ہی سخت خطرناک سمجھا جانے لگا - لیکن ترک تعلق کرلینا بھی آسان نہ تھا - چنانچہ اس زمانہ کی تاریخ میں جہاں اس طرح کے واقعات بہ کثرت ملتے ہیں کہ یہ زہاد عورت کے سایہ تک سے بھاگتے تھے - وہاں اس طرح کی مثالوں کی بھی کمی نہیں کہ عورت بکمال خوش عقیدگی

و استقلال ان کا پیچھا کئے چلی جاری ہے ۔
بلکہ بعض عورتیں اس حیثیت سے بہت کامیاب رہی ہیں مثلاً سینٹ میلینیا کہ قطع نظر اپنی بڑی جائداد کو راہبوں پر وقف کردینے کے اس نے مؤرخ روفینس کی معیت میں شام و مصر میں ایک بڑا دورہ بھی کیا اور تمام زاہدین و راہبین کی زیارت کرتی رہی مگر یہ ایک خاص صورت تھی ورنہ زاہدوں کا عام قاعدہ یہ تھا کہ ان میں سے جو عورت کے سایہ سے جتنے دنوں زیادہ محترز رہتا تھا اسی قدر زیادہ متقی و متورع خیال کیا جاتا تھا ۔ سینٹ بیسل نے بجز کسی شدید مجبوری کے عورت کا چہرہ دیکھنا اپنے اوپر حرام کرلیا تھا ۔ سینٹ جان نے ۴۸ سال تک عورت کی صورت نہیں دیکھی بالآخر اس کی بیوی نے مجبور ہوکر اس کے پاس کہلا بھیجا کہ اگر وہ اسے دیکھنے نہ آے گا تو وہ اپنی جان دیدے گی ۔ یہ سن کر آپ نے یہ جواب دیا کہ " آج رات کو جس وقت وہ اپنی خواب گاہ میں ہوگی میں آؤں گا " اور اس وعدہ کا ایفاء یوں ہوا کہ بیوی نے رات کو اسے خواب میں دیکھہ لیا ۔ رومہ کی ایک نہایت خوش عقیدہ لڑکی کا ذکر ہے کہ وہ اٹلی جیسے دور دراز مقام سے سفر کرکے اسکندریہ محض اس غرض سے آئی کہ سینٹ آرسینیس سے دعا لے ۔ کس مشکل سے اسے باریابی نصیب ہوئی اور اس وقت اس نے بہ کمال الحاح وزاری فقیر سے التجا کی کہ " مجھے اپنی دعاؤں میں یاد رکھنا ۔ " اس پر فقیر آپے سے باہر ہوگیا اور نہایت غضبناک ہوکر بولا کہ " تجھے یاد رکھوں! اب ساری عمر اس دعا میں صرف ہوگی کہ تجھے

بھلاؤں" غریب لڑکی مایوس ہو کر اسکندریہ کے لاٹ پادری کے پاس گئی، اُس نے فقیر کے ارشاد کی یوں تاویل کی کہ "وہ تجھے بھلا دے گا - لیکن تیری روح کو ہمیشہ اپنی دعاؤں میں یاد رکھے گا" - بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا کہ عورتیں خوش عقیدگی کے جوش سے لبریز ہو کر مردانہ لباس اختیار کر لیتیں اور ساری عمر زاہدانہ زندگی میں بسر کر دیتں ان میں سب سے قابل ذکر سینٹ پلیجیا ہے جو پہلے ایک مشہور ایکٹرس تھی - اسے عبادت کا شوق ہوا اور معمولی عبادت میں سیری نہ پا کر اس نے زاہدانہ زندگی اختیار کرنا چاہی - یہ ٹھان کر اس نے مردانہ وضع اختیار کی اور روپ بدلنے میں اسے یہ کمال حاصل تھا کہ ساری عمر مردوں کے ساتھ ریاضات میں مشغول رہی اور وفات کے وقت تک کسی کو اس کے عورت ہونے کا پتہ نہ چل سکا —

بیانات بالا سے رہبانیت و خانقاہ نشینی کی ابتدائی تاریخ کا ایک صاف نقشہ نظر کے سامنے پھر گیا ہو گا - اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اس طرز معاشرت کا مسیحی اخلاق و معیار اخلاق پر کیا اثر پڑا ؟ سب سے پہلی تبدیلی اس سلسلہ میں یہ نظر آتی ہے کہ مختلف محاسن اخلاق کے مدارج اہمیت اُلٹ پلٹ گئے - مثلاً مسیحیت کے قرون اولیٰ میں اور خاص انجیل کی تعلیمات کے مطابق اُم‌الاخلاق ایثار ہمدردی یا محبت و الفت تھی - لیکن چوتھی اور پانچویں صدیوں میں رہبانیت کے زور سے اخلاق کا مرکز ثقل بدل گیا تھا - اب اُم‌الاخلاق الفت و ہمدردی نہیں بلکہ عصمت و عفت تھی - اور عصمت سے یہ مراد نہ تھی کہ آدمی سوا اپنی منکوحہ بیوی کے اور کسی سے

تعلق نہ رکھے بلکہ جائز ازدواجی تعلقات سے اجتناب بھی داخل عصمت تھا اور انسان کے لئے کمال اخلاق یہ قرار پایا گیا تھا کہ وہ اپنے تمام جذبات شہوانی کو یکسر فنا کر دے۔ اس طرز عمل کے مہمات نتائج میرے نزدیک حسب ذیل ہوئے۔—

(۱) ایک اہم نتیجہ یہ نکلا کہ رفتہ رفتہ مذہب میں یبس و تعبس بہت آ گیا۔ رہبانیت پرستوں نے اپنی جگہ یہ سمجھ لیا تھا کہ تقاضائے جنسی فی نفسہ ایک معصیت کبیرہ ہے۔ اور چونکہ یہ تقاضائے فطری جذبات حسد و غضب وغیرہ کی طرح عارضی و ہنگامی نہیں ہوتا، بلکہ اس کی گدگدی رہ رہ کر دل میں اٹھا کرتی ہے اور ان زاہدوں کو اسے ہر وقت دبائے رہنا پڑتا تھا۔ اس لئے انھوں نے یہ خیال قایم کیا کہ اول تو نفس انسانی بجائے خود بدی و بدکاری کی جانب مائل ہے۔ دوسرے یہ کہ ہر لذت معصیت کی طرف مودی ہوتی ہے لہذا ہر لذت معصیت ہے۔ یہ اعتقاد صریح نتیجہ تھا جذبۂ شہوانی کو بالکل مار دینے کا۔ بالکل اسی طرح کہ جیسے یونانی فلسفہ سے تلازم لذت و معصیت کا فقدان، نتیجہ تھا اس حقیقت کا کہ یونانی حکماء ازدواجی بدچلنی کو چنداں معیوب نہیں خیال کرتے تھے اور یونانی پبلک تو ناجائز شہوت رانی کو علانیہ جائز رکھتی تھی —

(۲) دوسرا نتیجہ یہ ہوا کہ جبر و اختیار کے مقدمہ میں فیصلہ اختیار کے حق میں ہو گیا۔ جو شخص یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ انسان کے جذبات اُسے برائی و بدکاری کی کی طرف لے جاتے ہیں۔ لیکن وہ خود اپنے ارادہ سے

رکھتا ہے' وہ انسان کو فاعل مختار لامحالہ مانے گا۔

(۳) تیسرا نتیجہ یہ ہوا کہ جتنے کمالات مردانگی یا جوانمردی سے متعلق ہیں وہ سب یکسر معیوب قرار پاگئے - مثلاً زندہ دلی - خوش طبعی' صاف گوئی - فیاضی - شجاعت - جرأت کہ عابدان مرتاض کبھی ان کے قریب بھی ہو کر نہیں گزرے تھے اور فرقہ کتھولک ہمیشہ انھیں دباتا رہا - حالانکہ پروٹسٹنٹ و سادی تمدن کا اقتضا ہمیشہ یہ رہا ہے کہ انھیں کو سراہا جائے —

(۴) چوتھا مگر نہایت اہم نتیجہ رہبانی طرز معاشرت کا یہ ہوا کہ خانگی زندگی کی بنیادیں متزلزل ہوگئیں اور دلوں سے اعزہ کا احترام واجب کافور ہو گیا - در حقیقت اس زمانہ میں ماں باپ کے ساتھ احسان فراموشی اور اعزہ کے ساتھ قساوت قلبی کی جس کثرت سے نظیریں ملتی ہیں اس کا عام ناظرین اندازہ نہیں کر سکتے - لوگ آج ان زاہدوں کے اعلیٰ زہد و ریاضت ورع و تقویٰ پر سر دھنتے ہیں - لیکن اس سے بے خبر ہیں کہ ان کے یہ ممدوح کس بیدردی سے اپنی ماؤں کی دلشکنی کرتے تھے - بیویوں کے حقوق کی پامالی کرتے تھے اور اپنی اولاد کو یہ دغا دیتے تھے کہ انھیں بے والی و وارث محض دوسروں کے ٹکڑوں کے رحم پر چھوڑ دیتے تھے - ان کا مقصود زندگی تمامتر یہ ہوتا تھا کہ خود انھیں نجات اُخروی حاصل ہو - انھیں اس سے کوئی غرض نہ تھی کہ ان کے متعلقین و متوسلین جئیں یا مریں ایک راہب صاحب کے پاس مدت دراز کے بعد اُن کے والدین کے خطوط دریافت خیریت کے لئے پہنچے حضرت کو یہ خیال گزرا کہ کہیں ان کے پڑھنے سے میری

یکسوئی خیال میں انتشار نہ پیدا ہو ، اور اُن کو بے پڑھے آگ میں جھونک دیا - ایک اور شخص کا قصہ مشہور ہے کہ اُسے راهب بننے کا شوق پیدا ہوا اور وہ ساری جائداد و املاک پر لات مار کے صرف اپنے هشت ساله بچه کو همراه لے کر خانقاہ کے دروازہ پر پہنچا - راهبوں نے اس کا خیر مقدم کیا - لیکن وہ ابھی اُسے اپنی جماعت میں کیونکر شریک کر سکتے تھے - گو وہ اپنی دولت و ثروت کو بھول چکا تھا - تاهم اولاد کی مامتا تو اس کے دل سے ابھی نہیں نکلی تھی - اس خیال کی بنا پر اُس کا بچه اُس سے لے لیا گیا - کھانے ، پہننے ، چلنے ، پھرنے غرض هر شے سے متعلق اُس پر هر طرح کی سختیاں برتی جانے لگیں اور هر طرح کی ذلتوں اور سزاؤں کا اُسے شکار بنایا جانے لگا - بیدرد اور اپنی نجات کا حریص ، باپ روز مرہ یہ تماشہ دیکھتا لیکن کبھی منه سے اُف تک نه نکالتا - یہاں تک که ایک روز پیر خانقاہ کا اُسے یہ حکم ملا که بچه کو لیجاکر دریا میں ڈال آئے - باپ کے جبین استقلال پر اب بھی شکن نه آئی وہ تعمیل ارشاد کے لئے مستعد ہوگیا - لیکن عین لب دریا چند راهبوں نے درمیان میں پڑکر اس جاں گزا امتحان سے معافی دلوادی - یہ شخص آگے چل کر بہت بڑا زاہد مشہور ہوا - بالکل اس طرح کا قصہ ایک اور اُمیدوار منصب راهبیت کا منقول ہے - ان کو بھی یہی حکم ملا تھا کہ اپنی اکلوتی اولاد کو دریا برد کر آئیں - لیکن عین موقع پر ایک خاص قاصد نے آکر بچه کی جان بچالی کبھی

کبھی ان واقعات میں خرق عادت کی آمیزش بھی ہو جاتی تھی - مثلاً ایک روایت یہ ہے کہ کسی شخص نے اپنے بچوں کو چھوڑ کر خود راہب بننا چاہا - تین سال کے بعد اسے خیال ہوا کہ ان لڑکوں کو بھی خانقاہ میں لانا چاہئے - اس خیال سے وہ مکان واپس گیا لیکن وہاں پہنچکر معلوم ہوا کہ تین میں سے دو وفات پا گئے اور صرف سب سے چھوٹا زندہ رہ گیا ہے اُسے اُس نے گود میں لیا اور خانقاہ میں لایا ' یہاں پہنچکر پیر خانقاہ نے دریافت کیا کہ کیا تمھیں اس سے محبت ہے ؟ جواب ملا کہ " ہاں " مکرر ارشاد ہوا - کہ کیا تمھیں اس سے بہت محبت ہے ؟ مکرر جواب اثبات میں ملا - اس پر ارشاد ہوا کہ فوراً اسے سامنے والے آتشکدہ میں پھینک دو - معاً تعمیل ارشاد ہوئی - لیکن باپ کی متحیر آنکھوں نے دیکھا کہ بیٹے پر آتشکدہ گلزار خلیل ہوگیا ہے —

اس طرز عمل کی سب سے زیادہ پر اثر و درد انگیز مثالیں جنس نسواں سے تعلقات کے سلسلہ میں ملتی ہیں کہ یہاں یہ خیال تھا کہ عورت کی موجودگی کہیں دفعتاً تمام محنت کو غارت نہ کردے - ہمارے بعض ناول نویسوں نے اس خیال کے چربہ اُتار نے کی کوشش کی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس عقیدہ کو تدراہبین نے جس حد تک عملاً برتا تھا - وہاں تک ہمارے ناول نویسوں کا طائر فکر نہیں پہنچ سکتا - مشتے نمونہ از خروارے ملاحظہ ہو - مشہور امام رہبانیت سیویس جب نہایت ضعیف اور اپاہج ہوگیا تو اس کی انتہائی کہر سنی پر نظر کرکے اُس کے تلامذہ و

رفقاء نے چاہا کہ وہ جنگل کو چھوڑ کر کسی بستی میں سکونت اختیار کرے - وہ اس درخواست کو قبول کرنے پر راضی ہوگیا - لیکن شرط یہ پیش کی کہ وہ بستی ایسی ہو جس میں کبھی کسی عورت سے دوبدو ہونے کا احتمال نہ ہو - ایسی بستی کا وجود ظاہر ہے کہ ناممکنات سے تھا - چنانچہ بالآخر وہ بدستور جنگل ہی میں مقیم رہا اور وہیں جان دیدی - اور ایک راہب صاحب سفر کررہے تھے اور اپنے فرقہ کی عام روش کے خلاف گویا اپنی طبیعت پر بہت جہاد کرکے اپنی والدہ کو بھی اپنے همراہ لئے ہوئے تھے - راستہ میں ایک چشمہ پڑا جس پر کوئی پل نہ تھا - حضرت نے جلدی جلدی اپنے ہاتھہ اور سارے جسم کو کپڑے میں خوب کس کر لپیٹنا شروع کیا - ماں نے متحیر ہوکر سبب پوچھا تو جواب دیا کہ تمھیں کندھے پر بٹھا کر اُس پار کرنا ہے - ڈر ہے کہ اگر کہیں میرا جسم تمھارے جسم سے مس ہوگیا تو میرا سارا کیا کرایا ایک دم میں رائیگاں جاے گا - سینٹ جان آف کی همشیر کو اُس سے بے حد اُنس تھا - جب سینٹ مذکور کو بادیہ نشینی اختیار کئے بہت زمانہ گزر گیا تو همشیر کے دل میں دیکھنے کا بہت اشتیاق پیدا ہوا - بلانے کے بہت سے خطوط لکھے مگر ادھر سے انکار ہی رہا - آخر مجبور ہوکر خود جنگل میں جاکر ملنے کا ارادہ کیا - اب سینٹ مذکور کو وحشت ہوئی اور خط میں لکھہ بھیجا کہ خود ہی آتا ہوں " چنانچہ آپ آئے ضرور مگر اس قدر تبدیل ہئیت کے ساتھہ کہ بہن نے پہچانا تک نہیں اسی حالت سے آپ واپس چلے گئے اور بدعہدی کے شکوہ کے جواب میں لکھہ بھیجا کہ " میں آیا تو تھا مگر مسیح

کے فضل و کرم سے تم نے مجھے پہچانا نہیں - اب ہرگز کبھی میرے دیدار کا قصد نہ کرنا" - سینٹ تھیوڈورس کی ماں بے اختیار ہوکر اپنے لڑکے کو دیکھنے آئی اور احتیاطاً بہت سے پادریوں کے سفارشی خطوط بھی لیتی آئی لیکن صاحبزادہ کا دل کسی طرح نہ پسیجا - اور بالآخر ماں کو اپنی بیٹی کے ساتھہ نا کام ہو کر واپس ہونا پڑا - سینٹ مارکس کی والدہ نے اس کے پیر سے اس کے ملنے کی اجازت حاصل کر لی - اب سینٹ صاحب اس مشکل میں پڑے کہ یا تو پیر طریقت کی عدول حکمی کریں اور یا ماں کا چہرہ دیکھنے کی معصیت کبیرہ کے مرتکب ہوں - مگر دیکھئے کہ ظالم نے ان اشکال کو کیونکر رفع کیا ہے - یعنی ماں کے پاس گیا ضرور مگر بھیس بدلے ہوے اور آنکھوں پر پٹی باندھے ہوے جس سے نہ اس نے ماں کو دیکھا اور نہ ماں نے اسے پہچانا بالکل اسی طرح کا واقعہ سینٹ پیور اور اس کی ہمشیر کا ہے سینٹ پیمن کی بابت یہ روایت ہے کہ اس نے مع اپنے چھہ بھائیوں کے دفعتاً ترک خاندان کر کے جنگل کی راہ لی - جس ضعیف ماں کی ساتوں اولادیں اسے اکبارگی چھوڑ دیں اس کے دل پر کیا کچھہ گزر گئی ہو گی - غریب بیتاب ہوکر خود بھی جنگل میں آئی یہاں وہ ایسے وقت پہنچی جب کہ یہ لوگ اپنے حجرہ سے نکل کر گرجا جا رہے تھے - ماں کی صورت دیکھتے ہی معاً سب دہشت زدہ ہو کر پلٹے ماں نے فوراً تعاقب کیا - لیکن کبر سنی کے پاؤں جوانی کے پاؤں کی طاقت کا مقابلہ نہ کر سکے اور قبل اس کے کہ ماں دروازہ پر پہنچے، صاحبزادوں نے اندر سے حجرہ بند کرلیا - اب حالت یہ تھی کہ ضعیف و ناچار ماں، دروازہ پر

کھڑی اپنی جگر دوز چیخوں سے سارے جنگل کو ہلا دیتی تھی۔ اس حالت میں سینٹ پیمن نے دروازہ کے قریب آکر اس آہ و شیون کا سبب پوچھا۔ ماں نے ھچکیاں لے لے کر تقریر شروع کی کہ "یہ سارا صدمہ تمہارے نہ دیکھنے کا ہے۔ کیا تم سجھے نہیں جانتے ہو کہ میں تمہاری ماں ہوں؟ کیا میں نے تمہاری رضاعت نہیں کی؟ تمھیں پال جلا کر اتنا بڑا نہیں کیا؟ کیا میرے ان احسانات کا یہی معاوضہ تھا؟ کیا میرے سارے حقوق تم نے بھلا دیئے"؟ یہ ساری تقریر بے اثر رہی۔ اہل زہد کی طرف سے زیادہ سے زیادہ یہ جواب ملا کہ تم اپنی موت کے بعد ہی ہمیں دیکھ سکو گی"۔ یہاں تک کہ دکھیاری ماں کو مجبوراً اسی سے تسلی پا کر نا کام واپس جانا پڑا اسی کے قریب سینٹ سیموین کا واقعہ ہے جس کے ترک خانماں کرنے کا باپ کو اس قدر صدمہ ہوا کہ مر گیا۔ البتہ ماں زندہ رہی لیکن جب ۲۷ سال گزر چکے اور اسے سینٹ موصوف کی قیام گاہ کا پتہ معلوم ہوا تو وہ ملاقات کے لئے خود جنگل میں آئی۔ لیکن اس کی تمام تقریریں خوشامدیں آہ و زاریاں سب بیکار گئیں اور سینٹ موصوف نے کسی طرح ملاقات کی ہامی نہیں بھری۔ آخر جب دیکھا کہ ماں کی بے قراری حد سے گزری جاتی ہے تو یہ کہلا بھیجا کہ میں عنقریب ملنے آتا ہوں۔ تین شبانہ روز اس وعدہ کے گزر گئے یہاں تک کہ اسی حجرہ کے دروازہ پر فرط یاس سے ماں نے دم توڑ دیا۔ تب مقدس راہب حجرہ سے مع اپنے تلامذہ کے باہر تشریف لائے اور ماں کی میت پر چند آنسو گرائے اور دعائے مغفرت کی اس پر ایک خوش عقیدہ سوانح نویس

کی روایت ہے کہ نعش میں حرکت ہوئی اور سینٹ موصوف نے مکرر دعاے مغفرت کی ۔ پھر سینٹ موصوف جاکر بدستور اپنے خلوت کدہ میں مصروف عبادت ہو گئے۔ اور ان کی کرامت و اتقا کا شہرہ ہر زبان پر جاری ہوگیا۔

اس میں شبہ نہیں کہ روایات بالا میں ایک بڑا حصہ اغراق و مبالغہ کا بھی ہو گا ۔ تاہم جتنی اصلیت ہے وہ بھی اس حقیقت کے علم کے لئے بالکل کافی ہے کہ ترک خانماں و قطع تعلقات خانگی کرنا اُس وقت کے مسیحیوں میں اعلی فضائل اخلاق سے سمجھا جاتا تھا ۔ یہ سچ ہے کہ کبھی کبھی قانون و شریعت کی طرف ان سختیوں کو ہلکا کرنے کی بھی کوشش ہوتی رہتی تھی مثلاً شروع شروع میں یہ اصول رکھا گیا تھا کہ جن بچوں کو بغیر اُن کی مرضی لئے ہوئے اُن کے والدین راہب بناڈالتے ہیں وہ مجاز ہیں کہ بالغ ہوکر پھر دنیوی زندگی کی طرف لوٹ آئیں یا ایک بار گرجا کی کونسل نے یہ فیصلہ صادر کیا کہ اولاد کے لئے اپنے والدین کو چھوڑ دینا خواہ وہ راہ مذہب ہی میں ہو ناجائز ہے ۔ لیکن اس طرح کی صدائیں خال خال اُٹھتی تھیں ۔ ورنہ عام حالت یہ تھی کہ قانون نے اس باب میں والدین کو اپنی اولاد پر کوئی اختیار نہیں دیا تھا ۔ اور جو اولاد انہیں چھوڑ کر تارک الدنیا ہو جاتی تھی ۔ اُس کے نام پر پبلک میں ہر طرف سے واہ واہ ہوتی تھی ۔ سینٹ کریز وستم فخریہ بیان کرتے ہیں کہ ایک لڑکے کو اُس کے باپ نے کسی فوجی عہدہ کے لئے مخصوص کر رکھا تھا ۔ لیکن میں اُسے خانقاہ سے اُڑا لایا ۔ سینٹ ایمبروز میں اس قسم کے اغوا کی قوت اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ اُسے دیکھکر مائیں اپنے بچوں کو گھر کے اندر بند کردیتی تھیں ۔ محبت شعار والدین کا اس زمانہ

میں عجیب پردرد حال تھا - سینٹ کریزوسٹم کی والدہ کی تقریر اب تک تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہے - جو کہتی ہے کہ " بیٹا اگر تیرا یہی ارادہ ہے تو اس قصد کو میری وفات کے وقت تک ملتوی رکھ" سینٹ ایمبروز کا ایک پورا مقالہ اس موضوع پر موجود ہے کہ رہبانی زندگی کی برکتیں والدین کی خوشنودی کی برکتوں سے کس قدر بڑھی ہوئی ہیں اور ان کے مقابلہ میں والدین کو ناخوش کردینا کتنا آسان ہے- پھر جو لوگ اپنی اولاد و اعزہ کو رہبانیت اختیارکرنے سے باز رکھنے کی کوشش کرتے ہیں وہ خود بقول سینٹ کریزو سٹم عذاب الیم کے مستوجب ہوں گے-بلکہ بہ قول سینٹ ایمبروز ممکن ہے کہ وہ ان پر اسی دنیا میں نازل ہوجائے - جیسا کہ ایک یتیم و یسیر لڑکی نے جب راھبہ بننا چاھا اور اس کے اعزہ نے اسے اس قصد سے روکنا چاھا اور اس درمیان میں ایک شخص نے اس سے پوچھا کہ تمھارے والدین اگرآج زندہ ہوتے تو وہ ہرگز اس کی اجازت نہ دیتے - تب تم کیا کرتیں"؟ اس لڑکی نے جواب دیا کہ اسی باعث تو خدا نے آج اُنھیں زندہ نہیں رکھا یہ کہنا تھا کہ جس شخص نے یہ گستاخانہ سوال کیا تھا وہ خود بھی مرگیا اور لوگوں کے دل میں یہ دہشت سما گئی کہ اس راہ میں رکاوٹ پیدا کرنا مشیت الہی سے لڑنا ہے - ایک مشہور خاتون کی بابت منقول ہے کہ اپنے شوہر کے انتقال پر وہ دفعتاً ترک خانماں کرکے اور اپنی اولاد کی طرف سے بالکل بے اعتنا ہوکر راھبوں کی جماعت میں جا شامل ہوئی - اپنی ساری جائداد خیرات کر ڈالی اور اولاد کے لئے بجز مالی زیر باری اور قرضہ کی پریشانیوں کے اور کوئی ترکہ نہیں چھوڑا - اس زمانہ میں یہ عقیدہ بھی عام طور سے شایع کردیا گیا کہ اعزہ و اقربا پر روپیہ صرف کرنے

میں مطلق ثواب نہیں بلکہ جو کچھہ ثواب ہے وہ فقراء پر خیرات کرنے میں ہے - چنانچہ بہت سے اہل ثروت حصول ثواب کے لئے اسی عقیدہ پر عامل بھی تھے - البتہ ایک سینٹ گشا مین و آریلیس کی استثنائی مثالیں ایسی ملتی تھیں جو اعزہ کی حق تلفی کر کے خیرات کا روپیہ لینا حرام جانتے تھے - انھیں بالکل مستثنیات میں سمجھنا چاھئے - کیونکہ عام عقیدہ کا ترجمان تو یہ اصول تھا کہ جو شخص اپنی ماں کی دلشکنی برداشت کر سکتا ہے وھی بڑی سی بڑی ریاضتیں بھی جھیل سکتا ہے - سینٹ جروم ایک شخص کو راھبانہ زندگی کی ترغیب دیتے ھیں اور اس ضمن میں ترک تعلقات خانگی کے باب میں کیسی داد بلاغت دیتے ھیں —

" تمھارا ننھا بھتیجا تمھارے گلے میں با ھیں ڈال دے گا تمھاری ماں آنسوؤں کا تار باندہ دیگی اپنے احسانات کو یاد دلائے گی اپنے کپڑے اور بال نوچ نوچ کر اپنے حقوق پر توجہ دلائے گی ؟ تمھارا باپ اپنے تئیں تمھارے قدموں پر گرادے گا - لیکن تمھیں چاھئے کہ اس کے جسم کو پامال ھوجانے دو اور ان میں سے کسی شے کی پروا نہ کرو - تمھاری بیوہ ھمشیر تمھارے گرد پروا نہ ھو جاے گی - تمھارے والد یہ کہیں گے کہ " میری موت کے وقت تک اپنا ارادہ ملتوی رکھو" - اعزہ یہ سمجھائیں گے کہ خاندان کا شیرازہ صرف تمھاری ذات سے قائم ہے - لیکن تمھیں ان میں سے کسی شے کی پروا نہ ھونی چاھئے - تمھارے کان میں مسیح کی صدا آرھی ہے - اس کے مقابلہ میں تمھیں کسی اور آواز سے متاثر نہ ھونا

چاهئے - مسیح کی محبت اور جہنم کے خوف کے سامنے
ساری محبتیں اور رشتہ داریاں ہیچ ہیں'' —

یہ حالات و قصص تو قدما کے تھے - لیکن متاخرین میں بھی یہ کیفیت بدستور قایم رہی ۔ چنانچہ سینٹ گری گوری روایت کرتے ہیں کہ ''ایک شخص اپنی صغر سنی سے راہب بن گیا تھا مگر والدین کی محبت ہنوز اس کے دل سے نہیں نکلی تھی آخر ایک روز خفیہ طور پر وہ ان کی ملاقات کے لئے چلا گیا اس جرم پر غضب الہی یوں نازل ہوا کہ جوں ہی لوٹ کر آیا مرگیا - اور جب نعش دفن کی جانے لگی تو زمین نے قبول کرنے سے انکار کردیا یہاں تک کہ متعدد ناکام کوششوں کے بعد جب سینٹ سینٹ بکیٹ نے اس کے سینہ پر تبرکات رکھے ہیں تب تدفین ہوسکی - اسی طرح کی اور روایات بھی اسی زمانہ سے متعلق مشہور ہیں - اب حالت یہ ہوگئی تھی - پہلے جو اثر و اقتدار بزرگ خاندان یا والد کو حاصل ہوتا تھا وہ اب پادریوں اور راہبوں کی طرف منتقل ہوگیا تھا —

رہبانیت کی تاریخی سرگزشت بیان ہوچکی - اب اس پر کوئی میری رائے پوچھے تو میں مختصراً یہ کہہ سکتا ہوں کہ علایق دنیوی سے آزادی حاصل کرنا اگرچہ بہت بڑی ہمت و جوانمردی کا کام ہے - تاہم جس ترک تعلقات کی بنا محض خود غرضی پر ہو وہ کبھی محمود نہیں کہی جاسکتی قدماء یونان و روم اگر ایثار و مجاہدہ سے کام لیتے تھے تو ملک و قوم سلطنت و جماعت کی بہبود کے لئے - لیکن ہماری مسیحی رہبانیت کا مقصد محض اپنی نجات اُخروی کا حصول تھا جو خود غرضی ہی کی ایک شکل ہے - دنیوی نہ سہی دینی سہی ایسا شخص جو آخرت میں اپنے نفع و آرام کی خاطر ماں باپ، دوست آشنا، بھائی بہن، اور اولاد کے حقوق کو یکسر

ملاف کردے اور فرایض کو بالکل پس پشت ڈال دے - اگر وہ خود غرض نہیں تو دنیا میں اور کسے خود غرض کہہ سکتے ہیں؟ —

پانچواں نتیجہ رہبانیت و ترک تعلقات کا تعصب و عدم مسالمت مذہبی کی شکل میں ظاہر ہوا - بے تعصبی و رواداری کی بنیاد وسیع ہمدردیوں پر ہے - جس شخص کی ہمدردیاں جتنی زیادہ وسیع ہوں گی وہ اسی قدر وسیع المشرب و بے تعصب ہوگا - لیکن ہمدردیوں اور جذبات لطایف کا گہوارہ خانگی زندگی ہے جس کا بیج ہی راہبانہ طرز معاشرت نے مار دیا تھا - جہالت، تعصب، بیدردی، وہم پرستی کا اجتماع رواداری کے لئے کہاں گنجائش باقی رکھہ سکتا تھا ہر راہب اپنے اپنے گرجا کے معتقدات پر شدت سے کاربند اور اُن سے کسی جزئی اختلاف کی بھی تاب لانے کے ناقابل تھا - اُس کے ذہن میں اس کا امکان بھی نہیں گزرتا تھا کہ مخالف کی رائے میں واقعیت کا جز و شامل ہے - اور پھر جب خود مسیحی فرقوں میں باہمی تعصب و عدم رواداری کا یہ حال تھا تو اُس وحشیانہ تعصب کا کیا پوچھنا جو انہیں مسیحیوں سے تھا - مشرکوں کے بڑے بڑے معابد، ان کی عظیم الشان یادگاریں اور شاندار قربان گاہیں دم کے دم میں مسمار کردی جاتیں اور ان کے گرانے میں ایسے لوگوں کو کیا درد ہوسکتا تھا جن کے دل کبھی اپنے والد کی آہ و فریاد پر بھی نہیں پسیجے تھے - کبھی کبھی ملکی قوانین ان سختیوں کو ہلکا کردیتے تھے - لیکن نا ئبان انہیں کبھی جائز نہیں رکھہ سکتے تھے - بلکہ حکومت کی کمزوریوں پر نہایت سختی سے احتساب کرتے تھے —

چھٹا نتیجہ یعنی فضائل سیاسی و وطنی کا انحطاط اپنی غایت اہمیت سے ایک مستقل فصل کا محتاج ہے —

فصل (۷)

جذبات وطنیت کا انحطاط

سب سے آخری مگر سب سے اہم نتیجہ رہبانیت کا یہ نکلا کہ وطنیت و قومیت کے جذبات کا خاتمہ ہوگیا بہ نظرانصاف دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ مسیحی تمدن جس قدر فضائل عصمت و عفت اور انسانیت کے لحاظ سے بلند ہوا ہے ۔ اُسی قدر کمالات علمی و جذبات قومیت کے لحاظ سے پست رہا ہے ۔ ہمیں یہ کسی گزشتہ باب میں معلوم ہوچکا ہے کہ ظہور مسیحیت سے ذرا پہلے جو علمی تحریک شائع ہو رہی تھی وہ بجائے خود جذبہ وطنیت کو پامال کرنے والی تھی۔ اور اُس کی بنا پر جو شے روم و یونان کی فہرست فضائل اخلاق میں راس الفضائل کا مرتبہ رکھتی تھی وہ فنا ہوچکی تھی ۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہوچکا ہے کہ اس انقلاب حالت کے خاص اسباب یہ دو تھے ۔ ایک یہ کہ سلطنت رومہ کے حدود کے اندر مختلف قوموں ' نسلوں ' اور مذہبوں کے لوگ اس شدت سے آپس میں خلط ملط ہوگئے تھے کہ کسی ایک خاص ملک یا قوم کے جذبہ کو مخاطب بنانا قطعاً ناممکن ہوگیا تھا ۔ دوسرے یہ کہ اب سلطنت رومہ میں مشرقی فلسفوں کا عروج شروع ہوا اور ان انظامات فلسفہ میں رواقیت کے بالکل برخلاف وطن پرستی یا قوم پرستی کا کوئی درجہ نہ تھا ۔

غرض ظہور مسیحیت کے وقت جذبۂ وطنیت خود ہی ایک بڑی حد تک فنا ہوچکا تھا اور سچ یہ ہے کہ اسی سنگ راہ کے دور ہوجانے سے خود مسیحیت کی اشاعت بے روک ٹوک آسانی سے ہوسکی ۔ کیونکہ ایک بالکل قطعی تاریخی حقیقت ہے کہ جو مذہب خصایص قومی کے معارض ہوتے ہیں وہ کبھی چلنے نہیں پاتے —

لیکن اس جذبہ کے جو کچھہ باقیات الصالحات رہ گئے تھے، مسیحیت نے ان کا بھی استیصال کر دیا ۔ مسیحیوں کے اعتقاد کے مطابق روحہ کی عظمت دجال کی عظمت تھی جس کا مٹنا دور ربانی کا لازمی مقدمہ تھا ۔ چنانچہ وہ اپنا ایک پورا جتھا قایم کرکے زوال حکومت کے منتظر و ساعی رہنے لگے اور ایسے تمام مناظر، ملاعب و مشاغل سے بالکلیہ احتراز کرنے لگے جن سے جذبۂ قومیت کو تقویت پہنچنے کی توقع ہوسکتی تھی ۔ بے شبہ انھوں نے کبھی حکومت سے براہ راست بغاوت نہیں کی تاہم وہ ہمیشہ رعایا کو حکومت کی جانب سے برگشتہ یا کم از کم بے تعلق بناتے رہے اور اسے علانیہ فخر کے ساتھہ کہتے رہے کہ ملک و قوم وغیرہ کی دنیوی ترقیوں سے انھیں کوئی واسطہ نہیں، کیونکہ حقیقی ترقی روحانی ترقی کا نام ہے ۔ پھر سپہ گری کے پیشہ اور فوج کشی کو کبھی انھوں نے پسندیدگی کی نظروں سے نہ دیکھا ۔ بلکہ ان کے جواز میں بھی انھیں تامل رہا ۔ یہ نکتۂ خیال عام مسیحیوں کا شروع ہی سے رہا تھا ۔ اس پر راہبوں کے تعلقات ترک دنیا صحرا نشینی و خلوت گزینی نے اور چار چاند لگا دئے اور یہ بالآخر زوال حکومت کا ایک سبب قوی ثابت ہوا —

مذہب و اخلاق کے تعلقات باہمی کے باب میں لوگوں کو عجیب غلط فہمی ہے۔ مذہب اخلاق پر موثر ضرور ہوتا ہے۔ مگر کس طرح؟ اس طرح کہ اخلاق کے چشمہ کو وہ اپنے قائم کردہ راستہ پر تیزی سے بہانے لگتا ہے۔ اخلاقی قوت قوم میں پیشتر سے موجود ہونا چاہئیے۔ مذہب اسے پیدا نہیں کرسکتا البتہ وہ اس کا رخ متعین کر دیتا ہے اور اس کا ایک مخصوص راستہ قایم کردیتا ہے اس حقیقت کی توضیح رومی انقلاب معیار اخلاق سے خوب ہوتی ہے شروع شروع میں اگر کسی شخص کی بابت یہ کہا جاتا کہ وہ بڑا صاحب اخلاق ہے۔ تو روما میں ہر شخص یہ معنی لیتا کہ وہ بہت بڑا محب وطن ہے اور جتنی اس میں وطنیت زیادہ ہے اسی نسبت سے وہ فضائل اخلاق سے زیادہ آراستہ ہے۔ لیکن مسیحی رہبانیت نے آکر چونکہ اخلاق کا رخ دوسری طرف پھیر دیا اس لئے وطن پرستانہ جذبات لا محالہ مردہ ہو گئے۔ اب راہبانہ شغل و ذکر اور زاہدانہ تعبد و استہلاک کے پہلو بہ پہلو یہ صورت واقعات تھی کہ جمہوری زندگی کا خاتمہ ہوچکا تھا۔ حکومت کے ہر شعبہ میں نا انصافی، رشوت خواری و دغا بازی کا بازار گرم تھا۔ فوج پر نامردی و بزدلی چھائی ہوئی تھی اور عام اہل ملک کے تعیش کی یہ نوبت پہنچ گئی تھی کہ اغیار کے مقابلہ میں شکست کھاتے تھے مگر عین شکست کے دن سارے وقت کو تھیٹر، سرکس وغیرہ مختلف ملاعب کی زندہ دلی میں صرف کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ اور جو قوت ملک کے تحفظ میں کام آتی اب اس کا مصرف فقیہانہ موشگافیاں رہ گئی تھیں۔ یہاں تک کہ عین اُس

وقت جب کہ الارک شہر کا محاصرہ کئے ہوئے پڑا تھا ، اُدھر مسیحیت بکمال انہماک مسائل فقہ و الٰہیات کی گُتھیاں سلجھانے میں مصروف تھے - اس وقت ہزارہا جوان جو ملک کی حفاظت کے لئے میدان جنگ میں آکر داد شجاعت دیتے ، اپنے وطن سے کوسوں دور جنگل و بیابان میں پڑے ہوئے ریاضتوں میں مشغول تھے - روم کو فتح ہونا تھا وہ فتح ہوا اور انقلاب حکومت کا جو خمیازہ اُٹھانا پڑتا ہے وہ اہل شہر کو اٹھانا پڑا - لیکن سینٹ اگستائن اسی پر فخر کرتے رہے کہ کلیسا پر کوئی آنچ نہیں آنے پائی - بلکہ بعض جگہ تو اس سے بھی بڑھکر مظلوم مسیحیوں نے یہ ستم کیا کہ فاتحین کا بڑھکر خیر مقدم کیا (مثلاً افریقہ میں) درہ تھرما پولی کا سا ناقابل تسخیر درہ بھی غالباً انہیں کی سازش سے مسخر ہو گیا اور آگے چل کر مسلمانوں کو مصر پر جو فتح نصیب ہوئی اس کا بھی ایک بڑا عنصر یہی مسیحی سازش تھی ۔ غرض اس طرح کے متعدد واقعات سے یہ حقیقت بالکل آشکار ہو جاتی ہے کہ کسی شخص کے لئے اپنے وطن سے غداری کرنا اب قطعاً کوئی اخلاقی جرم نہیں رہا تھا بلکہ ایک بڑے سے بڑا مذہبی اور پابند اخلاق شخص بآسانی وطن و ملک کے ساتھہ غداری کر سکتا تھا - اور اخلاقی تخیل میں یہ انقلاب صاف مسیحیت کا اثر تھا —

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے اور اس سوال کا جواب دینا آسان نہیں کہ مسیحیوں کا یہ طرز عمل دنیا کے حق میں کہاں تک مفید پڑا ؟ لیکن اس قدر بہر حال کہا جا سکتا ہے کہ سلطنت میں گھن لگ گیا تھا انحطاط کے علامات پورے پیدا ہوگئے تھے اور اس کا زوال قطعی

تھا جو کسی کے روکے نہیں رک سکتا تھا - پھر مسیحیت نے ایسے وقت میں جو کچھہ بھی کیا اس سے اخلاق کو یقیناً ترقی ہوئی - ایسے وقت میں مسیحی پادریوں نے نہ صرف اپنے ذاتی خیر و خیرات اور فیاضیوں سے خلق اللہ کو نفع پہنچایا - بلکہ اپنی بے طرفی و بے تعلقی کی بنا پر فاتحین کی نظروں میں ایسا اثر و اقتدار پیدا کرلیا جس سے آگے چل کر انھوں نے غربا پروری ' داد رسی وغیرہ میں بہت مفید کام لیا اور جو ان کے روسی وطن پرست ہونے کی صورت میں ناممکن تھا - غرض گو ان کے طرز عمل کے ان فواید کو ہرگز نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تاہم اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ اس دنیا کے تخیل اخلاق میں ایک انقلاب پیدا کر دیا - یعنی فضایل اخلاق کی فہرست میں وطنیت کا جو درجہ شروع سے سب کو مسلم تھا وہ اب بالکل بدل گیا یہ سچ ہے کہ آگے چل کر کبھی کبھی کلیسا کے حدود کے اندر جذبات مذہبیت و وطنیت میں اتحاد ہو گیا - لیکن وطنیت کو بطور ایک فرض کے ' بطور ایک فضیلت اخلاقی کے کبھی مسیحی اخلاق میں کوئی درجہ نہیں نصیب ہوا - بلکہ فقیہانہ رائے ہمیشہ اس جذبہ کو دباتی ہی رہی ہے - یا پھر اثھہ کلیسا نے جب کبھی سیاسی معاملات میں دخل دیا ہے تو ہمیشہ اُن کا مقصد یہ رہا ہے کہ سیاسیات کو مذہب کی ماتحتی میں لائیں - بلکہ ہم تو یہاں تک کہہ سکتے ہیں کہ اثمہ کلیسا کی برابر کبھی کسی جماعت نے اپنے جماعتی اغراض پر ملک و وطن کے فوائد کو قربان نہیں کیا ہے مسیحیت و وطنیت کے اس تنافر کے اسباب خاص میرے نزدیک یہ تین تھے - اولاً یہ کہ مذہبیت میں غلو و انہماک بجائے خود دنیوی منافع کی طرف سے انسان

کی طبیعت ہٹا دیتا ہے - کیونکہ جو شخص نفع اُخروی
کی تحصیل میں مصروف رہتا ہے اُسے اس مادی و عارضی
منافع کی کیا پروا ہو سکتی ہے - دوسرے یہ کہ ہر
مذہب اپنا ایک خاص کلیسا قایم کرتا ہے یعنی جماعت
کو ایک خاص منتظم و مرتب شکل میں رکھتا ہے - جس
کا ایک مخصوص نظام ترکیبی ہوتا ہے - ایک مخصوص
ضابط عمل و طریق کار ہوتا ہے - کچھہ مخصوص مقاصد
و اغراض ہوتے ہیں جن کی بناء پر اکثر اس میں اور
ملکی اغراض و مصالح میں تصادم واقع ہو جاتا ہے اور
اس لئے حاملین شریعت کی جو قوت دنیوی انتظامات
ملکی و سیاسی میں صرف ہوتی وہ ان مذہبی کار فرمایوں
کی طرف منتشر ہو جاتی ہے - تیسرے یہ کہ شہداء
وطنیت و شہداء مذہب جو اپنے اپنے پیرووں کے حق میں
نصب العین کا کام دیتے ہیں - وہ بلحاظ اپنے خصائص کے
باہم بالکل مختلف ہوتے ہیں - یہ تینوں سبب ہر مذہب
کو وطنیت سے مغائر رکھتے ہیں - مگر مسیحیت کے حق
میں اس کی شدید رہبانیت کی بنا پر اور زیادہ
قوی ثابت ہوئے —

اس اہم بحث کے خاتمہ سے قبل دو باتوں کا لحاظ
رکھنا ضروری ہے : —

(۱) اول یہ کہ موجودہ زمانہ کا تخیل عملی و سیاسی زندگی
کے باب میں قدماء کے تخیل سے بالکل مختلف ہو گیا
ہے - قدماء میں رواقیئن اخلاق کو اگرچہ نوعی حیثیت
سے دنیا کی تمام چیزوں سے مختلف جانتے تھے - تاہم
سیاسی زندگی میں حصہ لینا فرض قرار دیتے تھے -
بخلاف ان کے لذتئین جو حسن اخلاق کو افادہ کے

مرادف قرار دیتے تھے سیاسی زندگی سے محترز رہتے تھے مسیحی رہبانیت نے اگرچہ اس باب میں رواقیئت کی تائید کی کہ اخلاق و مسرت دو بالکل متبائن چیزیں ہیں، تاہم اس نے سیاسی زندگی سے اپنے پیرووں کو ہمیشہ علحدہ رکھا - بخلاف اس کے ہمارا موجودہ تجارتی و کارو باری تمدن جو استیصال غلامی کے بعد سے پیدا ہوا ہے برابر سیاسی زندگی کے نشو و نما میں ایک عنصر قوی کام دیتا رہا ہے - میرے نزدیک تاریخ اخلاق میں یہ انقلاب تخیل خاص اہمیت رکھتا ہے - جس پر مؤرخین نے کافی توجہ نہیں کی ہے —

(۲) دوسرے یہ کہ اب تک مورخین نے اخلاقی زندگی کے صرف ان مؤثرات کا استقصا کیا ہے جن کا اثر جماعات پر خاص طور سے نمایاں رہا ہے - مثلاً مذہب یا فلسفہ - لیکن ان موثرات کو تقریباً یکسر نظر انداز کر دیا ہے جو افراد کی خانگی اور روز مرہ کی معاشرتی زندگی پر اندرونی اثر ڈالتے رہتے ہیں - حالانکہ میرے نزدیک زیادہ گہرا اثر انہیں آخر الذکر جزئی اور بظاہر حقیر موثرات کا ہوتا رہا ہے - مورخین کی اس بے اعتنائی کے کم و بیش جملہ مذاہب شکار ہوے ہیں - لیکن مسیحیت خصوصیت کے ساتھہ اس کا ہدف رہی ہے —

فصل (۸)

بازنطینی حکومت کی عام اخلاقی حالت

دور مسیحیت میں رومی و بازنطینی حکومت کی

عام اخلاقی حالت کا اندازہ کرنے میں آج ہمیں اس کا خصوصیت سے لحاظ رکھنا چاہئیے کہ ہمارے پیش نظر جو مآخذ ہیں - اُن میں اُس وقت کے اخلاقی معائب و نقائص کے درج کرنے میں کس سختی سے کام لیا گیا ہے - ہمارے ان ماخذ کے جو مصنفین ہیں وہ خود رہبانیت کے رنگ سے اس قدر متاثر تھے کہ ہر خفیف سی خفیف لغزش میں وہ نہایت ہولناک رنگ بھر کر اسے بیان کرتے ہیں - مثلاً ان واقعات کو کہ کچھ عرصہ کے بعد عام مسیحیوں نے ویسا ہی پر تکلف لباس پہننا شروع کردیا تھا - جیسا ان کے گرد و پیش میں رائج تھا یا یہ کہ جو مسیحی اب تک قدیم سادگی پر قایم تھے ان پر یہ لوگ مضحکہ کرتے تھے - یا پھر یہ کہ جو لوگ پہلے براے نام مشرک تھے وہ اب براے نام مسیحی ہو گئے - ان واقعات کو آج ہر شخص معمولی وغیراہم سمجھے گا - لیکن قدیم مورخین کے نزدیک انھیں کو بڑی اہمیت حاصل تھی اور گویا یہ بہت بڑے اخلاقی جرایم تھے - یا پھر قدیم مورخین کی خواہ وہ مسیحی ہوں یا مشرکین ایک عام عادت یہ ہے کہ وہ معاشرتی زندگی کے کسی ایک چھوٹے سے چھوٹے واقعہ کو لے کر اُس کی مذمت و منقصت پر اپنا سارا زور بیان صرف کر دیتے ہیں - یہاں تک کہ ہمیں ان کے زور بیاں کے اس اسراف پر حیرت ہونے لگتی ہے - اس قبیل کی چند مثالیں ہم ذیل میں درج کرتے ہیں —

جونیل صفحات کے صفحات ایک امیر کے اوپر اظہار غیظ و غضب کی نذر کر دیتے ہیں - اس جرم عظیم پر کہ وہ جس روز کانسل مقرر ہوا ہے اُسی کی شام کو اُس نے اپنے ہاتھہ سے شارع عام پر اپنی گاڑی ہانکی ! ستیکا

اس اخلاق شکنی پر آپے سے باہر ہوا جاتا ہے کہ بعض اُمراء مشروبات کو برف میں ٹھنڈا کر کے پیتے ہیں! پلینی صاحب بکمال سنجیدگی فرماتے ہیں کہ دنیا میں سب سے بڑا مجرم سب سے بڑا خاطی ' اور سب سے بڑا بداخلاق وہ شخص ہوا ہے جس نے پہلے پہل طلائی انگشتری کا استعمال کیا! آپریس نے ایک بار کہیں یہ کہہ دیا تھا کہ دانتوں کو منجن سے صاف رکھنا چاہئیے اس پر اُس کی وہ لے دے ہوئی کہ الاماں بالآخر غریب کو یہ کہہ کر اپنی بریت کرنا پڑی کہ گھڑیال بھی دریائے نیل سے کبھی کبھی باہر آکر اپنے دانت کھول کر لیٹ جاتا ہے اور کوئی پرندہ آآکر اُس کے دانتوں کو صاف کر جاتا ہے! کلیمنٹ آف الگزنڈریا کا ارشاد تھا کہ مصنوعی بال لگانے والے یا بال دار ٹوپی دینے والے کے بعض مراسم گرجا میں آکر ناقص رہ جاتے ہیں - کیونکہ جس وقت پادری اُس کے سر پر ہاتھ رکھتا ہے وہ دراصل اُس کے سر کو نہیں بلکہ مصنوعی بالوں کو مس کرتا ہے! ترتولین کا قول تھا کہ جو لوگ خضاب کا استعمال کرتے ہیں وہ صریح اس حکم ربانی کی تکذیب کرتے ہیں کہ " انسان ایک بال کو بھی سفید یا سیاہ نہیں کر سکتا " اور جو لوگ مصنوعی بال لگاتے ہیں اُن کے حشر کا خیال کر کے تو وہ لرز اُٹھتا تھا! یہ خیال اس قدر دیرپا ثابت ہوا کہ بہت آخر زمانہ تک قایم رہا - صدیاں گزر گئیں روسی سلطنت کا نشان بھی باقی نہیں رہا - ملک میں معاصی و رذایل کے صدہا سیلاب آ اور جا چکے - لیکن جو صور کلیمنٹ آف الگزنڈریا پھونک گیا تھا - اُس کی صدائے باز گشت ' سینٹ ایمبروز ' سینٹ جروم و سینٹ گریگوری نیز بانی

کے صفحات سے برا بر آتی رهی —

لیکن ان بیانات سے همارا یہ مقصود نہیں کہ هم اُس زمانہ کی اخلاقی زندگی کو بے عیب یا موجودہ حالت سے بہتر سمجھتے هیں - ان کے تذکرہ سے همیں ناظرین کو محض محتاط و خبردار کر دینا منظور تھا - کیونکہ واقعہ یہ ہے کہ پادری مصنفین کے روایات کو کافی مبالغہ آمیز مان لینے کے بعد بھی اس زمانہ کا اخلاقی انحطاط بالکل ثابت شدہ رهتا ہے - رومی معاشرت کی جو تصویر ایمینیس مارکیلینس نے کھینچی هے مارسیلز کی زندگی کی جو تصویر سیلوین نے کھینچی هے اور ایشائے کوچک و قسطنطنیہ کے حالات کا جو نقشہ کریز وستم نے کھینچا هے اور جن کی تائید متعدد مورخین اور صدها دیگر مصنفین کے ضمنی بیانات سے هوتی هے اُن سے یہ حقیقت بالکل مسلم هو جاتی هے کہ اخلاقی انحطاط جیسا اُس وقت میں تھا اس سے زیادہ شاید هی کسی زمانہ میں رها هو - اور یہ اُمرا یا اوباشوں کے طبقہ تک محدود نہ تھا بلکہ ارباب تقدس کا دامن اس میں خصوصیت کے ساتھ آلودہ نظر آتا تھا - مذهبی ضیافتیں جن کا مقصد مسیحیوں میں باهم اخوت پیدا کرنا تھا - اب بادہ نوشی و بدچلنی کی تماشہ گاہ رہ گئیں تھیں اور کن مشکلوں سے جاکر ساتویں صدی میں بند هوئیں - شہدا ' کی برسیوں یا سالانا فاتحوں کا بھی یہی حشر هوا - اُن کی یاد و تذکرہ کے بجائے وهاں میلے لگنے لگے اور شہوت رانی و بد چلنی کو گویا ایک مرکز هاتھ آگیا - یہاں تک کہ بالآخر اسی علت میں انھیں بند کر دینا پڑا - ازدواج

کے بارہ میں پادری تو شروع ھی سے اس کی مخالف رائے پر عمل کرتے تھے - یعنی مجرد رہا کرتے تھے - لیکن اس تجرد کے پردہ میں ناجائز تعلقات کا وجود بھی سینٹ سایپپرین ھی کے زمانہ سے تھا جو قسطنطین کے بعد سے بہت ترقی پکڑ گیا اور پادریوں پر بد چلنی کا الزام علانیہ لگایا جانے لگا - اکثر یہ ہوتا کہ بن بیاھیاں اور پادری تنہا ایک مکان میں رہتے - بلکہ ساتھ نہاتے ' بلکہ ایک ھی بستر پر ساتھ سوتے اور یہ دعویٰ کرتے رہتے کہ ھم نے اس قدر ضبط نفس حاصل کرلیا ھے کہ باوجود اس قدر اختلاط کے کبھی جذبہ جنسی کو تحریک نہیں ہوتی - امیر بیواؤں کے گرد پادریوں کا ایک ھجوم رہا کرتا جو ھر وقت اُن کی خوشامد میں مشغول رہتے تا کہ انھیں خوش کرکے اُن کے ترکہ پر قبضہ کریں یا نذر کے نام سے کچھہ حاصل کریں - یہ مرض اس قدر متعدی ھوا کہ بالآخر ویلنٹینیس کو قانوناً اس کی ممانعت کرنا پڑی کہ کوئی پادری کسی غیر کی جائداد کا وارث نہ بن سکے اور سینٹ جروم افسوس کے ساتھہ اعتراف کرتا ھے کہ اس قانون کی سخت ضرورت تھی - بہت سے لوگ اس لئے گرجا کے خدام بننے لگے کہ ملکی ذمہ داریوں سے بچنا چاھتے تھے اور بہت سے افراد راھبوں کے حلقہ میں ایسے شامل تھے جو محض اس لئے کہ ھاتھہ پیر ھلا کر روٹی کھانا نہ پڑے - خانقاہ میں جاکر راھب بن گئے تھے - صدھا سپاھی جنگی خدمت سے جی چُرا چُرا کر اسی طرح راھبوں میں شامل ھوگئے تھے - اونچے طبقہ کی عورتوں کو کسی نیچے طبقہ کے شخص سے آشنائی پیدا کرنے کا سب سے آسان ذریعہ یہ معلوم تھا کہ خانقاہ

نشین ہو جاتیں - فلسطین جو زایرین کا مرجع عام تھا۔ سینٹ گریگوری کے زمانہ میں شہوت رانی کا چکلہ ہوکر رہ گیا تھا اور یہ حالت چند روزہ نہ تھی، بلکہ صدیوں تک قائم رہی - چنانچہ آٹھویں صدی میں سینٹ بونیفیس اپنے ایک خط میں آرچ بشپ آف کنٹربری کو تحریر کرتا ہے کہ " خدا کے واسطے اپنے وطن کی عورتوں کو شوق زیارت سے روکئے - " کیونکہ لندن سے لے کر روم تک یورپ کا کوئی بڑا شہر ایسا نہ تھا جس میں انگریزی خواتین علانیہ طوائفوں کا پیشہ اختیار کئے نہ ہوں - اس زمانہ کے پادریوں کے کھانے پینے اور طرز معاشرت کو دیکھئے تو (بقول سینٹ جروم) معلوم ہوگا کہ بڑے بڑے اُمراء دولت ان کے آگے ماند ہیں اور حکومت و اقتدار حاصل کرنے کے لئے تو وہ اور ان کے پیرو جو جو جوڑ توڑ کرتے تھے ان کی شہادت گرجا کی تاریخ کے ہر صفحہ پر ثبت ہے —

یہ حال تو مذہبی دنیا کا تھا - دنیاداروں کی عام دنیا کی اس وقت سب سے زیادہ نمایاں خصوصیت طفل مزاجی تھی - اخلاقی قوت یوں خواہ اس وقت مشرکوں کے زمانہ سے زاید ہو مگر جو کچھہ تھی سب صحرا کی طرف منتقل ہوگئی تھی اور اس لئے دنیا پر اُس کا کوئی خاص اثر نہیں باقی رہا تھا - اس زمانہ میں لوگوں میں جو طفلانہ خرابی پھیل گئی تھی، اُس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ مذہبی، سیاسی، علمی مناقشے سب دب گئے تھے - اور ان کی جگہ جس چیز پر روز بلوہ و فساد، بلکہ کشت و خون اور

بغاوت تک کی نوبت پہنچ جاتی تھی - وہ یہ تھی کہ گاڑیوں کی دوڑ میں کس فریق کی فتح ہوگی اور کس کی شکست ؟ جرأت و دلیری اور وطن پرستی کا نام و نشان بھی نہیں رہ گیا تھا اور خلقت میں رکاکت و پستی حد درجہ سرایت کر گئی تھی - دربار کی عیش پرستیاں ارکان دربار کی غلام طینتی اور ملبوسات و زیورات کی تزئین و آرایش اپنے شباب پر تھیں - دنیا اس وقت انتہائی رہبانیت اور انتہائی بدکاری کے تھپیڑوں کے درمیان جھونکے کھا رہی تھی بلکہ بعض شہر جن میں سب سے زیادہ کثیر التعداد زہاد و راہبین پیدا ہوئے تھے' وہ وہی تھے جن میں عیش پرستی و بدچلنی کی سب سے زیادہ گرم بازاری تھی - غرض بدکاری اور توہم پرستی کا ایسا اجتماع ہوگیا تھا جو انسان کی شرافت و عظمت کا قطعی دشمن ہے - راے جمہور اس قدر ضعیف ہوگئی تھی کہ لوگوں کو بدنامی و رسوائی کا مطلق خوف نہیں باقی رہا تھا البتہ ضمیر کو مذہب کا دھڑکا ہوسکتا تھا - لیکن اسے بھی اس اعتقاد نے مٹا دیا تھا کہ دعاؤں وغیرہ کے ذریعہ سے سارے گناہ معاف ہوسکتے ہیں - مکاری' دغا بازی' دروغ گوئی کی وہ گرم بازاری تھی جو قیاصرہ کے زمانہ میں بھی نہ تھی - البتہ ظلم' تشدد' شقاوت' و بے حیائی اتنی نہ تھی - لیکن اس کے ساتھ حریت فکری' آزاد خیالی و جوش قومیت میں بھی کمی تھی —

لیکن ان معایب و نقایص کے ذکر کے ساتھ "عیب مے جملہ بہ گفتی ہنرش نیز بگو" کے سررشتہ اصول کو ہاتھ سے نہ جانے دینا چاھئیے - اور اس دور میں جو کچھ محاسن تھے ان کا بھی پورا اعتراف کرنا چاھئیے - رذائل بالا کے پہلو بہ پہلو اس میں

کچھہ شبہ نہیں کہ بہت سے فضایل بھی موجود تھے اور یہ سب مسیحیت کے پیدا کردہ تھے - مناظر سیافی مغرب کی حکومت (یعنی رومہ) سے بالکل رخصت ہوگئے تھے ارر مشرقی حکومت (یعنی قسطنطنیہ) میں تو ان کا قدم ہی آنے نہ پایا - طوائفوں کے بڑے بڑے چکلے جو زھرہ کے مندروں میں قایم تھے یکسر بند کردیے گئے تھے اور مذھب بجاے خود بدچلنی و شہوت پرستی کا محرک نہیں باقی رھنے پایا تھا - قدیم فحش تصویریں ارر نقاشیاں جن کے آثار اب تک موجود ھیں، امراء کی ضیافتوں کا یہ دستور کہ خواصیں برھنہ ھوکر کھانا کھلاتی تھیں - جرایم خلاف وضع فطرت جن کا رومی فرماں روا تک علانیہ ارتکاب کرتے تھے - یہ سب چیزیں ایک ایک کرکے رخصت ھوگئیں تھیں - شہوت پرستی اب بھی زوروں پر تھی تاھم اس کا اعلان اور اس کے غیر فطری طریقے مسدود ھوگئے تھے - گرجا کی ایک پر قوت جماعت ھونے کا یہ اثر تھا کہ لوگوں پر اخلاق کی ایک ھیبت طاری ھوگئی تھی - نیکی کی انھیں ترغیب ھوتی تھی اور بدی کی طرف سے ایک جھجک قایم تھی - لوگ گناہ کرتے تھے مگر ساتھہ ھی یہ بھی دھشت دلوں پر طاری رھتی تھی کہ عاقبت میں اس کی سزا بھگتنی ھوگی - صحت و خوشحالی میں ممکن ھے کہ خدا کو بھولے رھتے ھوں لیکن بیماری و مصیبت کے وقت فوراً خدا یاد آجاتا تھا - یا جب کسی معصیت کا ارتکاب کرنے لگتے - تو ضمیر کی ملامت شروع ھوجاتی اور ضمیر کی ملامت بھی نہ سہی تو کم از کم دنیا کے سامنے اپنی رسوائی و ذلت کا خوف بہر حال لگا رھتا تھا - غرض وہ بے خوفی، ڈھٹائی اور بے شرمی - جو پیشتر گنہگاروں میں تھی مسیحیت کے اثر سے جاتی رھی تھی

اور ہمیں یہ کہنے میں مطلق تامل نہ ہونا چاہئے کہ گو مشرکوں کے بڑے سے بڑے متقی و پاک باز مسیحیوں کے بڑے سے بڑے متقی و پاک بازوں کی ٹکر کے تھے - تاہم مسیحیوں کے بڑے سے بڑے گنہگار و مجرم، مشرکوں کے بڑے سے بڑے گنہگاروں و مجرموں کا مقابلہ نہیں کرسکتے تھے - مشرکوں کی سیاہ کاریاں مسیحیوں کی سیہ کاریوں سے کہیں بڑھی ہوئی تھیں - مسیحی واعظین کے اثر سے خیر و خیرات کے بھی بہت سے طریقے رائج ہوگئے تھے -

فصل (۹)

دور رہبانیت کے فضائل مخصوص

پچھلی فصل میں مسیحیت کے عام اثرات کا بیان تھا - خالص رہبانی اثرات کا سراغ لگاتے ہوے جیسا کہ بعض پچھلی فصلوں میں گزر چکا ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ رہبانیت کے بالکل ابتدائی اثرات تمام تر مضر تھے - مصلحوں کا ترک دنیا کرکے جنگل و بیابان کو ہجرت کرجانے اور دنیا کے سامنے تزکیہ نفس کے ایک غلط نصب العین کے پیش ہونے کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ابتداً کئی صدیوں تک یورپ کی اخلاقی زندگی میں کوئی اصلاح نہ ہوسکی - تاہم بعض فضائل اخلاق شروع ہی سے رہبانیت کے جلو میں تھے —

سب سے زیادہ حقیقی اخلاقی ترقی کی بنیاد ایثار و خود فراموشی پر ہے - رفق و لطف، سخاوت، تہذیب، اعتدال و ضبط یہ سب بجائے خود فضایل اخلاق کے عنوانات صحیح ہیں تاہم نفس بشری کی اصلی عظمت و شرافت کا پتہ

ان سے نہیں چلتا - اس کے لئے ان سے بالا تر جانا چاہئے اس کا صحیح معیار یہی ایثار ہے اور یہی نصب العین زہاد و راہبین نے دنیا کے سامنے پیش کیا اور خود اس پر عمل کیا ان کے طرز عمل میں گو اتنی خامی ضرور رہ گئی تھی کہ ایثار کو وہ اپنی روحانی خود غرضیوں کی آمیزش سے پاک نہیں رکھ سکتے تھے- تاہم اتنا بھی دنیا میں کون کرتا ہے کہ ثواب آجل کے لئے ہزارہا لذائذ عاجل سے دست بردار ہوجائے اور مال' و دولت' بال بچے' عزت و شہرت سب کو چھوڑ چھاڑ کر صحرا نشینی اختیار کرلے - ایسے نازک وقت میں جب کہ ساری دنیا پر دولت کی حکومت تھی اور اس سے اہل کلیسا بھی مستثنی نہیں رہے تھے یہ صدا صرف راہبوں کے حلقہ سے بلند ہوتی تھی' کہ

"انسان کے حق میں محنت' آرام سے بہتر' گمنامی' نام و نشان سے بہتر' اور داد و دہش' قبول عطیات سے بہتر ہے" -

یا پھر جس زمانے میں کہ ائمہ کلیسا اپنی خفیف الحرکتی سے نام پیدا کر رہے تھے' رہبانی جماعت کی طرف سے یہ ندا آتی تھی کہ

"راہبو' حذر کرو' دو جماعتوں کے قربت سے حذر کرو' ایک عورتوں سے دوسرے پادریوں سے"

یہ صدائیں بے اثر نہیں رہ سکتی تھیں اور الفاظ سے زیادہ موثر راہبوں کا طرز عمل تھا ان کی بد قطع شکلیں نفرت انگیز وضعیں اور وحشت خیز ریاضتیں ہی غیر متمدن دماغوں پر اور زیادہ اثر ڈالتی تھیں لوگوں کے عام تخیل میں راہب کی تصویر یہ تھی کہ ایک لانبی سفید ڈاڑھی والا شخص جس کے چہرے پر نور برس رہا ہے - بکمال سکون تاڑ کے درخت کے نیچے بیٹھا ہوا ہے - شیاطین' آ آ کر وسوسہ

اندازی کرنا چاھتے ھیں مگر اس پر کچھہ اثر نہیں ھوتا - جنگلی درندے اس کے اشاروں پر کام کرتے ھیں اور درد دکھہ بیماری کاھلی کو وہ ایک جنبش لب سے فوراً دفع کرسکتا ھے - اس تخیل کا نتیجہ یہ ھوا کہ ان مقدس بزرگوں کے متعلق صدھا قصہ و افسانہ ملک میں شایع ھوگئے - یہ قصے عموماً مہمل و مضحکہ انگیز ھیں - تاھم اپنے اندر اعلیٰ ترین اخلاقی نتائج رکھتے ھیں یہ اس قدر شایع ھوگئے تھے کہ مائیں اپنے بچوں کو سلاتے ھوے انھیں کو بطور کہانیوں کے بیان کرتیں اور اس طرح ان کی اخلاقی تعلیم کا دائرہ نہایت وسیع ھوتا جاتا - ذیل میں ھم ناظرین کے تفنن و واقفیت کے لئے ایک آدھ کہانی اس طرح کی درج کرتے ھیں :

سینٹ انٹونی کو بیٹھے بیٹھے ایک شب کو یہ خیال گزرا کہ اس سے بڑا زاھد تمام صحرا میں کوئی نہیں - معاً القا ھوا کہ " نہیں ایک زاھد تم سے بھی زیادہ برگزیدہ ھے" - یہ معلوم کرکے سینٹ انٹونی کو اس کی زیارت کا اشتیاق پیدا ھوا اور صبح وہ اس کی تلاش میں سفر کو نکلا - راستہ میں اسے عجیب الخلقت انسان ملتے رھے - مثلاً ایسے کہ جن کے سر پر سینگ تھے اور جن کے پیر بکریوں کے سے تھے - انھوں نے منزل مقصود کا پتہ بتایا یہاں تک کہ سینٹ انٹونی سینٹ پال کے دروازہ پر پہنچا جس کی عمر اس وقت ۱۱۳ سال کی تھی - اسے پہلے دروازہ کھولنے میں تامل ھوا - لیکن بالآخر کھول دیا - اور جب سینٹ انٹونی سے بغل گیر ھوچکا تو دنیا کی حالت سے متعلق سوالات شروع کئے - مثلاً یہ کہ اب بھی دنیا میں نئے نئے مکانات تعمیر ھوتے ھیں ؟ اب بھی دنیا میں بت پرستی کا وجود ھے؟ وغیرہ وغیرہ یہ گفتگو ھو رھی تھی کہ اتنے میں ایک کوا ایک چپاتی لاکر ڈال گیا - سینٹ پال نے کہا کہ

"ساٹھہ برس گزرے کہ میرا رازقہ آدھی چپاتی روز کا ہے۔ یہ آج پوری روٹی تمھارے حصے کے لئے آئی ہے" ۔ یہ کہہ کر دونوں نے خدا کا شکر ادا کیا اور ایک چشمہ کے کنارے کھانے کو بیٹھے ۔ لیکن اب ایک سخت خاص مسئلہ چھڑ گیا ۔ وہ یہ کہ ابتدا کون کرے ؟ سینٹ پال کہتا تھا کہ آپ مہمان ہیں، حق تقدیم آپ کو حاصل ہے" ۔ سینٹ انتونی اس کے جواب میں یہ استدلال پیش کرتا تھا کہ آپ میرے بزرگ ہیں ۔ "آپ کا سن ۱۱۳ سال کا ہے اور میں ۹۰ سال کا ہوں" ۔ کئی گھنٹے گزر گئے اور اس نازک بحث کا کسی طرح تصفیہ نہ ہوسکا تا آنکہ جب بالکل شام ہوگئی ۔ تب یہ خیال پیدا ہوا کہ اس چپاتی کو دونوں ایک ساتھہ اپنی اپنی طرف کھینچیں ۔ چنانچہ اسی فیصلہ پر عمل ہوا ۔ چند روز کے بعد سینٹ پال کا انتقال ہوگیا ۔ سینٹ انتونی کے دست و بازو میں اتنی قوت نہ تھی کہ اپنے ہاتھوں تجہیز و تکفین کرتا ۔ اس فکر میں تھا کہ دو قوی ہیکل شیر جنگل سے نکلے ۔ انھوں نے قبر کھود کر نعش کو دفن کیا ۔ قبر پر روے اور پھر سینٹ انتونی کے آگے سر جھکا کر برکت چاہی —

یہ قصہ سینٹ جروم بکمال سنجیدگی و پختگی اعتقاد بیان کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ جو اس کی صداقت میں شک کرے وہ ملحد و زندیق ہے ۔ اسی طرح مورخ پیلیڈیس روایت کرتا ہے کہ میں نے سینٹ پیکریس کے سفر کا حال خود انھیں کی زبان سے یہ سنا ہے کہ جب انھیں اس مشہور طلسمی باغ کی زیارت کا شوق پیدا ہوا جس پر شیاطین کی عمل داری ہے اور وہ اس قصد سے نکلے تو متواتر نو دن تک وہ ستاروں کی مدد سے سفر کرتے رہے ۔ اور راستہ یاد رکھنے کے لئے

برابر لکڑیاں گاڑتے جاتے تھے - لیکن شیاطین یہ تدبیر نہیں چلنے دیتے تھے اور لکڑیاں اُکھاڑ کر روز رات کو اُن کے سرھانے رکھدیتے تھے - جب وہ باغ نزدیک آگیا تو ستر ذریات شیطان نے نکل کر اُس سے کہا کہ " کیوں ھمیں دق کرنے آئے ہو " مگر پیکریس نے کہا کہ میں صرف یہاں کے عجائب دیکھنے آیا ھوں "- تم سے کچھہ تعرض نہ کرونگا - چنانچہ اس نے باغ کی سیر کی اور بیس دن کے بعد اپنے زاویہ کو واپس پہنچا —

اس طرح کے صدہا قصے اور مشہور ھیں جو اس قدر مستبعد تو نہیں - مگر جن میں اخلاقی سبق ان سے بہتر نکلتے ھیں - مثلاً یہ کہ جب یہی سینٹ لیکریس بیمار پڑا اور کسی مرید نے انگور لاکر دئیے - تو اس نے کسی اور راھب کے نذر کر دئیے - اس نے بھی کسی تیسرے راھب کے نذر کردئیے - یہاں تک کہ سارے صحرا کا چکر لگا کر بالآخر وہ پھر خود سینٹ میکریس کے پاس واپس آگئے - یہی زاھد ھمیشہ خلوت میں گدلا پانی پیتا تھا - لیکن جب کوئی دوسرا راھب شراب پیش کرتا تو اس کی خاطر شکنی کے خیال سے یہ کبھی انکار نہ کرتا اور اس کے بعد اس کا کفارہ یوں کرتا کہ جتنے جام شراب کے پئے تھے اتنے دنوں سادہ پانی تک نہ پیتا - اس کے ایک مرید نے ایک بار یہ دیکھا کہ ایک مشرک بڑی سی لاٹھی ھاتھہ میں لئے ھوے بہت تیزی سے صحرا کی طرف لپکتا جارھاھے ، اور پکار کر پوچھا کہ " اے دیوزاد کہاں چلا " ؟ - مشرک کو سخت غصہ آیا اور اُس نے اُسی لاٹھی سے ان کی خوب مرمت کی - مارپیٹ کرکے چلا ھی تھا کہ سینٹ میکریس کا سامنا ھوگیا جس نے اس فروتنی

و انکسار کے ساتھ اس سے خطاب کیا کہ مشوک کا دل موم ہو گیا وہ فوراً عیسائی ہو گیا اور جسے ابھی زد و کوب کیا تھا اس کی تیمار داری و علاج میں مصروف ہوگیا سینٹ آیوینس ایک بار سینٹ کیسن کی ملاقات کو گیا - میزبان نے روٹیاں لاکر سامنے رکھیں مہمان نے کہا کہ " قبل غروب آفتاب میں منہ پر کبھی دانہ نہیں رکھتا " - میزبان نے اصرار کیا اور جب وہ بھی ناکام رہا تو کہا کہ " آہ مجھے کس قدر ندامت ہے کہ تم مجھے ایک زاہد سمجھکر ملنے آئے مگر آکو دیکھا تو ایک شکم پرست شخص پایا " - اس پر مہمان نے کہا کہ " آپ آزردہ نہ ہوں آپ کی آزردگی کے مقابلہ میں میں گوشت تک کھانے کو تیار ہوں " - جب کھانا ہوچکا تو میزبان نے کہا کہ " بھائی دستور میرا بھی وہی ہے جو تمہارا ہے - لیکن مہمان نوازی کا ثواب صوم سے زیادہ ہے " - ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ ایک امیر خاتون جس وقت ایک راہب کی مہمان نوازی میں مصروف تھی اس کا بچہ کنوئیں میں گر پڑا - مگر راہب کی کرامت یہ تھی کہ اُسے ذرا گزند نہیں پہنچا - سطح آب پر بے تکلف لیٹا رہا اور بعد کو اپنی ماں سے بیان کیا کہ " جس وقت میں کنوئیں میں گرنے لگا ہوں میں نے دیکھا کہ راہب نے ہاتھ پھیلا کر مجھے گود میں لے لیا " - سینٹ میکریس کی بابت ایک اور روایت یہ مشہور ہے کہ اس پر ایک بار یہ القا ہوا کہ کسی پڑوس کے شہر میں دو شادی شدہ عورتیں اس سے زیادہ برگزیدہ ہیں [۔ حالانکہ ازدواج و برگزیدگی میں اس وقت تناقض سمجھا جاتا تھا سینٹ موصوف جاکر ان سے ملا اور ان سے ان کے تقدس

کا راز پوچھا - انہوں نے پہلے تو کانوں پر ہاتھ رکھہ کر کہا - "ہمیں تقدس و برگزیدگی سے کیا واسطہ ' آج ھی رات کو ھمارے شوھروں نے ھم سے صحبت کی ھے - ھم میں کیا نیکی پیدا ھوسکتی ھے" - مگر جب سینٹ کا اصرار حد سے بڑہ گیا تو انھوں نے بیان کیا کہ " ھم دونوں دو بھائیوں کی بیویاں ھیں - اور پندرہ سال سے ھم نے کبھی کسی پر غصہ نہیں کیا ھے ھم نے اپنے شوھروں سے بہت منت کی کہ ھمیں چھوڑدیں مگر انھوں نے ھمیں نہ چھوڑا - تب سے ھم نے یہ عہد کرلیا ھے کہ کبھی کوئی گناہ کی بات منہ سے نہ نکالیں گے" - اس پر سینٹ بے اختیار چلا اُٹھا کہ " واللہ ' خدا ازدواج تجرد ' اور خانقاہ نشینی و دنیاداری کو نہیں دیکھتا بلکہ دل اور نیت کو دیکھتا ھے - اور برگزیدہ ھیں وہ جن کی طبیعت نیک ھے" —

فصل (۱۰)

حیوانات پر شفقت

روایات بالا کی طوالت سے شاید بعض ناظرین اُکتا گئے ھوں لیکن میں نے اس طوالت کو اس لئے اختیار کیا کہ ان کی مدد سے اس وقت کے مسیحیوں کے اصلی اندرونی جذبات کا پتہ چل سکتا ھے - اسی سلسلہ میں میں فصل ھذا میں ان قصوں اور روایتوں کا بھی ذکر کردینا چاھتا ھوں جو راھبان صحرا اور حیوانات کے باھمی تعلق سے متعلق شائع تھیں - ان کا تذکرہ اس لئے اور

بھی زیادہ ضروری ہے کہ ان سے تاریخ اخلاق نے اس مسئلہ پر روشنی پڑتی ہے کہ حیوانات کے ساتھہ ہمدردی و شفقت کا خیال کیونکر پھیلا - یہ خیال قدماء کے یہاں ناپید نہ تھا بلکہ ان کے ہاں متعدد روایات ایسی مشہور تھیں جن میں حیوانات کے ساتھہ اعلی ذہنی و اخلاقی قوی کا انتساب کیا گیا تھا جس سے یہ بھی ضمناً پتہ چلتا ہے کہ وہ لوگ علم حیوانات اور حیوانی خصائص سے کس قدر ناواقف تھے - ہاتھی کے دانشمند و فیاض ہونے کا عقیدہ عام طور پر شائع تھا بلکہ اس کی ایک گونہ پرستش ہوتی تھی - شہد کی مکھیوں کے بارہ میں یہ یقین تھا کہ جب ان سے خلاف آئین حکومت کوئی فعل سرزد ہوتا ہے تو وہ خود کشی کرڈالتی ہیں - یا بعض اور حیوانات اپنے بچوں کے تغذیہ کے لئے خود کشی کرلیتے ہیں - ایک عقاب کی بابت مشہور تھا کہ وہ ایک نوعمر لڑکی پر عاشق تھا اور جب اس کی وفات پر اس کی نعش جلائی جانے لگی تو عاشق نے بھی اپنے آپ کو شعلوں پر گرا گرا کے اپنی جان دیدی - اور کتوں سے متعلق تو دو ایک نہیں صدہا قصے اس کے مشہور تھے کہ اپنے آقاؤں کے ساتھہ انہوں نے بھی اپنی جان دیدی - بعض حکماء کا مقولہ تھا کہ حیوانات میں مثل انسان کے روح و عقل ہوتی ہے اور فیثاغورث تو اس کا قایل تھا کہ انسانی روحیں بہ قاعدہ تناسخ حیوانات میں منتقل ہوجاتی ہیں - رواقیہ اور بعض اور حکماء کا یہ مسلک تھا کہ روح انسانی و روح حیوانی دونوں روح ربانی کے برابر درجہ کے مظاہر ہیں —

خیر، یہ تو افسانے تھے - لیکن ان کے علاوہ تحفظ حیوانات

کے قانونی آثار بھی قدماء کے یہاں ملتے ھیں - زراعت کا دارومدار چونکہ زیادہ تر بیل پر ھے - لھذا یہ شروع سے مختلف ممالک میں خاص طور پر مقدس سمجھا گیا ھے - مثلاً مصر میں اور توریت میں تو بیل کے ساتھہ بدسلوکی کی خاص ممانعت آئی ھے - روم قدیم میں اس خیال میں اس قدر مبالغہ کیا گیا کہ بیل کو ھلاک کرنا ' قتل عمد انسانی کے مرادف سمجھا جانے لگا - اور منقول ھے کہ اسی طرح کا ایک قانون یونان قدیم میں بھی رائج تھا - مور کا احترام بھی یونان و یروشلم میں یکساں فرض تھا - کوئی پرندہ جب کسی انسان کے پاس آکر پناہ لے تو اس کی حفاظت کرنا اور اسے رھائی دینا فرایض میں داخل تھا - بلکہ ایک روایت یہ مشہور ھے کہ ایک مرتبہ یونان میں کوئی بچہ پرندوں کے ساتھہ بے رحمی سے پیش آیا تھا - اس کی پاداش میں اسے سزائے موت دیدی گئی —

ارتقاء اقوام کی رفتار کا یہ ایک عام قاعدہ ھے کہ بیدردی و بے حسی سے ذکی‌الحسی و دردمندی کی طرف صعود ھوتا رھتا ھے جو انسانیت و لطافت شائستگی کا سنگ بنیاد ھے - لیکن اس عام رفتار میں بعض خاص حالات سے رکاوٹ بھی پیدا ھوجاتی ھے - یہی کیفیت یہاں بھی پیش آئی قوانین بالا کا مقصد یہ تھا کہ بیل وغیرہ کارآمد حیوانات کے تحفظ کے ذریعہ سے ایک خانہ بدوش و جنگجو قوم میں زراعت پیشگی کے عادات پیدا کئے جائیں - لیکن اس رحیمانہ احساس کے بڑے دشمن وہ کھیل یا بازیاں ثابت ھوئیں - جن میں حیوانات کی خونریزی لازمی تھی - یونان قدیم میں بیل بازی ' مرغ بازی ' بٹیر بازی کا دستور عام تھا اور حکومت کی طرف سے اس کی اور

تائید و اشاعت ہوتی تھی تاکہ اہل فوج جرأت و شجاعت کا ان سے سبق حاصل کریں - روسہ قدیم میں ان چیزوں کی جو افراط تھی اُس کا ذکر پیشتر گزر چکا ھے - لیکن جس طرح ھم یہ پہلی جلد کے کسی باب میں دکھا چکے ھیں کہ باوجود مناظر سیافی کی کثرت کے انسانیت کا معیار گرنے نہیں پایا تھا - اسی طرح یہ امر بھی قابل لحاظ ھے کہ باوجود حیوانات کی خونریز جنگوں اور بازیوں کے خود روسی لٹریچر، اور نیز ان ممالک کے لٹریچر میں، جو روم کے ماتحت تھے حیوانات کے ساتھہ بہ لطف وشفقت پیش آنے کے بہ کثرت نظایر ملتے ھیں - ورجل، لگریشیس پلوتارک، آوِد، جونیل، اپولونیس، و آرین، ان سب کے یہاں یہ خیال کسی نہ کسی پیرایہ میں ملتا ھے —

ایمفی تھیٹر (جانوروں کے دنگل) میں صدھا حیوانات کے کٹنے کے ساتھہ ساتھہ اس احساس کا قایم رکھنا بجائے خود حیرت انگیز ھے - لیکن اس سے بڑہ کر یہ کہ صرف یہ احساس ھی نہیں موجود تھا بلکہ اس کی متعین طور پر تعلیمات موجود تھیں فیثا غورث و اپھیدوکلس نے اس تعلیم کی بنا تناسخ ارواح پر رکھی تھی یعنی اس مسئلہ پر کہ وھی ارواح ادل بدل کر انسان و حیوان کے قالبوں میں آتی جاتی رھتی ھیں اور فلسفۂ فیثا غورث کی اشاعت کے ساتھہ اس عقیدہ کی تعلیم بھی عام ھوتی گئی - پار فری نے ترک لحم کی تلقین کی اور سنیکا نے کچھہ روز کے لئے اس پر عملدر آمد بھی کیا - لیکن ان سب سے بڑہ چڑہ کر کارنامہ پلو تارک کا تھا - اُس نے تناسخ سے بالکل قطع نظر کرکے شفقت حیوانات کو فرایض انسانی میں داخل کیا اور اس شدومد سے اس کی وکالت کی کہ اس کی نظیر مسیحی لٹریچر میں

بھی کم از کم سترہ سو سال تک نہیں ملتی - وہ اس کا قایل ھے کہ حیوانات کے ساتھہ حسن سلوک اسی قدر قطعی و لازمی ھے ، جتنا خود بنی نوع انسان کے ساتھہ اور ایمفی تھیٹر کے مناظر وغیرہ کی پر جوش مخالفت کرتا ھے —

مسیحت کا دور اولی اس کا موید نہ تھا - کہیں کہیں اتفاقی طور پر اس زمانہ میں بھی پادری ترک لحم و شفقت حیوانات کے باب میں تلامذہ فیثا غورث کی بولی بول گئے ھیں - تاھم عام حالت یہ تھی کہ اُن کے عقیدۂ تناسخ کی کلی تغلیط ھوتی تھی - نوع انسان جملہ انواع عالم سے کلیتاً و اصولاً ممتاز سمجھی جاتی تھی - اور تمام فرایض انسانی کا دائرہ صرف بنی انسان تک محدود تھا - بلکہ اس خاص باب میں تو انجیل سے زیادہ توریت نے کام کیا ھے کہ اُس میں حیوانات کے ساتھہ حسن سلوک کے اگر صریح احکام نہیں مقرر ھیں تو کم از کم ایسے اشارات تو بہ کثرت ھیں جن سے دل میں اس کا احساس پیدا ھو جاتا ھے —

لیکن مسیحی شریعت میں حقوق حیوانات کے متعین نہ ھونے کی تلافی ایک دوسری صورت سے ھوگئی - یعنی راھبوں کے طرز زندگی سے - صحرا و بیابان میں تن تنہا رھنے کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ حیوانات کے ساتھہ زیادہ تعلقات پیدا ھوں اور اس بنا پر عوام کے ذھن میں راھبانہ زندگی کا جو تخیل تھا اُس کا ایک لازمی عنصر حیوان دوستی بھی ھوگیا تھا - اور پھر یہ تخیل طرح طرح کے افسانوں میں جلوہ دکھانے لگا - مثلاً یہ کہ پرندے پیر صحرا کی

آواز پر اپنی پرواز روک دیتے ہیں، شیر اُس کے قدموں پر سر رکھدیتے ہیں اور راہب کا دل اگرچہ اپنی ہمجنسوں کی محبت سے خالی ہوتا ہے ۔ تاہم اپنے ان احباب صحرائی کے لئے ہمدردی و الفت رکھتا ہے اور اس کی تقدس و برگزیدگی اس کے ہمنشینوں میں بھی سرائت کر جاتی ہے - سینٹ تھیون جب سفر کے لئے باہر جاتا تھا تو درندے رفقاء سفر کا کام دیتے تھے اور وہ اس رفاقت کے معاوضہ میں انہیں اپنے کنوئیں کا پانی پلاتا تھا - مصر کے ایک راہب نے بیابان میں ایک خوشنما باغ تیار کیا تھا اور وہاں ایک تاڑ کے نیچے بیٹھکر شیروں کو اپنے ہاتھ سے پھل پھلاری کھلاتا تھا - سینٹ پومن ایک بار رات کے وقت سردی سے لرز رہا تھا کہ ایک شیر نے آکر اُس کے سارے جسم کو چھا لیا اور اس طرح سردی کی اذیت سے وہ محفوظ ہوگیا - شیر متعدد راہبوں کی خدمات کیا کرتے تھے - بلکہ بعض بعض کی تجہیز و تکفین تک انہیں نے کی ہے - ایک ضعیف العمر راہب ایک مرتبہ پیدل سفر کر رہا تھا - اور اپنا اسباب ایک گدھے پر بار کئے ہوئے تھا - راستہ میں ایک شیر نے گدھے کو ہلاک کر ڈالا - لیکن اس کے بعد راہب کے اشارہ پر اُس کا اسباب خود اپنی پشت پر بار کرکے منزل مقصود تک پہنچا آیا - ایک اور راہب نے ایک مرتبہ جنگل میں جنگلی گدھوں کے ایک جھنڈ کو آواز دی جس میں سے ایک گدھا نکل کر آیا اور وہ ان کا سامان بار کرکے ساتھ چلا - بعض راہبوں نے گھڑیال و دیگر دریائی جانوروں کی پشت پر سوار ہوکر دریائے نیل و سمندر کو عبور کیا ہے اور آهوؤں

کے تذکرے تو ان قصوں میں نہایت کثرت سے آتے ہیں جن میں شاید سب سے زیادہ دلچسپ قصہ یہ ہے کہ ایک شکاری ایک آہو کا تعاقب کر رہا تھا کہ دفعتاً آہو نے اپنی اصلی شکل اختیار کرلی - یعنی خود مسیح کی اور اس کی پیشانی پر صلیب لٹک رہی تھی یہ معجزہ دیکھکر شکاری معاً ایمان لے آیا - سینٹوں کی جماعت میں متعدد سینٹ ایسے ہوئے ہیں جو خاص خاص نوع حیوانات کے مخصوص پیر یا سینٹ ہوئے ہیں - مثلاً سینٹ اِریسمس بیلوں کے پیر ہوئے ہیں - اسی طرح کوئی سوروں کا ہوا ہے - کوئی آہوؤں کا ، کوئی کوؤں کا وغیرہ سینٹ کولمبن کے تین رفیق تھے ، ایک چوہا ، ایک مکھی اور ایک مرغ ، مرغ کا کام یہ تھا کہ اوقات عبادت پر بانگ دیتا تھا اور اگر راہب کو اُٹھنے میں دیر ہوتی تھی تو چوہا اس کا کان کترنے لگتا اور مکھی کا فرض یہ تھا کہ دوران مطالعہ میں راہب کو اگر کسی وقت اپنی نظر ہٹا لینا پڑتی تو مکھی عین اُس لفظ پر بیٹھہ جاتی جہاں سے اس نے چھوڑا تھا - اور اس طرح نشان کا کام دیتی - ایک اور راہب کا معمول تھا کہ شب کا کھانا ایک بھیڑیے کے ساتھہ کھاتا تھا - ایک روز بھیڑیا قبل از وقت آکر وہ کھانا تنہا کھا گیا - مگر اس خطا پر اسے اتنی ندامت ہوئی کہ ایک ہفتہ تک اس نے راہب کو منہ نہیں دکھایا اور بالآخر جب آیا تو سرنگوں جس سے انتہائی انفعال برستا تھا - راہب نے اس کا قصور معاف کیا اور اس روز خوش ہوکر اسے دہرا حصہ دیا - اسی طرح اور صدھا روایات اس طرح کی مشہور ہیں کہ کسی راہب نے ایک شیرنی کے

اندھے بچہ کو بینا کر دیا - کسی زخمی پرندہ کو فوراً اپنی دعا سے اچھا کر دیا - کسی مردہ پرندہ کو زندہ کر دیا - اور ان سے بھی بڑھ کر یہ کہ حیوانات کی اخلاقی زندگی میں معاً اصلاح کر دی - یعنی جو جانور چور تھے اُن سے چوری کی عادت چھڑا دی - جو بد عہد تھے اُنھیں باوفا بنا دیا - وقس علی ھذا -

میں نے ابھی کہا کہ اس قبیل کی صد ھا روایتیں مشہور تھیں - اس میں مبالغہ نہ سمجھنا چاھئے - صد ھا کیا معنی ھزار ھا روایات اس قسم کی شائع تھیں اور ان کی یہ افراط و کثرت بلا وجہ نہ تھی ایک تو صحرا کی خلوت نشینی بجائے خود انسان و حیوان کے درمیان میل جول کی طرف موڈی ھے - دوسرے غیر تربیت یافتہ نفوس خصائل و رذایل کو مجسم شکل میں دیکھنا چاھتے ھیں اور تجسیم کے لئے حیوانات کا قالب موزوں نکلا - تیسرے مشرکوں کے زمانہ کے توھمات ابھی باقی تھے - جو حیوانات کے جانب عقل و اخلاق کا انتساب کرتے تھے - ان مختلف قوتوں نے مل کر اس طرح کے قصص کو خوب چمکا دیا - موجودہ ناظرین انھیں مزخرفات کے درجہ میں رکھیں گے اور ایک سنجیدہ تالیف میں ان کے داخلہ پر معترض ھوں گے - لیکن در حقیقت یہ اعتراض بالکل بیجا ھو گا - کیونکہ صدیوں تک یہی مزخرفات جزو معتقدات رہے ھیں - بلکہ یہی خوش اعتقادیاں مذھب، اخلاق، اور تعلیم و تربیت کے ساتھ ناقابل انفصال طور پر وابستہ ھونے کے ساتھ قوم کے اندرونی جذبات کی بہترین ترجمان رھی ھیں - اور ان کے ذریعہ سے شفقت حیوانات کے مسئلہ پر جو روشنی پڑتی ھے - وہ ظاھر ھے - لیکن خوش

اعتقادیوں کی اس مسلسل داستان کے علاوہ دو چار واقعات مستند تاریخی ذرائع سے بھی ہم تک پہنچے ہیں جن سے راہبوں کی واقعی ہمدردی حیوانات کا اندازہ ہوتا ہے۔ مثلاً تیرھویں صدی میں وینس میں ایک غیر معروف سینٹ جیمس ہوا ہے۔ اس کا دستور تھا کہ لڑکے جن چڑیوں کی ٹانگ میں ڈور باندھ باندھ کر اُن سے کھیلا کرتے تھے۔ یہ اُنھیں اُن سے خرید کرکے رہا کر دیا تھا۔ اور کہا کرتا تھا کہ "میں ادنیٰ سے ادنیٰ مخلوق پر بھی ظلم نہیں دیکھ سکتا ہوں" یا پھر مثلاً سینٹ فرانسس آف اسیسی کہا کرتا تھا کہ "اگر مجھے بادشاہ کے دربار میں کبھی بار یابی نصیب ہو تو میں اُسے خدا کا واسطہ دلا کر یہ التجا کروں گا کہ لو ون (چنڈولوں) کی اسیری کی ممانعت کر دے اور یہ قانون جاری کر دے کہ گدھوں اور بیلوں کو بڑے دن کے روز خصوصیت کے ساتھ زیادہ اور عمدہ کھانا دیا جائے"۔ اسی راہب کی بابت بیسیوں افسانے بھی مشہور ہیں۔ مثلاً یہ کہ اس نے ایک بار ایک بھیڑیے سے یہ وعدہ لے لیا کہ آیندہ کبھی بھیڑوں پر حملہ نہ کرے گا اور بھیڑیے نے پیمان باندھنے کے طور پر اپنا پنجہ اس کے ہاتھ پر مارا اور اس کے بعد سے اہل شہر روزانہ اُسی بھیڑیے کا آزوقہ دیدیتے تھے۔ وغیرہ۔

لیکن بحیثیت مجموعی ہم سے کوئی رائے پوچھے تو ہم یقیناً کہیں گے کہ کتھولک ازم نے شفقت حیوانات کے باب میں جو کچھ کیا وہ برائے نام سے زاید نہیں علم بردارا ن مذہب کا یہ ہمیشہ شیوہ رہا ہے کہ وہ ہر شے کو مذہب ہی کی عینک سے دیکھتے ہیں اور چونکہ ان کے نظام نجات و کفارہ

میں حیوانات کا کوئی درجہ نہ تھا - اس لئے کبھی انھوں نے ان کے حقوق کی طرف اعتنا نہ کی، بلکہ کبھی یہ سمجھا ہی نہیں کہ ان کا کوئی حق بھی ہمارے اوپر ہے - قصص بالا میں بھی جتنی مثالیں حیوانات کے ساتھہ ہمدردی و شفقت کی کی ملتی ہیں ان میں سے کوئی اس حیثیت سے نہیں کہ حیوان فی نفسہ ہمارے حسن سلوک کا مستحق ہے بلکہ محض ان حیوانات سے محبت ہے جنھیں مسیح یا دیگر بزرگان دین کے ساتھہ کوئی نسبت تخصیص رہی ہے - مثلاً گدھے سے اس لئے محبت تھی کہ مسیح اس پر سوار ہوئے تھے - آھوؤں سے اس لئے کہ ان کے ذریعہ سے بزرگوں کے مخفی قبروں کا پتہ لگتا تھا - وقس علی ہذا —

غرض جتنی روایات ہیں سب کسی مذہبی تخصیص کی بنا پر حسن سلوک کی ہیں ورنہ یہ حیوانات کے ساتھہ من حیث الحیوان کسی فرض کی ادائی کا کہیں نشان نہیں ملتا - پھر ایک بات اور بھی ہے وہ یہ کہ اس مسئلہ پر دو بالکل مختلف حیثیات سے نظر کی جا سکتی ہے - ایک اس لحاظ سے کہ حیوانات کو اذیت و تکلیف کس درجہ کی ہوتی ہے ؟ دوسرے اس نقطۂ نظر سے کہ ان سے انسان کی سرشت اخلاقی میں شقاوت و سنگدلی کہاں تک پیدا ہوتی ہے ؟ یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے کی متناسب ہر گز نہیں ہوتیں - کیونکہ آج بھی ہمارے شکار کے وقت شکار کو جو اذیت و تکلیف ہوتی ہے وہ ہر گز اس اذیت و تکلیف سے کمتر نہیں جو جانوروں کو اکھاڑہ میں باہم لڑائے جانے سے ہوتی تھی - تاہم چونکہ تعاقب کے وقت ہم میں خود سخت جوش ہوتا ہے اور شکار اپنی تکلیف کو ظاہر نہیں کرسکتا اس لئے شکار سے ہمارے نفس میں وہ شقاوت

و قساوت نہیں پیدا ہوتی جو قدیم خون ریز ملاعب کے نظارہ سے پیدا ہوتی تھی۔ وہ قدیم خون ریز مناظر آج بے شبہ دنیاے مسیحیت سے معدوم ہوگئے ہیں - لیکن ان کی معدومیت میں مسیحیت کا کیا خاص احسان ہے ؟ جس زمانہ میں اور جن ممالک میں مسیحیت اپنے عروج پر رہی - وہاں یہ خون ریز ملاعب برابر قایم رہے اور آج جو معدوم ہوئے ہیں تو اس لئے کہ تمدن کی ترقی اور شایستگی کی لطافت سے لوگوں کے مذاق میں اس قدر نزاکت و نفاست پیدا ہوگئی ہے کہ وہ مناظر خون ریزی کے نظارہ کی تاب نہیں لا سکتے - نیز اس لئے ڈراما و تھیٹر کی گرم بازاری نے تفریحات و ملاعب کا رخ اب بالکل دوسری سمت پھیر دیا ہے - اس انقلاب احساس کی پروٹسٹنٹ کلیسا نے اپنے اپنے ممالک میں تائید کی ہے - لیکن کتھولک ممالک میں انہہ کلیسا کو یہ فخر بھی نہیں دیا جا سکتا - وہاں یہ کام والٹیر و بیکسیریا جیسے اشخاص کے ہاتھوں سر انجام پایا ہے - اسی حالت میں اصل مسئلہ کے ان دو پہلوؤں کی تفریق کو ملحوظ رکھہ کے ایک حکیم اخلاق بالآخر یہ فیصلہ کرے گا کہ موجودۂ طرق شکار و صید افگنی سے اگرچہ نفس میں وہ قساوت نہیں پیدا ہوتی جو قدیم ملاعب سے پیدا ہوتی تھی - یا آج کل طبی و عضویاتی معلومات کی غرض سے زندہ حیوانات پر جو اعمال جراحی کئے جاتے ہیں وہ چونکہ دنیا کی نظر سے مخفی رہتے ہیں اس لئے ان کا زہریلا اثر عام اخلاق پر نہیں پڑنے پاتا - تاہم ہم میں سے کون رحیم‌المزاج شخص ایسا ہے - جس کے حس اخلاقی کو ان واقعات کے نظارہ سے صدمہ نہیں پہنچتا ؟ اور ان چیزوں کو باضابطہ حدود اخلاق کے اندر لانا یا حیوانات کے

ساتھ حسن سلوک کو ایک اخلاقی فرض سمجھنا تو اٹھارھویں صدی کے بالکل مادی تمدن و دنیوی شائستگی کا نتیجہ ہے جس میں راھبان صحرا کی سعی و کوشش کو کوئی دخل نہیں مسیحی دنیا کو اس کا اعتراف کرلینا چاھئے کہ اس باب میں ھندو مسلمان دونوں اس سے بہت سبقت لے گئے ھیں، بلکہ آج تک جن ممالک میں رومن کیتھولک فرقہ کا غلبہ ہے (مثلاً اسپین و اٹلی) وھاں اب بھی حیوانات پر بکمال شقاوت و بالاعلان مظالم جاری ھیں —

خانقاھیت کا ابتدائی اثر دنیا پر جس حد تک مفید پڑا وہ تخیل کے ذریعہ سے قصوں اور افسانوں کی وساطت سے پڑا ۔ مشرق میں بعض خانقاہ نشین بڑے مشہور عالم ھوے ھیں اور ان میں سے اکثر زاھدان مرتاض پیدا ھوتے رھے ھیں ۔ لیکن مغرب میں خانقاھیت نے اس سے اعلیٰ تر مظاھر میں اپنا جلوہ دکھلایا ۔ شروع شروع میں یہاں بھی زھد خشک و عبادات و ریاضات کی گرم بازاری رھی ۔ لیکن تین سبب ایسے پیش آے جنھوں نے رھبانیت کا رخ عملیت کی طرف پھیر دیا ۔ ایک یہ کہ مغرب کی آب و ھوا اور یہاں کی اقوام کی نسلی خصوصیات خود ھی جسم کو ریاضات شاقہ کی برداشت کے قابل نہیں رکھتیں اور نہ دماغ میں زیادہ توھمات پیدا ھونے دیتی ھیں ۔ دوسرے یہ کہ چھٹی صدی میں ایک مقنن اعظم ایسا پیدا ھوا جس کا اثر رفتہ رفتہ سارے یورپ پر محیط ھوگیا اور جس نے غیر ضروری مہلک ریاضات کو ناجائز اور محنت و کاروبار کو راھبانہ زندگی کا جزو قرار دے کر موجودہ تمدن کی داغ بیل ڈال دی ۔ تیسرے یہ کہ بربریوں کے پیہم حملوں نے نظام حکومت و معاشرت کو درھم و برھم کرکے پھر اسے اس کی ابتدائی صورت میں پیدا کردیا اور اس

طرح سیاسی علمی، و معاشری نظامات کا بار خانقاھوں ھی پر آ پڑا —

بعض مورخوں نے کہا ھے کہ الارک کے ھاتھوں تسخیر رومہ سے چونکہ مشرکانہ مذھب کی بڑی بڑی عظیم الشان یادگاریں مٹ گئیں - اس لئے یہ واقعہ بجائے خود اس شہر میں مسیحیت کی تقویت کا باعث ھوگیا - میرے نزدیک اسے ذرا زیادہ وسعت دے کر اسے مغربی تمدن کے عام انحطاط پر منطبق کرنا چاھئے - اس تمدن میں مسیحیت اگرچہ ملکی مذھب کا مرتبہ رکھتی تھی تاھم سلطنت کا سارا فلسفہ، ساری روایات کا دار و مدار بت پرستانہ مذھب پر تھا - جس کے پیدا کردہ قدیم و متروک خصائل لوگوں کے خمیر میں داخل ھوگئے تھے - بربریوں کے حملوں نے اس تمدن کو منہدم کرکے مسیحیت کے لئے رستہ صاف کردیا —

اس دور اِبتلا میں ارکان کلیسا نے جس جرأت و دانشمندی کا اظہار کیا ھے - در حقیقت اس کی نظیر آسان نہیں - یہ ھمیں گزشتہ فصل میں معلوم ھوچکا ھے کہ وہ کس بے خوفی کے ساتھہ مفتوحوں کو فاتحوں کے غضب سے بچاتے تھے - اور کس ایثار و عالی ھمتی کو صرف کرکے قحط زدوں کی رفع تکالیف میں مشغول رھتے تھے، ایسے زمانہ میں جب کہ غلہ کی درآمد ملک میں مسدود ھوگئی تھی اور جب کہ بڑے بڑے وسیع و شاداب کھیت حملہ آوروں کے گھوڑوں کی ٹاپ سے پامال ھو رھے تھے - اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز بربریوں کا قبول مسیحیت ھے مگر افسوس ھے کہ تاریخ کا یہ صفحہ ھمارے لئے تقریباً بالکل سادہ ھے - کیونکہ یہ واقعہ ھے کہ قوموں کی قومیں اور قبایل کے قبایل ایسے ھیں جن کے تحول دین کے اسباب ھمیں مطلق نہیں معلوم ھیں - قوم گوتھہ تو

زوال روما سے پیشتر ھی مسیحی ھوچکی تھی - لیکن بڑا حصہ دنیاے بربریت کا اس وقت مسیحی ھوا - جب کہ دنیوی حیثیت سے بربریوں کا عین عروج تھا - ان وحشیوں کو جو اپنے وطن میں اپنے کلیہ برداران شریعت کی حلقہ بگوشی کے عادی تھے - جب ایک غیر ملک میں پہنچ کر ایسے اساطین مذھب سے سابقہ پڑا - جو ان سے بدرجہا زاید متمدن و شایستہ تھے - ان کے پر شوکت مذھبی مراسم و ھیبت ناک عقاید حشر و نشر سے ان کا متخیلہ خاص طور پر متاثر ھوا - قدیم تعلقات کو تو یہ خیر باد کہہ ھی چکے تھے - اب انھوں نے تمدن کی عظمت کے آگے اپنی گردن خم کردی - اور لاطینی زبان کے ساتھہ لاطینی مذھب بھی ساری جماعت پر محیط ھوگیا - اور اس راہ دعوت و تبلیغ میں مسیحیت کے دو عقیدے اس کے حق میں خصوصیت کے ساتھہ مفید پڑے - ایک عقیدہ نجات مخصوص براے مسیحیان' دوسرے وجود شیاطین - نجات مخصوص کے اعتقاد کی بنا پر مسیحیوں کے لئے قدیم معتقدات سے تایب ھونا لازم ھوگیا تھا - ساتھہ ھی چونکہ وہ اپنے قدیم معبودوں کے تصور کو ذھن سے یکسر خارج نہیں کر سکتے تھے - اس لئے انھیں دوسرے مسئلہ یعنی وجود شیاطین سے یہ مدد ملی کہ اب وہ انھیں شیاطین کے درجہ پر رکھنے لگے - پھر اس وقت کے داعیان مسیحیت میں علاوہ جوش خلوص و سرگرمی کے دانشمندی بھی انتہا درجہ کی تھی - انھوں نے یہ تاڑ لیا تھا کہ یہ بربری اپنے بادشاھوں اور بادشاہ بیگموں کے دین کے مطابق ھمیشہ اپنا دین رکھتے ھیں - چنانچہ انھوں نے اپنی دعوت و تبلیغ کا اصل مرکز انھیں کو بنایا اور دنیا نے دیکھہ لیا کہ ملکۂ کلوتلدا' ملکہ برتھا' و ملکہ تھیوڈولندا کے قبول مسیحیت کے

اثر سے اُن کے شوہروں اور پھر ساری قوم کے مسیحی بنالینے میں کیسی مدد ملی - ایک مرتبہ مسیحیوں نے یہ کیا کہ ایک نقاش کو کچھہ دے دلا کر اُس سے میدان حشر و جہنم کی ایک تصویر بنوائی جس میں منکرین بڑے عذاب جھیل رہے تھے - اسے دیکھہ کر منکرین قدرتاً دہشت و ہیبت سے سخت متاثر ہوئے - اس طرح کی ترکیبیں اُس وقت کے داعیان مسیحیت اکثر کیا کرتے تھے - ان سب کے علاوہ سب سے زیادہ چلتا ہوا جادو ان کو یہ یاد تھا کہ ہر طرح کا دنیوی عیش و آرام ، دولت و حکومت ایمان مسیحیت کے ثمرات ہیں اور ہر طرح کی مصیبت ، قحط ، سیلاب ، وبا وغیرہ بت پرستی یا معصیت سے پیدا ہوتی ہے - وحشیوں کے دماغ میں تحقیق و تنقید کی قوت کہاں تھی - وہ اس سے خصوصیت کے ساتھہ متاثر ہوتے - اور جب وہ خوف و طمع دونوں کے اثر سے اس میں جوق جوق شریک ہونے لگے تو انھوں نے اپنے قدیم تہواروں اور میلوں کا نعم‌البدل مسیحی بزرگان دین کے سالانہ فاتحوں و یادگاروں کو پایا - علاوہ باضابطہ مبلغین کے ، دعوت و تبلیغ ایک ایسا فریضہ تھا - جسے مسیحی اسیران جنگ بھی ادا کرتے تھے اور جب ان مختلف ذرائع سے ایک بڑی تعداد فاتحین کی مسیحی ہوگئی تو شدید تعزیری قوانین نافذ کر کے مسیحیت کی مخالفت کا سد باب کردیا گیا —

غرض بالآخر ان مختلف تدابیر و ذرائع سے مسیحیت کو فتح حاصل ہوئی لیکن یہ فتح جس قدر وسیع تھی اُسی قدر قطعی و خالص نہ تھی - کیونکہ اب مسیحیت بے آمیزش نہیں رہی تھی بلکہ بت پرستی سے کشمکش میں خود اس کی آمیزش اس میں بہت کچھہ آگئی تھی - بتوں

کی جگہ پر اب مسیحی شہداء و بزرگانِ دین کے نام زبان پر چڑھ گئے تھے - اور گو اسماء بدل گئے تھے - لیکن صفات و خصوصیات سب جوں کے توں رہے تھے - آئمہ کلیسا نے اس کے روک تھام کی کوئی تدبیر بھی نہیں کی - بجز اس کے کہ وہ مختلف افسانوں اور قصوں کے ذریعہ سے اس عقیدہ کو پھیلاتے رہے کہ معبودان قدیم شیاطین کی صورت میں اب بھی زندہ ہیں اور لوگوں کو ورغلا کر راہ حق سے منحرف کرایا کرتے ہیں - مثلاً چھٹی صدی کے ایک مشہور پاپائے روم یہ روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایک یہودی تنہا سفر کررہا تھا - راستہ میں رات ہوگئی - سامنے اپولو کا ایک ویران مندر تھا - اُس میں وہ شب بسر کرنے کے ارادہ سے گیا - مگر اُس کے اندر پہنچ کر اُس پر سخت دہشت طاری ہوئی - اُس نے شیاطین کے گزند سے محفوظ رہنے کے لئے اپنے جسم پر اُنگلیوں سے صلیب کی صورت بنائی - اس کے اثر سے وہ شیاطین کے گزند سے تو محفوظ رہا لیکن اس نے دیکھا کہ آدھی رات کو اپولو اپنا دربار کررہا تھا - اور بڑے بڑے ہیبت ناک شیاطین اپنے یہ پرفخر کارنامے بیان کررہے ہیں کہ ہم اس طرح مسیحیوں کو ورغلایا کرتے ہیں - یا اس طرح آیرلینڈ کا ایک مشنری سینٹ گال ایک بار رات کے وقت مچھلی کا شکار کھیل رہا تھا - جھیل کے قریب ہی اُس نے خانقاہ بھی تعمیر کرائی تھی کہ اسے اس سناٹے میں عجیب و غریب روتی ہوئی آوازیں سنائی دیں - یہ آوازیں پانی کے دیوتا اور پہاڑوں کے دیوتا کی تھیں ' جو اس باب میں مشورہ کر رہے تھے کہ نئے دشمن (مسیحیت) کو کیونکر شکست دینا چاہئے —

فصل (۱۱)

خانقاهیت

مغرب میں خانقاهوں کی اشاعت کے مسئله پر متعدد مورخوں نے لکھا هے ۔ اور یه مسئله اب کچھه ایسا دشوار و غامض نہیں رها هے - سب سے پہلی بات یه که جو اسباب عام رهبانیت کی اشاعت کے باعث هوئے - ایک بڑی تعداد اُن میں کی اب بھی موثر رهی اور پھر ایک سبب مزید یه هوا که بربریوں کے متعدد حملوں سے ملک میں جو عام انتشار و بدنظمی پھیلی تھی اُس کے لحاظ سے یه ضروری هوگیا تھا که کوئی ایک مرکز تو کم از کم ایسا هو جہاں امن و سکون نصیب هوسکے اور خانقاهیں اس ضرورت کو به احسن وجوه پورا کرتی تھیں - درحقیقت ایسی چیزیں تھیں جن کی طرف خواص و عوام دونوں کو یکساں کشش هوتی تھی - خوش اعتقادوں کے لئے خانقاه میں داخل هونا جنت میں داخله کی ضمانت تھا - اهل کرم و متقی اس میں اس لئے داخل هوتے تھے که مختلف تبلیغی و کریمانه فرایض کی انجام دهی کا موقع ملے گا - جاه پسندوں کے لئے یه ترغیب تھی که بڑے بڑے عہده ملیں گے جو ممکن هے که پاپائیت پر ختم هوں - کتاب کے

کھڑوں کو یہ طمع تھی کہ سکوں کے ساتھہ مطالعہ و کتب بینی کا وقت ملے گا - اپاھجوں اور کاھلوں کو یہ کشش تھی کہ ھاتھہ پیر نہ ھلانا پڑے گا - غرض یہ کہ ھر طبقہ و ھر مزاج کے لوگوں کو اس میں شرکت کے لئے کافی محرکات موجود تھے اور یہ بھی اطمینان تھا کہ خواہ اس میں کتنے ھی کثرت سے لوگ شریک ھوں، معاش کی طرف سے کبھی تنگی نہیں ھونے کی - امرا و اھل ثروت جب تک زندہ ھیں ھمیشہ حصول ثواب و نجات کے لئے اپنی جائدادیں وقف کرتے جائیں گے اور راھب صاحبان ٹیکس وغیرہ سے مستثنی رہ کر ان جائدادوں کا پورا انتظام کرتے رھیں گے پھر معاش کی طرف سے بے اطمینانی کی کیا صورت ھوسکتی ھے ؟ بلکہ ایک شورش و بد نظمی کے زمانہ میں واحد مرکز سکون ھونے کی حیثیت سے تمدن، زراعت و کارو بار کا بھی مرکز اب یہی خانقاھیں رہ گئی تھیں —

لیکن ظاھر ھے کہ خانقاھیت کے یہ مفید اثرات دیر پا نہیں ھوسکتے تھے - ابتدائی جوش و غلو کے گزر جانے کے بعد یہ ناممکن تھا کہ بڑی بڑی جماعتیں مجرد اور جائدادوں کے مالک غیر مسئول رہ کر پاکباز رہ سکیں، چنانچہ یہی ھوا کہ چند روز میں بد چلنی کا بازار خوب گرم ھوگیا - اسی طرح جب جنگ و جدال کی بد نظمیاں موقوف ھوگئیں اور ملک کے سارے کارو بار اپنی اصلی حالت پر آگئے تو خانقاھوں کے وجود سے جو تمدنی منافع تھے - یعنی ان کا زراعتی و کارو باری مرکز ھونا، ان کا بھی خاتمہ ھوگیا - اس سے بھی بڑھکر یہ کہ اب صورت حالات کے بدل جانے سے خانقاھیت کی بعض تعلیمات راہ

ترقی میں حایل ہونے لگیں - مثلاً اس کی یہ تعلیم کہ فقر و افلاس موجب تقدیس و احترام ہے - صریحاً ترقی تمدن کے منافی تھی —

مگر ایک شے خانقاہیت کی پیدا کردہ ایسی تھی جو گویا جزو سرشت ہوگئی اور جو صورت حالات خارجی کے بدلنے کے ساتھہ بدلنے والی نہ تھی - اس سے ہماری مراد خوئے فروتنی و انکسار سے ہے - راہبوں میں اور سب صفات تو موجود ہوتی تھیں لیکن انانیت و خودی اکثر پیدا ہوجاتی تھی اور کیوں نہ پیدا ہوتی ؟ وہ کسی کے نوکر چاکر نہ تھے کسی کے پاس غرض لے کر نہیں جاتے تھے - صدہا ہزارہا اہل غرض ان کے پاس البتہ آیا کرتے تھے - غرض انانیت و خودی راہبوں کا ایک عام شیوہ ہوچلا تھا کہ مغرب کی خانقاہیت نے اس خطرہ کو متا دیا - یہاں کی باضابطہ و مرتب خانقاہانہ زندگی کی شرط اولین یہ تھی کہ اطاعت و انکسار ہو اطاعت کے فواید سے قدیم تمدن بیگانہ نہ تھے - تاہم زوال رومہ کے وقت اور وحشیوں کی ہنگامہ آرائیوں کے درمیان یہ جوہر گویا دنیا سے ناپید ہوگیا تھا - مسیحیت نے آکر پھر اعادۂ معدوم کیا - اسی لئے دنیا نے بھی بڑھکر اس کا خصوصیت سے خیر مقدم کیا - اور گرجا کی اس تعلیم کی تقلید دیگر حلقوں میں بھی ہونے لگی - اور اطاعت کا جوہر تو خیر دنیا میں پیشتر سے موجود تھا - لیکن انکسار و فروتنی کا وصف تمام تر مسیحیت کا پیدا کردہ ہے اور اس تعلیم پر جس پابندی کے ساتھہ خانقاہوں میں عمل در آمد ہوتا تھا اور کہیں نہیں ہوتا تھا - در حقیقت خانقاہانہ زندگي کا نظام ہی اس ترتیب کا واقع ہوا تھا کہ

غرور و پندار کا شائبہ تک نہ رہنے پائے اور اس کی جگہ تواضع و تذلل لے لے۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ انسان رحیم، خلیق و فیاض طبع ہو اور منکسر و متواضع مطلق نہ ہو۔ مگر یہ ممکن نہیں کہ انسان میں انکسار و تواضع ہو مگر رحم، خلق و فیاضی نہ ہو۔ اس بنا پر اس جذبہ کو اُم الفضائل کہنا چاہئے۔ اور یہی خیال کرکے مسیحیت نے اس پر اتنا زور دیا۔ چنانچہ اس کا یہ نتیجہ تو بہر حال دیکھنے میں آیا کہ خانگی و معاشری زندگی سے قطع تعلق کرکے خانقاہوں میں نظر بند ہو کر رہنے سے جو شقاوت، تعصب و سنگدلی، راہبوں کے دل میں پیدا ہو جانی چاہئے وہ نہیں پیدا ہونے پائی۔

لیکن یہ وصف بھی گو ایک زمانہ تک نہایت موزوں و مناسب رہا، تاہم تمدن کی روز افزوں رفتار کا آخر تک ساتھ نہ دے سکا۔ ترقی تمدن کے لئے لازمی ہے کہ قوم میں خود داری ہو اور حریت کے جذبات موجود ہوں۔ اور انکسار و تواضع اس کے دشمن ہیں۔ خانقاہانہ طرز زندگی کا مثل فوجی طرز زندگی کے اقتضا یہ ہے کہ استبدادی حکومت ہو۔ تاہم سپاہیوں میں تو پھر بھی فی الجملہ خودی و خود داری موجود ہوتی ہے۔ لیکن اسے بالکل مٹا دینا جو خانقاہانہ زندگی کا مطمح نظر تھا۔ کسی طرح ترقی تمدن کے حق میں مفید نہیں پڑ سکتا تھا۔ اور پھر بڑے بڑے زاہدوں میں تو اس جذبہ سے اور فضائل پیدا ہوتے بھی رہتے ہیں۔ لیکن عوام میں تجربہ سے معلوم ہوا کہ انکسار بالکل غلامانہ زندگی کے مرادف ہو جاتا ہے۔ اسی کو دیکھ کر متاخرین حکماء اخلاق نے بجائے انکسار کے خودی پر زیادہ زور دیا اور

اس کے دو مظاہر ہیں۔ ایک مردانگی دوسرے خود داری انہیں پر زور دینے کا یہ نتیجہ ہوا کہ پروٹسٹنٹ ممالک میں جو صاف گوئی آزاد خیالی ' خوش معاملگی ' بلند حوصلگی ' غیرت وحمیت اور عالی ظرفی نظر آتی ہے وہ کتھولک علاقوں میں نہیں پائی جاتی - بلکہ ان کے بجائے یہاں دنائت ' پست ہمتی ' کم ظرفی ' بزدلی و گداگری کے مناظر سامنے آتے ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اول الذکر میں سیاسی حریت کی جو جلوہ آرائیاں ہیں اُن سے آخرالذکر یکسر خالی ہیں —

فصل (۱۲)

خانقاہیت کا تعلق فضائل عقلی کے ساتھ

یہ فضائل عقلی کیا ہیں ؟ فضایل اخلاقی کا مفہوم تو ہر شخص جانتا ہے - لیکن یہ فضائل عقلی کیا معنی ؟ اس سے ہماری مراد یقین و اعتقاد کی دیانت داری اور ضمیر کی آزادی سے ہے - ذہن کو ہر قسم کے تعصبات و جذبات شدید کی گرفت سے آزاد رکھنا راہ صداقت پر بلا خیال نتائج عملی قایم رہنا اور مقدمات کی شہادت جن نتائج پر پہنچائے اُنہیں کو اختیار کرنا خواہ اس سے کسی جذبہ کو کتنا ہی صدمہ پہنچے ' یہ سب فضیلت عقلی کے مفہوم میں داخل ہے - اس کو اختیار کرنا دنیا کے دشوار ترین کاموں میں سے ہے اور اگر کوئی مذہب یا اصول اخلاق ' ضمیر کی آزادی

کو سلب کرنا چاهتا هے - یا بعض جذبات کی پاس داری کے خیال سے عقل و شہادت کی قوت کو محدود کرنا چاهتا هے تو وہ یقیناً فضیلت عقلی کا هادم هے —

قدماء کے هاں قوانین استقراء اگرچه اس قدر منضبط نه تهے ' تاهم آزادی ضمیر کا پورا احترام تها - بے شبه اُن کے هاں بهی حکومت کی طرف سے بعض قوانین اس قسم کے نافذ تهے که فلاں فلاں مراسم مذهبی کی پابندی لازمی هے - یا بعض ایسے نظامات فلسفه کی جو صریحاً اخلاق شکنی کی طرف لے جاتے تهے - اشاعت بهی حکماً بند کر دی گئی تهی - تاهم اس طرح کی مثالیں صرف بطور مستثنیات کے ملتی هیں ورنه عموماً آزادی رائے کی حریت سب کو مسلم تهی - رائے کی غلطی کسی کے نزدیک معصیت نه تهی ' بلکه جو لوگ بکمال جرأت و بے خوفی ' علمی مسائل کی تحقیق میں مصروف رهتے تهے ' اکثر وهی سب سے زیادہ معزز و محترم سمجهے جاتے تهے - اور بت پرستانه مذهب خواہ اور کتنے هی معائب کا مجموعه هو - تاهم اس میں یه تین صفات تو اعلی درجه کی موجود تهیں تخیل ' وطنیت اور رواداری - یه عقیدہ که اس نظام کائنات کی کنجی دیوتاؤں کے هاتهه میں هے ' جو انسان سے بدرجها قوی مگر به لحاظ نوعیت اس کے بالکل مشابه هیں تخیل کو کتنا متاثر کرنے والا تها ! اسي طرح مذهب کی بنیاد قومیت پر رکهنا اور مذهبی مراسم کو ملکی فرایض سے بالکل مخلوط کر دینا یقیناً جذبه وطنیت کو مستحکم کر دیتا تها - یا پهر اسی طرح یه مسئله که مختلف اقسام کے دیوتا هیں جو مختلف طرق عبادات سے خوش هوتے هیں ' رواداری کا سنگ بنیاد تها - اور واقعه یه هے که روما میں جو مختلف ادیان

کی بجائے خود ایک نمایش گاہ بن گیا تھا - حریت فکری اپنے منتہائے شباب پر تھی، ہر شخص اپنے ضمیر و رائے کا مختار تھا - صد ہا قسم کے مختلف معتقدات و خیالات شائع تھے - اور مشککانہ تحقیق و تنقید کو عیب نہیں - بلکہ ایک خاص وصف سمجھا جاتا تھا —

یہ حال قدماء کا تھا - لیکن ہمیں گزشتہ صفحات میں معلوم ہوچکا ہے کہ کلیسا کی وسعت اقتدار کا ایک خاص سبب اس کا غیر مسئولانہ ادعا تھا اور زود اعتقادیوں کے دور میں اس کا بڑا کارنامہ یہ تھا کہ وہ اپنے متبعین سے اپنے احکام کی بیچوں و چرا تعمیل کراتا تھا - اس طرز عمل کا نتیجہ یہ ہوا کہ احکام شریعت پر کورانہ عملدر آمد کا رواج عام ہو گیا اور شک و اعتراض ایک جرم قرار پا گیا اسی سلسلہ میں ہم اس مغالطہ کو بھی کھولے دیتے ہیں جو رائے کی غلطی کو اخلاقی جرم قرار دینے کا باعث ہوا - عقلی حیثیت سے دیکھے تو کسی رائے یا عقیدہ کو اخلاقی جرم قرار دینا سرے سے بے معنی ہے ہم نے مانا کہ کوئی شخص مہمل سے مہمل عقاید کا قایل ہے - کوئی شخص مثلاً یہ کہتا ہے کہ جزو کل سے بڑا ہوتا ہے یا ایک خط مستقیم سے دائرہ بن سکتا ہے تو یہ عقاید خواہ کتنے ہی مہمل و مضحک ہوں لیکن اخلاقی معصیت ان میں کہاں سے پیدا ہوسکتی ہے ؟ کسی عقیدہ کو بجائے خود معصیت قرار دینا ایسا ہی ہے جیسا کہ آواز کو رنگین قرار دیا جائے - یہ بے شبہ ممکن ہے کہ کسی رائے یا عقیدہ کے عملی نتائج اخلاق شکن ہوں، لیکن اس سے نفس اس رائے یا عقیدہ کو تو مجرمانہ نہیں کہہ سکتے —

یہ ایک عام کلیہ ہے - مگر دو صورتیں ہمارے نزدیک ایسی ہیں جو جادۂ اخلاق کی خلاف ورزی سے غلطی رائے کی طرف منجر ہوتی ہیں :—

(۱) اول یہ کہ غلط رائے عموماً ضمیر کی بد دیانتی سے پیدا ہوتی ہے - دنیا میں اس طرح کے منافقین بہت کم ہوتے ہیں جو دیدۂ و دانستہ ایک رائے کو غلط سمجھ کر پھر بھی اسے صحیح ظاہر کرتے رہیں لیکن اس طرح کے منافقین ہمیشہ اور ہر جگہ بہت کثرت سے موجود رہتے ہیں - جو تحقیق و تلاش کی محنت و تکلیف سے جی چراتے ہیں جو کاہلی و آرام طلبی کے باعث اپنے سابقہ تخیلات و معتقدات پر قانع رہا کرتے ہیں اور اپنے مخالف واقعات و شواہد سے بالکل چشم پوشی کئے رہتے ہیں اس خوف سے کہ کہیں ان کے جذبات پارینہ کو صدمہ نہ پہنچے —

(۲) دوسری بات یہ ہے کہ انسان کی سیرت و افتاد طبیعت کا اس کے خیالات و معتقدات پر بے حد اثر پڑتا ہے - بلکہ اگر ہم کسی شخص کے مزاج و سیرت سے پوری واقفیت رکھتے ہوں تو یہ تقریباً وثوق کے ساتھ بتا سکتے ہیں کہ یہ فلاں مسئلہ میں فلاں رائے کا قایل ہوگا جو لوگ قدرتاً عالی ہمت، عالی ظرف، شجاع و بلند حوصلہ ہوتے ہیں وہ ایسے ہی مذہب یا مسلک فلسفہ کی تعلیمات کی تلاش میں رہتے ہیں، جن سے ان کے ان جذبات کو ابھرنے کا موقع ملے - بخلاف اس کے جن لوگوں کے مزاج میں سرد مہری، دنائت، تنگ نظری و

بزدلی ہوتی ہے وہ اپنے مذاق و مزاج کے موافق مذہب فلسفہ کی تلاش کرتے ہیں - اور یہ تو بہ کثرت دیکھنے میں آتا ہے کہ سیرت و مزاج کے بدلنے سے انسان نے اپنا مذہب و اخلاق بدل دیا ہے - نیز یہ کہ رائے و خیال کا تغیر ، تغیر سیرت کا باعث ہوا ہے - غرض یہ کہ اکثر صورتوں میں طینت کی خرابی رائے کی غلطی کا سبب ہوتی ہے —

بہر حال ان دو صورتوں میں انسان کی طینت و سرشت کا اثر اس کے اخلاق و مذہب پر بہت کافی پڑتا ہے - ان میں سے پہلے نقص کی اصلاح کی کلیسانے کبھی کوشش نہیں کی بلکہ جہاں تک ممکن ہوا اس نے قوانین استقراء کے انضباط اور تشکیک و تنقید کا ہمیشہ سدباب ہی کرنا چاہا - حالانکہ علمی ترقیوں کا سنگ بنیاد بھی تشکیک و بے اطمینانی ہے - لیکن اگر قدماء کے قایم کردہ اصول پر قانع اور لکیر کا فقیر بنا رہتا تو آج سائنس کا کیا حال ہوتا ؟ کینٹ و ہیوم اپنی تشکیک سے اگر فلسفی دنیا میں تہلکہ نہ ڈال دیتے تو آج فلسفۂ جدید کا کہیں بھی وجود ہوتا ؟ دیکھو والٹیر ، نیبور ، ولیوس اگر قدیم مؤرخین کے نتائج تحقیقات کی طرف سے غیر مطمئن نہ ہوتے ، تو آج تاریخی نتائج کے مواد میں کچھ بھی اضافہ ممکن تھا ؟

البتہ شق دوم کی طرف مسیحیت نے پوری توجہ کی اور رائے و خیال پر سیرت و طینت کی اہمیت اثر کا کلیسا کو ہمیشہ اعتراف رہا ، اور در حقیقت یہی ایک شے تھی جس نے ایک بڑی حد تک اس کی تعلیمات میں تعصب و عدم رواداری کو جگہ دیدی - وہ اپنے اتہام میں ایک

خاص قسم کی سیرت دیکھنا چاہتا تھا اور اس راز سے آشنا تھا کہ جب تک وہ سیرت قایم ہے انسان کے معتقدات بھی ایک خاص نہج پر رہیں گے ۔ اس لئے اُس نے اس مخصوص سیرت کو قایم رکھنے کی پوری کوشش کی اور متعصب ارکان کلیسا کے ہاتھہ میں پڑکر اس کوشش اصلاح نے تعصب و عدم رواداری کی شکل اختیار کرلی - چند مخصوص اعتقادی و تاریخی مسائل کو حقایق فطری کے مرتبہ پر رکھہ دیا گیا ، جن پر بحث و شک کرنا دائرہ مسیحیت سے خارج ہو جاتا تھا —

یہ تو تعلیمات تھیں - عمل یہ تھا کہ رواداری و مسالمت کا کہیں نام و نشان نہیں باقی رہنے پایا تھا - آج بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ اُس وقت (یعنی قسطنطین کے زمانہ) سے بجائے ملکی جوش قومیت و وطنیت کے عام انسانی ہمدردی پھیل گئی تھی - لیکن یہ خیال قطعاً واقعات و تاریخی شہادت کے مخالف ہے - زوال رومہ کے وقت اخوت انسانی کا جذبہ دلوں میں پیدا ہو رہا تھا - لیکن مسیحیت نے اس کی جگہ محبت و الفت کی بنیاد تمامتر ہم مذہبی پر رکھی - جو لوگ عیسائی نہیں وہ سب ملعون ، جہنمی و قابل حذر ہیں - اول اول یہ خیال صرف عیسائیوں اور غیر عیسائیوں کے تعلقات پر محدود رہا - اُس کے بعد رفتہ رفتہ عیسائیوں میں جو آسنی - نوے فرقے پیدا ہوگئے خود اُن میں سے ہر ایک اپنے طرز عمل میں دوسرے کے ساتھہ اسی اصول پر عمل کرنے لگا - یہاں تک کہ ایک فرقہ کا ہر شخص دوسرے فرقے کے اشخاص کے سایہ سے بھاگنے لگا - اور ان فرقہ بندیوں کی بنیاد اس طرح کے اختلات

مسائل پر ہوتی تھی کہ مثلاً ایک گروہ کہتا تھا کہ خدا اور مسیح متحدہ الماہیت ہیں - دوسرا کہتا کہ نہیں مشترک الماہیت ہیں - ان جزئی موشگافیوں سے جو اختلاف پیدا ہوتا تھا - اُس کی بنا پر اس قدر سخت ہنگامہ آرائی ہوتی تھی کہ شہر میں سخت بلوہ ہوتے اور کثرت سے کشت و خون ہوتا - ایک موقع پر شہر قسطنطنیہ کے بلوہ میں ۳۰۰۰ آدمی کام آئے - ایک بادشاہ نے ایک مرتبہ ۸۰ پادریوں کو دریا میں غرق کردیا - ایک مقتدر پادری نے ایک بار فریق مخالف کی بیواؤں پر تازیانے لگوانے شروع کئے اور بن بیاہیوں کو برہنہ کرکے آگ پر کڑھاؤ چڑھا کر ان میں ڈال کر تل ڈالا - ایک مشہور عالم و فلسفی خاتون ' ہاپیشیا ' پر اعتزال و بے دینی کی فرد جرم لگاکر اُسے ایک گرجا میں قتل کیا گیا - اس کا برہنہ جسم سڑکوں پر گھسیٹا گیا اور پھر اُس کے ٹکڑے ٹکڑے کرکے اُسے آگ میں ڈال دیا گیا کتھولکوں کو جب مصر پر فتح حاصل ہوئی تو کئی دن تک ملک قتل و غارت کا ہدف بنا رہا - اسکندریہ ' یروشلم و قسطنطنیہ بارہا مختلف مسیحی فرقوں کی دست درازیوں کا شکار ہوتے رہے - خصوصاً قسطنطنیہ پر تو سب سے زیادہ مصائب نازل رہے - تیسری صدی سے یہ ہوا چلی کہ مخالف جماعتوں کے طریق عبادت کو قانوناً روکا جائے یہاں تک کہ کچھ روز میں بالکل بے ضرر مشرکانہ عبادتوں کو بھی روک دیا گیا اور مشرق کی بہتر سے بہتر تعمیری صناعیاں اور یونان کی بہتر سے بہتر نقاشیاں بکمال بیدردی خاک میں ملادی گئیں —

ان مذہبی و قانونی کار روائیوں کے علاوہ جو لٹریچر

اُس وقت شائع ہوتا تھا وہ اپنے لہجہ کی درشتی کے لحاظ سے اپنا نظیر آپ ہی قرار دیا جاسکتا ہے - اس زمانہ کی مناظرہ و کلام کی کتابیں اُٹھاکر دیکھئے سخت کلامی و سب و شتم سے مملو ملیں گی ۔ جن میں ہر فریق اپنے مخالفین کو شیاطین و ملاعنہ کے لقب سے یاد کرتا ہے - اُن کی موجودہ مصیبتوں کو خدائی تازیانہ سے تعبیر کرتا ہے اور بہ کمال خباثت نفس ، عقبیٰ میں اُن کی تعذیب و عقوبت کے تصور سے اپنا کلیجہ ٹھنڈا کرتا ہے - سینٹ ، بیسل وغیرہ دو چار مستثنیات کو چھوڑ دیجئے جو قدماء مشرکین کی جائز مدح و ثنا سے دریغ نہیں رکھتے تھے - باقی علی العموم اُن کے لئے گویا زبان میں کوئی کلمۂ خیر تھا ہی نہیں جس وقت ہم اس لہجہ کا مقابلہ ' یونانیوں ' و ' رومیوں ' کے اُس لہجہ سے کرتے ہیں جو وہ اپنے مخالفین کے مقابلہ میں اختیار کرتے تھے تب ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ' یونانیوں ' و ' رومیوں ' کے اخلاق کا پایہ کس قدر بلند اور اُن میں کیسی فراخ دلی تھی اور ان کے مقابلہ میں اُس وقت کے مسیحی گویا چھچھورے پن اور تنگ نظری کا نمونہ تھے —

فصل (۱۳)

خانقاہیں بطور خزاین علم کے

مغربی خانقاہوں نے جس زمانہ سے اپنے علمی و تعلیمی

فرائض کو ادا کرنا شروع کیا - یہ وہ زمانہ تھا جبکہ کتھولک ازم کا اقتدار تقریباً مسلم ہوچکا تھا اور جوش مناظرہ سرد پڑچکا تھا تاہم کلیسا کے ذریعہ سے اشاعت و تحفظ علوم میں جتنی کوششیں ہوئیں سب خانقاہیت کے اثر سے ہوئیں - آج یہ قیاس کرنا دشوار ہے کہ اگر کتھولک ازم کا وجود نہ ہوتا تو اب تک علمی زندگی کس اسلوب پر قائم رہی ہوتی لیکن یہ ایک واقعہ ہے کہ کتھولک ازم کے زیر اثر خانقاہوں ہی نے علم کی مشعل کو روشن رکھا - دو چار سال تک نہیں صدیوں تک علوم کی تاریخ بیان کرنا ہمارا مقصود نہیں البتہ تاریخ اخلاق کی ضمن میں ہم یہ بتا سکتے ہیں کہ خانقاہیں اپنے ان فرائض کو کیونکر اور کہاں تک انجام دیتی رہیں —

سب سے پہلا سوال اس بحث میں یہ پیدا ہوتا ہے کہ گرجا نے علوم قدیم کی محافظت کہاں تک کی ؟ یہ تو ہم بیشتر کہہ ہی آئے ہیں کہ اس باب میں خود کلیسا کے اندر مختلف خیالات تھے ایک گروہ جس کا سردار ترتولین تھا مشرکین کی تصانیف کو سخت نفرت کی نظر سے دیکھتا تھا - دوسرا گروہ جس کے مشاہیر ارکان - جسٹن مارٹر ، کلیمنٹ آف الگزنڈریا و اریجن تھے - اس کے بالکل برخلاف ان کے ساتھہ کمال عقیدت و شیفتگی رکھتا تھا - بلکہ انہیں محرف مسخ شدہ الہامی کتابیں قرار دیتا تھا - ایک اور گروہ ان دونوں کے بین بین تھا - اس کا سر گروہ سینٹ آگستاین تھا جو یہ اعتراف کرتا تھا کہ معصیت سے اجتناب کا خیال اسے اول اول سسرو کی ایک تحریر سے پیدا ہوا - جولین نے قدما کی

تصانیف کی تعلیم روکنا چاہی - لیکن اس کی جس قدر پر جوش مخالفت ہوئی اس نے صاف ثابت کردیا کہ اس وقت کے معتقدایان مسیحیت انہیں کتنا عزیز رکھتے تھے پھر فلاطونیت جدیدہ کی اشاعت، ہزارہا آدمی کا برائے نام اصطباغ، اور کچھہ اس جوش و خروش میں کمی، جو فارغ البالی و خوش حالی کا لازمی نتیجہ ہے - ان سب چیزوں نے مل کر اور اس کی تائید کی - بلکہ سانیسیس نے تو پادری ہوکر یہ غضب کیا کہ اپنے تئیں نہ صرف ایک مشرک فاضلہ ہاپیشیا کا معتقد ظاہر کیا بلکہ مسئلہ روح میں بالکل فلاطون کا ہم آہنگ ہوگیا اگر کہیں یہ معتقدایان کلیسا کی آزاد خیالی عام ہوگئی ہوتی تو مسیحیت کی رفتار کا رخ پلٹ گیا ہوتا - لیکن ایسا ہونا مقدر میں نہ تھا - نجات مخصوص کا عقیدہ، رومی علماء شریعت کا جمود، فلسفی الطبع یونان سے رومہ کی مذہبی و سیاسی بے تعلقی، بربریوں کا حملہ، اور ان کا قبول مسیحیت وغیرہ متعدد و پیہم واقعات نے کتھولک عقائد کو بالآخر غالب کردیا - اس وقت سے حریت فکری کا خاتمہ ہوگیا اور بعز چھٹی صدی کی ایک آدہ استثنائی مثال کے اب علم و ادب تمام تر عبارت رہ گیا سواعظ و سوانح شہداء سے دور دراز ملکوں میں کچھہ عرصہ تک آثار حیات قایم رہے - مثلاً سیویل میں ایک اسکول ساتویں صدی میں موجود تھا اور آئر لینڈ کی خانقاہوں میں شاید اس کے بھی چند سال بعد تک علم کے چرچے رہے ورنہ عام حالت کے لحاظ سے تو اب سارے یورپ پر علمی موت طاری تھی اور یہ جمود برابر قایم رہا تا آنکہ ابیلارڈ کی عقلیت و محاربات صلیبی نے اس قالب مردہ میں از سر نو روح پھونکی - اس ساری مدت میں

کتھولک ازم کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ لاطینی زبان کو اُس نے ایک مقدس زبان کی طرح زندہ رکھا - یونانی زبان تو گویا مردہ ہوچکی تھی ' حالانکہ یونان سے آمد و رفت کے تعلقات کبھی منقطع نہ ہوسکے - اور لاطینی زبان جو زندہ تھی اس کی یہ حالت تھی کہ اس کی تحصیل قطعاً ممنوع تھی اُس زبان کے قدیم مصنفین جہنم کے کندے سمجھے جاتے تھے اور قرب قیامت کے خوف سے کسی کو دنیوی علوم کی طرف توجہ کرنے کی ہمت ہی نہیں پڑسکتی تھی - راہبین و زاہدین مشاہیر مصنفین روما مثلاً ورجل ' ہوریس وغیرہ کا ذکر انتہائی اہانت و تحقیر سے کرتے تھے —

خانقاہیں اُس زمانہ میں کتب خانوں کا کام ضرور دیتی تھیں - لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا ہمارے نزدیک صحیح نہیں کہ اگر خانقاہیں نہ ہوتیں تو کہیں کتب خانے قائم ہی نہ ہوتے اور اگر آخر میں کوئی یہ جتائے کہ راہبین کس محنت و جانفشانی کے ساتھ اپنے ہاتھوں سے کتابوں کی نقلیں کر کر کے سرمایۂ علوم کو محفوظ رکھتے تھے تو ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ وہ کس دیدہ ریزی کے ساتھ قدیم صفحات سے حروف کو مٹا مٹا کر اپنی مزخرف داستانیں اُن پر تحریر کرتے تھے —

البتہ ایک بات ضرور ہے جس میں دور خانقاہیت کے مصنفوں کو موجودہ مصنفین پر فضیلت حاصل تھی اور وہ وہ سکون ' اطمینان خاطر ' و یکسوئی تھی جو آج کل کے مصنفوں کو خواب میں بھی نہیں نصیب ہوتی آج کل ہر وقت جو یہ فکریں ہجوم کئے رہتی ہیں کہ کتاب کیونکر طبع ہو ؟ کیسے شائع ہوگی ؟ لوگوں

میں مقبول ہوگی ؟ اس سے شہرت و ناموری میں اضافہ ہوگا ؟ کوئی اس کا جواب یا رد تو نہ لکھے گا ؟ اُس دور کا مصنف ان افکار و پریشانیوں سے بری رہتا تھا اُس کی اُمیدیں و توقعات تمام تر عقبیٰ کے اجر و نفع سے وابستہ رہتی تھیں - اُسے دنیوی مقبولیت و ناموری کی کیا پروا ہوسکتی تھی ؟ پھر بعض دفعہ یہ بھی ہوتا تھا کہ علم و ادب کو مذہب کی طرف سے تحریک ہوتی تھی - مثلاً مشہور اینگلوسیکسن شاعر کیڈمن کی بابت منقول ہے کہ ابتداً اُس سے کسی طرح نظم نہیں کہی جاتی تھی - یہاں تک کہ ایک روز خواب میں اسے بشارت ہوئی کہ " اُٹھ اور حمد باری میں کلام موزوں کر " اُس وقت سے وہ شعر کہنے لگا اور بہترین شاعر اپنے ملک کا ہوگیا - یا ایک مرتبہ ایک بد شوق لڑکا والدین و اُستاد کی سخت گیریوں سے تنگ آکر گھر سے نکل گیا - راستہ میں ضعف و ماندگی سے نڈھال ہوکر ایک کنوئیں کے سامنے بیٹھ گیا جس پر ایک لڑکی پانی بھر رہی تھی - اتنے میں اُس کی نظر کنوئیں کی جگت پر پڑی جو ایک جگہ سے گھس گئی تھی - اس نے لڑکی سے اس کا سبب پوچھا اُس نے جواب دیا کہ روز رسی کی رگڑ لگتے لگتے یہ اتنی گھس گئی - لڑکے کو اس " القاے ربانی " پر معاً تنبہ ہوا اور اس نے اپنے دل میں کہا کہ جب پتھر کی سل رگڑ کھاتے کھاتے گھس جاتی ہے تو میں تو انسان ہوں میں کیوں نہیں متواتر کوشش سے تحصیل علم کرسکتا ہوں - چنانچہ وہ گھر واپس آیا اور اتنی ریاضت کی کہ موت کے وقت وہی بد شوق لڑکا اسپین کا مشہور سینٹ آلیڈور کہلایا - ایک راہب صاحب جنھوں نے

اپنی زندگی بدکاری میں بسر کی تھی - جہلم میں جھونکے جارہے تھے ، مگر محض اس بنا پر بچ گئے کہ ان کے گناھوں کا شمار اُن حروف سے نہیں بڑھنے پایا ، جن کی انھوں نے ایک مذھبی تصنیف میں کتابت کی تھی ۔ اسی طرح ایک اور راھب کی قبر جب ۲۰ سال کے بعد کھول کر دیکھی گئی تو پایا گیا کہ اور سارا جسم سڑ گل گیا ہے - لیکن ھاتھہ جس میں وہ قلم لیتا تھا بدستور اپنی حالت پر ہے - یا پھر ایک مرتبہ ایک مصنف کے انتقال کے روز رات کے وقت پڑوس کے خانقاہ کی ایک راھبہ کی آنکھہ دفعتاً ایک تیز روشنی سے کھل گئی ۔ وہ سمجھی کہ دن نکل آیا - مگر اُٹھی تو معلوم ھوا کہ ابھی رات ہے - مگر سامنے ایک نور مجسم خاتون بیٹھی ھیں - جن کے چہرہ کی ضیا سے اُس مصنف کی قبر منور ہے اتنے میں قبر کے اندر سے ایک سفید براق قمری نکلی جسے اُس خاتون نے اپنے سینہ سے لگایا لیا - بعد کو معلوم ھوا کہ یہ خاتون خود جناب مریم تھیں جو اُس مصنف کی روح کی تقدیس کے لئے آئی تھیں کیونکہ جو مصنف و عالم اپنی زندگی صبر و تقویٰ کے ساتھہ گزارتا ہے اُسے درجۂ شہادت نصیب ھوتا ہے —

لیکن ان افسانوں کی خوشنمائی و دلفریبی ھمیں اس حقیقت کے اظہار سے باز نہیں رکھہ سکتی کہ کتھولک عروج کا زمانہ بحیثیت مجموعی تاریخ کے تاریک ترین زمانوں میں ھوا ہے ۔ اس وقت دنیا سے مسیحیت کی تمام قوتیں علوم عالیہ و فنون نافعہ سے قطعاً بیگانہ اور فقیہانہ موشگافیوں کی طرف یکسر متوجہ تھیں - جو شخص کسی واقعۂ طبعی ، فلسفی مسئلہ کی تحقیق کرنا چاھتا اُس پر

سحر، الحاد یا بیدینی کا الزام لگا کر اُسے خاموش کر دیا جاتا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ تحقیق و تنقید کے ہر طریقہ پر مسیحیت نے بالکل مہر لگا دی تھی - کسی مسئلہ میں شک کرنا موافق و مخالف دونوں دلائل کو سن کر رائے قایم کرنا کسی عقیدہ کے لئے دلیل طلب کرنا کسی مسئلہ پر خالی الذھن ھو کر غور کرنا یہ سب ممنوع قرار پا گیا تھا - اب اگر کوئی غلط واقعہ انسان کے ذھن نشین ھو گیا ھو اس کی تصحیح آسانی سے ھو سکتی ھے - اگر کسی غلط اصول استدلال کا رواج پڑ گیا ھو اس کی بھی اصلاح ممکن ھے - گو بہ دقت - لیکن جب سرے سے تحقیق و تنقید، غور و فکر ھی کو حرام بلکہ کفر قرار دے دیا گیا تو اس کا علاج کس کے بس میں ھے؟ یہی وجہ ھے کہ جہالت، توھمات، ضعیف الاعتقادیوں کی گھٹا یورپ پر صدھا برس تک چھائی رھی - تا آنکہ جب سررشتۂ تعلیم کی باگ خانقاھوں کے بجائے کالجوں اور یونیورسٹیوں کے ھاتھہ میں آ چکی - مسلمان سائنس کی اشاعت کر چکے - قدماء یونان و روما کی تصانیف علمی بیداری پھیلانے لگیں اور اس سرے سے اُس سرے تک تجارتی و کار و باری آزادی پھیل چکی، تب کہیں جا کر یہ ظلمت دور ھوئی —

میں خوب جانتا ھوں کہ میرا قرون وسطیٰ کی ذھنی زندگی کی اس قدر بد نما تصویر پیش کرنا بہت سے لوگوں کے ملال کا باعث ھو گا - اس وقت متعدد جماعتیں ایسی موجود ھیں جو مختلف اسباب کی بنا پر قرون وسطیٰ کی حمایت پر آمادہ ھیں - مثلاً کچھہ لوگ اُس زمانہ کی خوش اعتقادیوں کی بنا پر کچھہ آثار قدیمہ کے سہارے پر کچھہ اس غلط تاریخی کلیہ کی بنا پر کہ ترقی

کے بعد تنزل محال ہے اور پھر کچھ لوگ کتھولک ازم کے استبداد سے خوش ظنی کی بنا پر - غرض کسی نہ کسی تاریخی غلط فہمی کی بنا پر متعدد جماعتیں ایسا خیال رکھتی ہیں - لیکن میرے نزدیک ان کی یہ مدح و ستایش ہمیشہ مغالطات پر مبنی ہوتی ہیں - ذیل میں ہم اس قسم کے چند عامتہ الورود مغالطات کو صاف کئے دیتے ہیں —

(۱) پہلا مغالطہ یہ ہے کہ " چوں‌کہ ایک مدت دراز تک یورپ کی علمی زندگی خانقاہوں میں محدود رہی لہذا اگر خانقاہوں کا وجود نہ ہوتا تو آج علوم کا بھی پتہ نہ ہوتا " - ہمارے نزدیک اس استدلال کا مقدمہ اگرچہ بالکل صحیح ہے تاہم نتیجہ قطعاً غلط ہے یہ بےشبہ صحیح ہے کہ ایک مدت تک خانقاہوں نے تحفظ علوم میں بڑا کام کیا ، لیکن مشرکوں کے زمانہ میں علوم کی اشاعت بہت دور دراز ممالک میں ہوچکی تھی - مصر و ایشیائے کوچک گویا مراکز تمدن تھے - یونان سے بھی علم رخصت نہیں ہوا تھا - اسپین ، گال و برطانیہ میں معلمین و کتب خانوں کی افراط تھی ناربوں ، آریس ، بوردر ، تولو ، لبانس ، ارسیلز ، پوایتزز ، وترپوس کے مدارس کی خاص طور پر شہرت تھی سنہ ۳۷۶ میں مسیحی فرمان روا گریشین نے گال میں وہی قانون جاری کیا جو انٹو نانیس کے وقت میں اٹلی میں ہوا تھا - یعنی یہ کہ ہر بڑے شہر میں حکومت کی طرف سے معلمین کو وظایف ملتے رہیں پس لاطینی لٹریچر کی اس قدر وسیع اشاعت کے بعد کون ذی‌عقل اسے تسلیم کرسکتا ہے کہ سخت سے سخت حالات مخالف بھی اسے دنیا سے فنا کر سکتے تھے ؟ اگر کتھولک ازم

نہ اُٹھہ کھڑی ہوتی تو کوئی دوسرا طریقہ تحفظ علوم کا نکل آتا - پھر خدمت علم کی بھی دو صورتیں ہیں - ایک تحفظ و بقائے علوم دوسرے اضافہ علوم - ظاہر ہے کہ ان میں سے دوسرا طریقہ بدرجہا بلند و ممتاز ہے - لیکن راہبان خانقاہ نے زیادہ سے زیادہ صرف پہلی صورت پر قناعت کی اور دوسرے طریقہ کو ہاتھہ لگانا ہمیشہ گناہ سمجھتے رہے - قدماء کے ذخائر و خزائن کو محفوظ رکھنے کی جو کوششیں انھوں نے کیں، بے شبہہ ہم ان کے لئے ان کے بہت ممنوں ہیں - لیکن یہ بہت مشتبہ ہے کہ ان کی یہ خدمت کبھی اُن کے ان معاصی کا کفارہ کر سکتی ہے کہ انھوں نے حریت فکری کا خاتمہ کر دیا - غور و فکر کا سد باب کر دیا اور تحقیق و تنقید کو ممنوع قرار دیدیا —

(۲) اسی مغالطے کا کسی قدر مختلف پیرایہ میں یوں بھی اظہار کیا جاتا ہے کہ "صدیوں تک جتنے علماء پیدا ہوتے رہے وہ سب کے سب فقہا و مقتدایان شریعت ہی تھے - پس اگر انھوں نے ادھر توجہ نہ کی ہوتی تو دنیا سے علم کا نام و نشان ہی مٹ گیا ہوتا" - اس طرز استدلال پر ہمیں ایک قصہ یاد آتا ہے - جو سسرو نے نقل کیا ہے وہ کہتا ہے کہ ایک قیدی اپنے ابتداء سن سے ایک تنگ و تاریک کوٹھری کے اندر نظر بند رکھا گیا تھا جس کی دیوار میں ایک شگاف تھا اور صرف وہی راستہ روشنی کا تھا - ایک مدت کی نظر بندی کے بعد قیدی کو یقین ہو گیا کہ اگر یہ دیوار گر جائے گی تو یہ شگاف بھی نہ

رهے گا - اور اس لئے اتنی روشنی بھی بند هو جائے گی - آپ کہتے هیں که جو کچھه علمی روشنی تھی وہ ان فقہا کے دم سے تھی - میں کہتا هوں که یہی ظالم تو علمی روشنی کے سدِراہ تھے - انھوں نے اگر اپنے متبعین کے قوائے عقلی کو معطل نه کر دیا هوتا تو دنیا معلوم نہیں آج کہاں سے کہاں هوتی - همیں اس سے انکار نہیں که اس جماعت نے بعض نہایت مفید علمی خدمات انجام دیں - سینٹ تامس اکوئناس و سینٹ بینڈیکٹ کے علم فضل و کمال تبحر سے کس کی مجال انکار هو سکتی هے ؟ لیکن سوال یه نہیں هے که اس جماعت نے کیا کیا ؟ بلکه یه هے که جتنا کر سکتی تھی اُس میں سے کس قدر کیا - جس قدر غیر محدود مواقع اسے حاصل تھے اُنھیں دیکھتے هوئے اس نے کتنا کام کیا ؟ دس بیس برس نہیں ' صدیوں تک یه حالت رهي که جس شخص کو ذرا بھی علمی مذاق سے مس هوتا تھا وہ راهب بن جاتا تھا - یه راهب رومه کی زبان سے واقف هوتے تھے اور بآسانی اس کے اعلیٰ علوم سے واقفیت حاصل کرتے اور پھر ان راهبوں کو هر طرح پر یکسوئی ' اطمینان و فارغ البالی حاصل رهتی تھی - ان سب حالات مساعد کو پیش نظر رکھه کر اس کا خیال کیجئے که انھوں نے جو علمی خدمات انجام دیں اُن کا کیا وزن اور کیا مرتبه هے ' جب البته اس بحث کا صحیح فیصله هو سکتا هے - پھر سب سے بڑہ کر یه که جو زمانه کتھولک علم پرستی کے شباب کا کہا جاتا هے اُس میں بھی حقیقتاً جتنے وقیع و اهم علمی کارنامے هوئے اُن کا فخر مقتدایان شریعت کو نہیں بلکه اُن افراد و جماعت کو حاصل هے جنھیں

اس حلقه سے کوئی واسطه نه تھا - مشهور عالم طبعیات راجر بیکن کہلے کو راهب تھا - لیکن واقعتاً اُس نے جو کچھه کام کیا وہ سب راهبانه قواعد و احکام کے بالکل علی الرغم کیا - بالآخر وہ اسی جرم میں قید کر دیا گیا اور ۱۴ سال کی اسیری کے بعد جب مرا هے تو اس کا نام ساحروں کے طبقه میں لیا جاتا تھا - معمل و تجربه گاهیں جو کچھه بھی تھیں وہ یا تو کیمیا سازی کی تماشا گاهیں تھیں اور یا مسلمانوں کی قایم کردہ تھیں ' قطب نما ' بارود ' و کاغذ کی ایجادیں اُسی زمانه میں هوئی هیں - لیکن کیا ان میں سے ایک شے بھی راهبوں اور خانقاہ نشینوں کی کوششوں کی شرمندۂ احسان هے ؟ هرگز نهیں - قطب نما کی ایجاد کی تو پوری تحقیق نهیں - لیکن آخرالذکر دو چیزوں کو تو قطعاً مسلمان اپنے همراہ یورپ میں لائے - اور روئی کے کاغذ کا رواج تو مسلمانوں میں سنه ۱۰۰۹ سے شروع هوگیا تھا - حالانکه مسیحی اس سے تیرهویں صدی کے آخر تک ناواقف رهے - عیسائیوں نے سب سے پہلے توپ خانه کا استعمال جنگ کریسی میں کیا - اور بارود سے اول بار سنه ۱۳۳۸ میں واقف هوئے - لیکن مسلمان اس سے گیارهویں صدی هی کے آخر میں واقف هوگئے تھے خلاصه یه که اختراع و ایجاد ' اکتشاف و اجتہاد سے قرون وسطیٰ کے مسیحی فضلاء همیشه بیگانه رهے اور تحقیق و تنقید کے شوق کو پیدا کرنا کیسا ' همیشه سے دباتے رهے —

(۳) ایک غلط فہمی کا اظہار ان الفاظ میں کیا جاتا هے

"کتھولک اِزم اگرچہ ترقی تمدن جدید کی زیادہ معین نہیں بلکہ ایک حد تک اس راہ میں حارج ہے۔ تاہم ایک زمانہ میں یہ بہت مفید رہی ہے اور جس وقت تک تمدن اس طرح پر نہیں پہنچا تھا وہ بہت کار آمد شے رہی ہے"۔ مجھے اس دعوے کی صحت میں بہت تامل ہے۔ اگر کتھولک اِزم کے اصول ترقی تمدن کے معین تھے تو انہیں ہمیشہ معین رہنا چاہئے تھا۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ ایک وقت وہ مفید ہوں اور چند روز کے بعد مضر ہو جائیں۔ میرے نزدیک وہ اصول شروع ہی سے ترقی تمدن کے مخالف تھے، البتہ شروع میں ان کی مضرت زیادہ ظاہر نہیں ہونے پائی۔ بالکل اسی طرح کہ جیسے بعض زہر اس قسم کے ہوتے ہیں کہ انسان کو ہلاک کرنے سے پیشتر اُس پر سکون و افاقہ طاری کر دیتے ہیں۔ ان کا آخری نتیجہ، ہلاک یقینی ہوتا ہے۔ البتہ وہ زود اِثر نہیں ہوتے یہی حال کتھولک اِزم کا تھا —

تمدن و شائستگی اور علم کا چولی دامن کا ساتھ ہے یہ ناممکن ہے کہ کوئی قوم جاہل رہکر متمدن ہوسکے۔ یہیں سے علم و اخلاق کے ارتباط کی بھی بنا پڑتی ہے۔ جو قوم علمی تحریک عامی زندگی کو مردہ کرتی ہے۔ ناممکن ہے کہ اس کا اثر اخلاقی زندگی پر نہ پڑے۔ اس عام جہالت نے دو طرح پر علمی زندگی کے انحطاط میں اخلاق پر مخصوص و براہ راست اثر ڈالا۔ سب سے پہلا اثر تو یہ پڑا کہ حق و صداقت کی طرف سے بے اعتنائی پیدا ہوگئی۔ بڑے سے بڑے مصنفین و ثقات مؤرخین کی تصانیف اُٹھاکر دیکھو۔ کذب و افترا، مبالغہ و اغراق،

تدلیس و تحریف کا انبار نظر آے گا یہاں تک کہ ایک موجودہ مشہور جرمن مؤرخ گھبرا کر کہہ اُٹھا کہ "مسیحی صداقت" ایک ایسا مرکب اضافی ھے جس کے مضاف و مضاف الیہ باھم قطعاً متناقص ھیں - مگر یہ عام بد دیانتی و کذب شعاری اُن لوگوں کے نزدیک چنداں معیوب نہ تھی - جن کے نزدیک نجات کا دار و مدار اخلاق و حسن و عمل پر نہیں بلکہ اعتقاد پر تھا - وہ اگر جرم کے مرتکب ہوتے تھے تو صرف کلیسا کی تائید و حمایت میں اور کلیسا کی تائید میں سب کچھہ جائز تھا -

دوسرا بڑا اثر اخلاق پر یہ پڑا کہ معاصی کا کفارہ فدیۂ زر سے ھونے لگا - شرک و مسیحیت میں ابتدا سے مابہ الامتیاز یہ امر چلا آتا تھا کہ آخر الذکر کےنزدیک طینت کی پاکیزگی و نیت کی صفائی کنج العبادت تھی - بخلاف اس کے مشرکوں کے یہاں باطنی پاکیزگی کو عبادت و مذھبیت سے کوئی واسطہ نہ تھا - یہ سچ ھے کہ خود مشرکوں کے یہاں اس کے خلاف بھی خال خال مثالیں ملتی ھیں (مثلاً سسرو، پولونیس، و متبعین فیثا غورث کے ھاں) لیکن عام حالت مشرکوں کی یہ تھی کہ کوئی شخص خواہ کتنا ھی فاسق و فاجر ھو بڑے سے بڑا مذھبی پیشوا بن سکتا تھا - مسیحیت نے شروع شروع میں اس کی شدید مخالفت کی تھی اور زھد و طاعت کو بالکل حسن اخلاق پر مشروط رکھا تھا، لیکن یہ بالکل قدرتی امر تھا کہ امتداد زمانہ سے مشرکانہ جذبات کی اس میں آمیزش ھوجائے - چنانچہ یہی ھوا - ابتداء میں اس کی بنیاد خیر و خیرات کے راستہ سے پڑی - یعنی مسیحیت نے فیاضی پر زور دینا شروع کیا اور لوگوں کے ذھن میں یہ عقیدہ جما دیا کہ جو لوگ

اس دنیا میں راہ خدا میں خرچ کرتے ہیں اُنھیں یہ سب آخرت میں واپس مل جائیگا اس عقیدہ کی بہترین شہادت ساتویں صدی کے ایک مصنف کے بیان کردہ افسانہ میں یوں ملتی ہے کہ ایک متمول مشرک نے قول مسیحیت کے بعد پادری سانیسیس کے ہاتھ میں کچھہ اشرفیاں اس غرض سے دیں کہ غربا کو تقسیم کردی جائیں اور اُس سے بطور نائب مسیح کے یہ تمسک لکھوالیا کہ عقبیٰ میں اس کا یہ قرض ادا ہو جائیگا - کئی سال کے بعد جب اُس پر حالت نزع طاری ہوئی تو اُس نے اپنے فرزندوں کو وصیت کی کہ میرے ساتھہ کفن کے اندر وہ تمسک بھی رکھہ دینا - اس حکم کی تعمیل کی گئی اور تین دن کے بعد اس نے سانیسیس کو خواب میں یہ دکھلایا کہ وہ میرا قرض ادا ہوگیا - میری قبر کھودو اُس میں رسید رکھی ہوئی ملے گی - چنانچہ سانیسیس نے قبر کھودی اور واقعتاً اُس میں مردہ کے ہاتھہ کی لکھی ہوئی رسید اس مضمون کی نکلی کہ مسیح نے میرا قرض بیباق کردیا ! —

اس خوش عقیدگی نے ترقی کرتے کرتے رفتہ رفتہ نہایت مبالغہ آمیز شکل اختیار کرلی بڑی بڑی جائدادیں خانقاہوں پر وقف کی جانے لگیں ' مزارات شہدا وبزرگان دین پر افراط سے نذر چڑھنے لگی - مختلف سیاسی و مذہبی اسباب کی بنا پر راہبین - بہترین امانت دار سمجھے جانے لگے اور صدمہ و غم ' بیماری کاہلی ' اور خوف و خطر کے ہر موقع پر نذر چڑھانا داخل فرایض ہو گیا - بلکہ اُمراء کے لئے اپنی موت کے وقت خانقاہوں کے واسطے جائدادیں وقف کرنا اس قدر لازمی قرار پا گیا کہ اس کا تارک تقریباً دائرہ مسیحیت سے خارج سمجھا جانے لگا —

ایک مشہور مورخ نے کہا ہے کہ مسیحیت کی ابتدائی تاریخ کو ہم دور ثلثہ میں رکھہ سکتے ہیں پہلا دور وہ تھا - جس میں مذہب عبارت تھا اخلاق سے دوسرا وہ جس میں مذہب مرادف تھا - جمود وتعصب و تقشف سے اور تیسرا دور وہ جو ساتویں صدی سے شروع ہوتا ہے جس میں مذہب نام تھا خانقاہوں پر صرف زر کا - کتھولک ازم کا استبداد ' ملک کی عام ناخواندگی و جہالت اور چھٹی صدی سے لے کر بارھویں صدی تک کی علمی ظلمت ان سب چیزوں کا مل ملا کر یہ نتیجہ ہوا تھا کہ جو قوت پہلے الحاد و بیدینی کے رد میں صرف ہوتی تھی وہ اب اکتساب ثروت کی طرف منتقل ہوگئی - اور بڑے سے بڑا سیہ کار بھی اپنے فسق و فجور کا کفارہ نذر و نیاز ' صدقہ و خیرات کی صورت میں دیدینا کافی سمجھنے لگا —

ادھر راہبوں نے بھی جن کا اگلا جوش اب سرد پڑچکا تھا - یہ دیکھا کہ ان کے افعال پر کوئی باز پرس کرنے والا نہیں اور دولت مند تو وہ ہو ہی چکے تھے - پھر اُنہیں متقی و محتاط رہنے کی کیا وجہ ہوسکتی تھی ؟ اب یہ کھل کھیلے اور ہر طرح پر خوب داد عیش دینے لگے ان میں کے اکثر دل سے تارک الدنیا تو پیشتر سے بھی نہ تھے - بلکہ صرف محنت و مشقت و فوجی خدمت سے بچنے کے لئے اس جماعت میں آکر شامل ہوگئے تھے - ان آسانیوں کے مقابلہ میں قیود ان کے لئے صرف یہ دو تھے :- ایک تجرد دوسرے افلاس - لیکن جب کبھی موقع ملتا تو یہ ان قیود کو توڑدینے میں کبھی تامل نہ کرتے - بلکہ آزادی کے ساتھہ عورتوں سے تعلق رکھتے اور خوب دولت جمع کرتے جاتے - تین چیزیں اس راہبانہ حب دولت کی

اور بھی معین ہوئیں ایک تو قرب قیامت کا اعتقاد خصوصاً دسویں صدی کے خاتمہ پر ' دوسرے محاربات صلیبی کہ ان مواقع پر نہایت کثرت سے پرانے عہود و مواثیق مالی کفارہ دیکر توڑے گئے - اور تیسرے وہ مہلک وبائے طاعون جس نے سارے ملک پر ہیبت و دہشت مسلط کردی تھی - ان تمام حالات کے اجتماع کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُمراء و سلاطین کی خوبیوں کا معیار تمامتر اُن کی یہی مالی فیاضیاں رہ گئیں اور جو شخص جتنا زیادہ اوقات کلیسا میں صرف کرتا - معاصر راہب مورخین کی نظروں میں اُسی قدر بہتر و با اخلاق سمجھا جاتا —

بے شبہ کوئی کلیہ مستثنیات سے خالی نہیں ہوتا - اس ظلمت کدہ میں بھی کبھی کبھی ذرات نور چمک اُٹھتے تھے - چنانچہ آیرلینڈ کے راہبین قبول وظائف میں جس استغنا کا اظہار کرتے تھے یا جن بعض خانقاہوں نے کبھی اعلیٰ سر رشتہ اخلاق ہاتھہ سے نہیں جانے دیا - یا پھر بعض راہبوں نے جس قوت و استقلال کے ساتھہ مذہبی مقاصد میں نا جائز رقموں کے لینے سے انکار کر دیا - ہم ان سے نا واقف نہیں بلکہ ان کا پوری طرح اعتراف کرتے ہیں - لیکن یہاں سوال مستثنیات کا نہیں ' بلکہ عام حالت کا ہے اور وہ ایک مسلسل داستان ہے راہبوں کی زر پرستی اور عوام کی خوش اعتقادی کی - آخر کار یہ زر پرستیاں و سیہ کاریاں اتنی بڑہ گئیں کہ ان کے خلاف رد عمل شروع ہوا - مگر اس کا آغاز کہیں صدیوں کے بعد ہوا - اُس وقت تک یہ مذہبی قزاقی اپنا کام کرچکی تھی اور مقتدایان کلیسا کے کیسہ پر ہو چکے تھے —

ہمارے نزدیک اس مذہبی تخویف و دہشت زدگی

نے جتنا کام مشرکوں کو مسیحی بنانے میں کیا تھا اس سے کہیں زیادہ اس دور خانقاہیت میں کیا - کبھی کبھی اتفاق سے ایسے بھی پادری پیدا ہوجاتے تھے • جو ان متفق علیہ مسائل کو اختلافی بنانا چاہتے تھے کہ کافروں پر عقوبت دائمی ہوگی - مسیحیت کے قبل جتنے حکماء گزرے ہیں سب جہنمی تھے اور بچے جو قبل بپتسمہ لینے کے فوت ہوجاتے ہیں عذاب ابدی کے مستحق ہوں گے - لیکن ان مشککین کی کوششیں ہمیشہ نا کام رہتی تھیں کیونکہ در حقیقت ان مسائل پر فقہا کا اجماع عام تھا اور یہ کتھولک کلیسا کا اصل الا صول تھا کہ تمام کفار بلکہ خود مسیحیوں میں کی ایک بڑی تعداد آخرت میں ایک عذاب ابدی میں گرفتار رہے گی اور عذاب بھی ایسا شدید جس کے مقابلہ میں دنیا کی تمام آلام و شداید ایک راحت ہیں • کتھو لک کلیسا کا یہ اصل الاصول بجاے خود کیا کم تھا - راہبان خانقاہ نشین نے اسے اور مبالغہ و رنگ آمیزی کے ساتھہ بیان کرنا شروع کیا سینٹ میکیریس کی بابت روایت ہے کہ ایک بار اسے جنگل میں ایک انسان کا کاسۂ سر پڑا ہوا ملا • اس نے اپنا عصا اس پر مارا جس سے اس میں قوت تکلم آ گئی • اس نے بیان کیا کہ " میں مشرکوں کے ایک بزرگ کا سر ہوں جو دنیا میں ظہور مسیحیت سے بہت پیشتر تھا اور اس لئے اب دوزخ کا کندہ ہورہا ہوں - جتنا فاصلہ زمین سے آسمان تک ہے اتنے ہی بلند آتش دوزخ کے شعلہ اٹھتے ہیں - کفار و گنہگاروں پر پشت کی طرف سے عذاب نازل کیا جاتا ہے - میری التجا صرف اتنی ہے کہ آپ کی دعا سے سامنے کی طرف سے عذاب نازل کیا جاے تاکہ

میں کم از کم اپنے رفقاء کی شکل تو دیکھ سکوں اور " مرگ انبوہ جشنے دارد " ہی کے اصول پر کچھ تسکین حاصل کر سکوں " - اسی طرح سینٹ گریگوری کی بابت مشہور ہے کہ شاہ ٹریجین کے محاسن و فضائل سے متاثر ہو کر اس نے اس کی بخشش کی دعا کی اس کی اس دعا پر خود اس کے اوپر عتاب نازل ہوا اور بالآخر جب اس نے اس کا عہد کیا کہ آئندہ کبھی اس طرح کی دعا نہ کرے گا - تب جاکر اتنا ہوا کہ ٹریجین پر عذاب میں تخفیف ہوگئی —

راہبوں نے بکمال سر گرمی چند ہی روز میں آلام و شداید جہنم کے مناظر سے متعلق اچھا خاصہ انبار پیدا کردیا جس میں سے گریگوری اعظم کی ایک تالیف خاص شہرت رکھتی ہے - مگر جو اول سے لے کر آخر تک اکاذیب و موضوعات کا مجموعہ ہے - اسی کی ایک روایت یہ ہے کہ ایک شخص استیفن نامی غلطی سے مرگیا تھا - جب اُس کی روح داور محشر کے حضور میں پیش ہوئی تو ارشاد ہوا کہ اس استیفن کی نہیں بلکہ اس کے ایک ہمنام کی روح قبض کرنے کا حکم دیا گیا تھا - چنانچہ اس کی روح دوزخ کا ایک منظر دکھائے جانے کے بعد دنیا میں واپس کردی گئی اور معاً ایک دوسرا استیفن وفات پا گیا - کوہ آتش فشاں اس نقطۂ خیال سے ابواب جہنم ہیں اور سسلی میں ان کے دہانے جو وسیع ہوتے جاتے تھے - اس کا سبب سینٹ گریگوری کے الفاظ میں یہ تھا کہ قرب قیامت کے باعث ان میں عنقریب بہت بڑی تعداد دوزخیوں کی داخل ہونے والی ہے - اسی واسطے یہ وسیع کئے جارہے ہیں - متعدد راہبوں نے مشرک

تاجداروں کی ارواح کو دوزخ میں پڑے ہوئے
مکاشفہ میں بچشم خود دیکھہ لیا تھا -
مگر آگے چل کر متاخرین راہبین نے اس باب میں
شدید مبالغہ آمیزیوں سے کام لینا شروع کیا - ان کے
سامنے سینٹ گری گوری کی داستان بھی پھیکی اور بے مزہ
رہ گئی - ساتویں صدی سے لیکر بارھویں صدی تک عذاب اُخروی
کے چشم دید حالات اس جزئی تفصیل سے بیان کئے جاتے
رھے کہ خالق کائنات کی جانب ذمایم اخلاق کا انتساب
ان سے زیادہ ممکن ھی نہیں - دوزخ کے وسط میں
شیطان ایک دائرہ نار کے اندر لوھے کی دھکتی ھوئی
زنجیروں سے جکڑا ھوا کھڑا ھوا ھے - مگر اُس کے دونوں
ھاتھہ کھلے ھوئے ھیں جن سے وہ دوزخی ارواح کو پکڑ پکڑ
کر اپنے دانتوں سے نوچتا ھے اور پھر اپنے شکم میں جو
معدن آتش ھے ڈال لیتا ھے - فرشتگان عذاب لوھے کے
دھکتے ھوئے گرز لئے ھوئے ارواح کو آگ سے برت میں
اور برت سے آگ میں ڈالتے رھتے ھیں - اس کے علاوہ عذاب
کے اور مختلف طریقے بھی ھیں - مثلاً کوئی زبان کے
بل لٹکا ھوا ھے کوئی لکڑی کی طرح چیرا جا رھا ھے -
کسی کو سانپ ڈس رھے ھیں کسی کے سر پر ھتوڑوں
کی مار پڑ رھی ھے کسی کا جسم اُبال کر کپڑے میں
نچوڑا جارھا ھے وقس علیٰ ھذا گنہگاروں کو پل صراط پر
سے گذرنا ھوتا ھے - اور آتش جہنم کو آتش دنیوی
سے وھی نسبت ھوتی ھے جو اصل جسم کو سایہ سے ھوتی
ھے - گویا یہ اُس کے سامنے اتنی بے حقیقت ھے پھر
اُس میں گندھک کی بھی آمیزش ھوتی ھے اور کسی قسم
کی روشنی نہیں ھوتی تاکہ دوزخیوں کو منجملہ اور

تکالیف کے ایک تاریکی کی بھی تکلیف برداشت کرنا پڑے *—

ہمارے موجودہ تعلیم یافتہ ناظرین ان نفرت انگیز تذکروں سے ممکن ہے کہ اُکتا گئے ہوں ۔ لیکن آج سے چند صدی پیشتر جو زمانہ تھا اُس کی یہ حالت نہ تھی اس وقت لوگ انھیں بکمال خوش عقیدگی سے سنتے تھے اور ان سے بدرجہ غایت متاثر ہوتے تھے ۔ بجز ایک پیلیجیس کی استثنائی مثال کے جو جدید سائنس دانوں کا ہم مذاق تھا اور سب کا یہ متفق علیہ اعتقاد تھا کہ آدم کے گناہ اولین کی پاداش میں دنیا پر موت ، بیماری وغیرہ جملہ عذاب نازل ہوتے رہتے ہیں ہر شخص قرب قیامت کا معتقد تھا اور شیاطین کی قوت و کار فرمائی کا ہول ہر دل میں سمایا ہوا تھا ۔ اِن معتقدات کو موثر بنانے کا سب سے چلتا ہوا گر مقتدایان فرقہ کتھولک کے ہاتھہ میں یہ تھا کہ انھیں بچوں کے ذہن میں ایام طفولیت ہی سے بٹھانا شروع کر دیتے تھے تاکہ آیندہ کبھی یہ نقوش محو نہ ہو سکیں ۔ چنانچہ وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب رہتے تھے اور اکثر ایسا ہوتا تھا کہ بیماری یا مصیبت کے وقت لوگوں کو وہی تصویریں اپنے گرد چلتی پھرتی نظر آنے لگتی تھیں جو اُن کے واہمہ میں عرصہ سے جا گزیں تھے سینٹ گری گوری کی روایت ہے کہ ایک صاحب جو بڑے عابد و زاہد سمجھے جاتے تھے مگر جو خفیہ طور پر اپنی غذا میں گوشت کا استعمال رکھتے تھے جب دنیا سے کوچ کرنے لگے تو حالت نزع

---

* اس طرح کے دہشت انگیز قصص کے بیان کرنے میں آئر لینڈ کے راہبوں کا نمبر اول ہے —

میں انھوں نے دیکھا کہ ایک مہیب اژدہا ان کے جسم کے گرد چکر مارے بیٹھا ہے اور ان کی روح قبض کررہا ہے - یا اسی طرح ایک پنجسالہ معصوم بچہ نے جس نے اپنے باپ کی زبان سے کلمات کفر سن کر انھیں سیکھ لیا تھا - مرتے وقت یہ دیکھا کہ فرشتگان عذاب اِرد گرد کھڑے ہوئے اُسے دوزخ میں لے جانے کی عجلت کر رہے ہیں - غرض یہ کہ معتقد کلیسا کی یرقانی آنکھ کو دنیا میں ہر چار طرف عذاب و عقوبت ہی کی زردی دکھائی دیتی تھی - وہ لطف و تفریح کی بے ضرر چیزوں کو مہیب ہی سمجھتا تھا - یہاں تک کہ شفق کی زردی آمیز سرخی کی وہ یہ تعبیر کرتا تھا کہ آفتاب اس وقت دوزخ کے قریب ہورہا ہے اور اس کی دہشت سے اس کا یہ رنگ ہورہا ہے —

شقاوت و قساوت کے یہ کار نامے نیرو و فیلیریس کے شایان شان ہوں تو ہوں (بلکہ سچ یہ ہے کہ ان کے سامنے نیرو کی شقاوتیں عشر عشیر کا بھی درجہ نہیں رکھتیں) لیکن ایک ایسی ذات کی طرف جسے رحمان و رحیم ، غفار و ستار کے القاب سے یاد کیا جاتا تھا اور جو ہمہ تن مرحمت و مغفرت سمجھا جاتا تھا - ان کا انتساب کسی طرح درست نہیں ہوسکتا - مگر نفس انسانی کی اس بوالعجبی کو کیا کیجئے کہ جو لوگ مشرکوں پر یہی سب سے بڑا اعتراض کرتے تھے کہ وہ اپنے معبودوں کی جانب ذمایم اخلاق کا انتساب کرتے ہیں - وہی صدیوں تک بکمال خوش عقیدگی اس خرافات کو جزو ایمان کیا ، اصل ایمان سمجھتے رہے - ہم لوگ آج کسی بڑے سے بڑے ظالم تاجدار کے انتہائی ظلم کے لئے

اس کے سوا اور کیا پیرایۂ بیان اختیار کرسکتے ہیں کہ وہ اسلاف کے جرایم کی پاداش میں اخلاف کو پشتہا پشت تک مبتلائے عذاب رکھتا تھا مگر یہ کیا قیامت تھی کہ بعینہ اس خصوصیت کو بے تکلف بلکہ فخراً مقتدایان فرقہ کتھولک اپنے معبود حقیقی کی طرف منسوب کرتے رہے - ان بزرگواروں میں ایک نہایت مشہور بزرگ پیٹر لومبرڈ ہوئے ہیں جو اس پایہ کے شخص تھے کہ ان کی تصنیف کی چار ہزار جلیل القدر فقہاء نے شروح و تفاسیر لکھیں - ان حضرت کی تصنیف کا ایک فقرہ سننے کے قابل ہے - اس مسلہ پر داد تحقیق دیتے ہوئے کہ اہل بہشت و اہل دوزخ ایک دوسرے کو دیکھتے رہیں گے ، ارشاد ہوتا ہے کہ —

"اب خاتمہ سخن پر ہمیں یہ منقح کرنا ہے کہ دوزخیوں کو مبتلائے عذاب دیکھکر بہشتیوں کو درد معلوم ہوگا یا اس سے ان کی مسرت میں اضافہ ہوگا ؟ گری گوری کا مقولہ ہے کہ اس منظر عذاب سے ہرگز ان کی مسرت میں خفت نہ ہوگی کیونکہ جب اُن کے دل میں رحم اور ترس کا جذبہ ہی نہ پیدا ہوگا پھر کیا شے اُن کی مسرت کو کم کرنے والی ہوگی - اور اگرچہ بہشتیوں کو مسرت بجائے خود بہت کافی ہوگی تا ہم جب وہ گنہگاروں کی حالت سے اپنی حالت کا مقابلہ کریں گے تو اُنہیں اور زیادہ فخر سرور حاصل ہوگا کہ وہ فضل خدا سے ان تکالیف سے محفوظ رہ گئے - پس نیک کاروں کو بشارت

ہو کہ وہ دوسروں کو مبتلائے آلام دیکھکر اپنی مسرت و راحت میں اور اضافہ حاصل کریں گے اپنی نجات پر خدا کا شکر بجا لائیں گے - اور جو لوگ کفر و معصیت میں پڑے رہے تھے - انھیں کیفر کردار کو پہنچتے دیکھکر لطف حاصل کریں گے —

اُس زمانہ میں ہر شے کی لفظی تحقیق و موشگافی کا جو خبط پیدا ہوگیا تھا اُس سے اس خرافات کی اشاعت کو اور تقویت پہنچی - ان لوگوں کے لئے یہ ناممکن تھا کہ جب تک بال کی کھال نہ نکالیں جب تک جزئی تفصیلات پر اطلاع نہ حاصل کرلیں محض "عذاب اُخروی" پر قانع رہ جائیں - ہاں تو ایک سبب اس کا یہ تھا - دوسرا یہ تھا کہ راہبانہ طرز زندگی و خلوت نشینی بجائے خود التباس حواس پیدا کرکے متخیلہ کے سامنے ایسی صورتیں پیش کر دیتی ہے - اور پھر تیسرا سبب سب سے بڑھکر لوگوں کی ارادی بد دیانتی و کذب شعاری تھی لیکن یہ نفس بشری کا خاصہ فطری ہے کہ وہ مدت دراز تک خوف و دہشت کی حالت میں نہیں رہ سکتا ہے بلکہ جہاں اپنے دل سے اسباب دہشت پیدا کرتا ہے وہاں اُن کا توڑ بھی اپنے دل سے پیدا کر لیتا ہے چنانچہ جہاں خوش عقیدگی کی آنکھہ کو ہر طرف شیاطین کا مجمع نظر آتا تھا - وہاں ملائکہ کی بھی کمی نہ تھی اور رفع دہشت کا سب سے زیادہ موثر و مجرد نسخہ یہ ثابت ہوا کسی پیر فقیر کو گرانبہا نذر دیدی جائے - یا خانقاہوں پر جائداد وقف کر دی جائے - چنانچہ ایک مرتبہ جب ایک مردہ

کے اعمال کا وزن ہورہا تھا تو بدکاریوں کا پلہ بہت جھکا ہوا نظر آیا اور قریب تھا کہ فرشتگان عذاب اپنا کام شروع کردیں کہ دفعتاً سینٹ لارنس کی درگاہ کے ایک مجاور نے قدم رکھا اور سونے کا ایک ٹکڑا جو اُس مردہ نے درگاہ پر چڑھایا تھا دوسرے پلہ میں ڈال دیا جس سے معاً اُس کا وزن بہت بڑھ گیا اور مردہ کی نجات ہوگئی - بالکل اسی طرح پر ڈیگوبرٹ، شارلمین وغیرہ کو نجات حاصل ہوئی - بلکہ بعض اشخاص جو گُناہوں کی گٹھری لادے ہوئے مرگئے - کبھی کبھی اپنے پیروں کی دعا سے دوبارہ زندہ کئے گئے ہیں تاکہ اُن کے داغ معاصی کفارہ مالی کے پانی سے دھو دئے جائیں - اور اس طرح جوں جوں تخویف مذہبی کو وسعت حاصل ہوتی گئی - جوں جوں لوگ عذاب اُخروی کی دہشت کا زیادہ شکار ہوتے گئے اُسی نسبت سے راہبوں اور خانقاہ نشینوں کے کیسے زیادہ پر ہونے لگے —

اُس زمانہ میں شریعت نے جس سختی کے ساتھ معاشری زندگی کو اپنے شکنجہ میں کس رکھا تھا - درحقیقت اس کا اندازہ وہ لوگ کرہی نہیں سکتے جنھوں نے اُس زمانہ کی تصانیف و لٹریچر کا مطالعہ نہیں کیا ہے - صرف یہی نہیں کہ ہزاروں عجیب و غریب اور مضحکہ خیز معجزات کی داستانیں اُس وقت موجود تھیں بلکہ نہایت کثرت سے تھیں اور بالقصد وضع کی گئی تھیں اس صورت حال کا نتیجہ یہ نکلا کہ اب مسیحیت برائے نام مسیحیت رہ گئی تھی ورنہ تعدد آلہہ و شرک کے لحاظ سے اُس میں اور بت پرستی میں کوئی فرق نہیں باقی رہا تھا - ملک کی عام جہالت دماغی سطح کی پستی - نیم مسیحی

بربریوں کی وحشیانہ مذہبیت خانقاہوں کا اقتدار و اثر مقتدایان کلیسا کی خود غرضیاں، معاصی کے مالی کفارہ دینے کا رواج عام، جہنم کی دہشت و ہیبت، ان سب چیزوں نے مل ملا کر کلیسا کی قوت کو فوق الحد بنادیا تھا - ایسی کہ کسی کو مخالفت کی ہمت ہی نہیں پڑسکتی تھی - رد و انکار کا پہلا زینہ ہے شک و بے اطمینانی اور یہاں سرے سے شک وسوسہ شیطانی کے مرادف قرار دے کر قطعاً ممنوع و حرام کردیا گیا تھا جس کی سزا ایسی شدید رکھی گئی تھی کہ لوگوں کا کلیجہ اس کے تصور ہی سے دہل جاتا تھا اور مقتدایان کلیسا نے بکمال دانشمندی ایسا نظام اقتدار تیار کر رکھا تھا کہ انسان اپنی ہر تکلیف و مصیبت کے وقت اُنھیں کی طرف رجوع کرنے میں اپنے تئیں مجبور پاتا تھا جس سے ان کی گرفت اہل دنیا پر اور سخت ہوتی جاتی تھی - یہاں تک کہ رفتہ رفتہ علم و تعلیم، دولت و ثروت، امارت و حکومت، غرض ہر قسم کی قوتیں آکر انھیں کی ذات میں جمع ہوگئیں —

ان حالات کے ساتھ اندازہ کرو کہ اُس زمانہ میں جن روشن خیالوں نے اصلاح کا بیڑا اُٹھایا ہوگا - اُنھیں کیسی شدید دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا ہوگا! تقلید کی بندشوں سے آزادی ہمیشہ اور ہر جگہ مشکل رہی ہے - لیکن جب بندشیں اس قدر سخت و سنگین ہوں تو ان پر غالب آنے میں دشواریاں بھی کس بلا کی پیش آئی ہوں گی! لوگ کسی بڑے بلوہ یا بغاوت کے مصائب کا آسانی سے تصور کرسکتے ہیں اور قتل و خون دار و زندان کے شدائد بلا دقت ہمارے متخیلہ میں آجاتے ہیں لیکن

سارے ملک میں مطعون و انگشت نما ہونے اور اپنے محبوب ترین اعزہ و احباب کے چھوٹ جانے سے جو سوہان روح رہتا ہوگا اُس کا اندازہ دشوار ہے اور اس سے بھی دشوار تر اُس تکلیف جاں گزا کا احساس ہے جو مصلحوں کو گوشۂ خلوت میں یہ سوچ سوچ کر ہوتی ہوگی کہ کہیں ان کی رائے حق پر نہ ہوگی بلکہ جیسا وہ بچپن سے سنتے چلے آئے ہیں محض شیطان کی وسوسہ اندازی ہوئی اور اسی حالت تشکیک و ارتیاب میں ان کی وفات ہوگئی تو آخرت میں ان کے لئے کیسا عذاب الیم ہوگا ! یہ تصویر کس قدر ہولناک ہے ! کون کہہ سکتا ہے کہ ان غریبوں کے دل پر کیا گزرتی ہوگی اور پھر یہ غریب تنہا رہتے تھے - کوئی ان کی منتظم جماعت نہ تھی جو تبادلہ خیالات و ہمدردی سے اپنے غم کو بہلاتے - ان کے تو کلیجہ میں ناسور پڑ پڑ جاتے ہوں گے - علوم طبعی یعنی سائنس اور فلسفہ تاریخ یہی دو چیزیں ایسی تھیں جن کے دامن میں انھیں پناہ مل سکتی تھی مگر اس وقت ان دونوں کا سرے سے وجود ہی نہ تھا - آج بھی باوجود اس تمدن و اشاعت علم جب بڑے سے بڑے فلسفی پر بارہا یہ کیفیت گزرتی ہے کہ بیماری یا اور کسی ناگہانی مصیبت کے وقت اس کے ذہن میں بے اختیار وہ سب خرفات عقاید از سر نو عود کر آتے ہیں جنھیں اس نے بچپن میں سنا تھا گویا جنھیں دماغ و عقل مدت ہوئی مردود کرچکے ہیں مگر دل و جذبات سے وہ باوجود مدت العمر کی کوشش کے نہیں نکل سکے ہیں تو پھر اس زمانہ کے روشن خیال مصلحوں کے تصور میں جنھیں آغوش مادر سے اس تعلیم کا خوگر کر دیا گیا تھا کہ تقلید راس الفضایل اور شک

وارتیاب کفر مطلق ہے بعض وقت جس قوت و اشتداد کے ساتھہ بچپن کے راسخ شدہ اعتقادات عود کر آتے ہوں اُس کا اندازہ کون کرسکتا ہے ؟ در حقیقت ترو با دورس کا منجملہ ان کے اور احسانات کے دنیا پر ایک یہ بھی بہت بڑا احسان ہے کہ انھوں نے دوزخ کے خوابوں کے ساتھہ مضحکہ کر کے جو راہبانہ اقتدار کے لئے ایک بڑے زبردست سہارے کا کام دے رہے تھے ان کی وقعت کو دلوں سے مٹایا اور لوگوں کو کم از کم اس قید دہشت سے خلاصی دی مجھے بہت شبہ ہے کہ کتھولک دماغ بغیر مشرکانہ لٹریچر اور حکماء اسلام کی اعانت کے کبھی بھی از خود جمود و تاریک خیالی کا جو اپنے کندھے سے ہٹاسکتا - شہری زندگی کی توسیع دنیوی دلچسپیوں اور کارو بار میں اضافہ ، علم و مطالعہ کی تجدید ، محاربات صلیبی کے سبب سے پاپایانہ اقتدار کا ضعف یہ سب چیزیں مل کر کلیسا کی قوت کو توڑ نے میں موثر ہوئیں - مگر ایک عقیدہ ایسا تھا جو اب بھی مقتدایان کلیسا کے ہاتھہ میں جلب زر کا ایک اچھا آلہ بنا رہا اور جس سے ان کی جیبیں عرصہ تک بھرتی رہیں - میری مراد عقیدۂ عالم برزخ سے ہے —

ہمارے زمانہ کے فلاسفہ اجل میں آگسٹ کومٹ قرون وسطیٰ کے بڑے حامی و ہمدرد ہوئے ہیں - وہ جہاں اس عہد کی اور بیسیوں خوبیاں شمار کراتے ہیں وہاں اس عقیدۂ برزخ کی مدح میں خصوصیت کے ساتھہ رطب اللسان ہیں کہ اس کے ذریعہ سے ایک ایسے درمیانی طبقہ کا وجود مسلم ہوگیا جو اخلاقی حیثیت سے خیر محض و شر محض کے بین بین تھا اور اس طرح تخویف مذہبی کے اشتداد میں خفت ہوگئی۔لیکن میرے نزدیک عقیدۂ برزخ کی یہ تعبیر

صحیح نہیں - جو لوگ کافر مرتے تھے اُن کے لئے تو برزخ کا وجود بیکار ھی تھا کہ ان کی جگہ صرف جہنم تھی - البتہ جو لوگ پورے صحیح العقیدہ مگر بد اعمال ہوتے تھے - ان کا گزر برزخ میں اس غرض سے ہوتا تھا کہ کچھہ عرصہ کی برداشت صعوبات کے بعد یہ قید جھیل کر جب گناھوں کی آلایش سے پاک صاف ھو جائیں تب جنت میں داخل ھوں - لیکن اس سے اشتداد تخویف مذھبی میں ذرا بھی تخفیف نہیں ھوئی - کیونکہ برزخ کے جو آلام و شداید بیان کئے گئے ھیں وہ آلام جہنم سے کسی طرح کم نہیں ھیں - وھی آگ، وھی جلن، وھی عذاب دردناک - البتہ فرق اتنا تھا کہ عذاب جہنم سے چھٹکارا پانے کی کوئی صورت ھی نہ تھی - اور وہ جگہ کفار کے لئے مخصوص تھی - البتہ برزخ میں مسیحی گنہگار مقید رہتے تھے اور انہیں قید سے نجات مل سکتی تھی، اس صورت سے کہ مردہ کے ورثاء، خیر و خیرات، یا نذر و نیاز کے نام سے کوئی رقم لا کر کلید برداران کلیسا کے حضور میں پیش کریں - یہ تھا ھمارے نزدیک اصل مدعا - عقیدۂ برزخ کا! اخلاقی نقطۂ نظر سے جو چاھئے کہئے - مگر اس ھوشیاری کی داد تو بہر حال دیجئے کہ اس میں بھی کس حکمت سے اپنی پردامنی کا راستہ نکال لیا - ایک نوجوان و شوھر پرست خاتون سے جس کے سر پر ابھی ابھی بیوگی کی مصیبت نازل ھوئی ھو - یہ جا کر کہنا کہ اُسے جو ذات دنیا میں سب سے زیادہ عزیز و محبوب تھی اس وقت برزخ کے شداید عظمیٰ میں گرفتار ھے جن سے نجات صرف اس صورت میں حاصل ھو سکتی ھے کہ وہ اُس کے کفارہ معاصی کے لئے

کوئی رقم نذر دے۔ تحصیل زر کا اس سے زیادہ موثر وکامیاب طریقہ اور کیا ہو سکتا ہے ؟

فصل (۱۴)

مغربی یورپ کی اخلاقی حالت

رومی شہنشاہی کے فنا ہونے سے لے کر شارلمین کے وقت تک باز نطینی یا مشرقی حکومت میں جو عہد بہ عہد مذہبی تغیرات ہوتے رہے اُن کا ذکر گزشتہ فصلوں میں ہو چکا - اب دیکھنا یہ ہے کہ زمانہ میں مغربی یورپ کی اخلاقی حالت کیا رہی ؟ لیکن اس سوال کے صحیح جواب حاصل کرنے میں متعدد دشواریاں ہیں جن میں سب سے بڑی دقت تاریخی مواد کا فقدان ہے - سنہ ۶۳۲ سے ایک صدی بعد تک کی تاریخ گویا مطلق ہی موجود نہیں جو کچھ ہمیں معلوم ہو سکتا ہے وہ خانقاہوں کے تذکروں اور شہداء کی سوانح عمریوں میں ضمنی اشارات سے پتہ چلتا ہے البتہ سنہ ۶۳۲ سے اُدھر ڈھائی صدیوں قبل کی تاریخ گری گوری آف تورس اور فیڈیگیریس کے صفحات میں یہ پوری صراحت کے ساتھ محفوظ ہے - ان سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اٹلی کی سر زمین شہنشاہی کے حالات و خصایص پھر ایک حد تک عود کر آئے تھے - لیکن گال کے علاقہ میں کلیسا کی اشاعت بربریوں کے درمیان ہو رہی تھی - جنھیں علم و تمدن سے کوئی مس نہ تھا -

معاشری زندگی میں ایک عجیب بد نظمی و طوایف الملوکی بھی جاری تھی - ظلم و جبر، مکر و فریب آوارگی و اوباشی کی وہ گرم بازاری تھی کہ آدمی ان کی داستانیں پڑھتے پڑھتے اُکتا جاتا ہے - ملکہ فریڈیگونڈ و ملکۂ برونہاٹ کا نمبر اپنی خون آشامیوں اور ہوسناکیوں کے لحاظ سے ایک بڑھا ہوا تھا اور خیر یہ دونوں تو ملکہ تھیں - ہر طبقہ نے فسق و فجور و سیہ کاری کو اوڑھنا بچھونا بنا رکھا تھا - ایک پادری کا ذکر ہے کہ وہ اکثر اس قدر مخمور ہوجاتے تھے کہ اپنے پیروں پر کھڑے نہیں ہو سکتے تھے - ایک دوسرے پادری کاٹینس کی بابت روایت ہے کہ وہ شراب پی کر اس قدر بد مست ہوجاتا تھا کہ چار آدمی اُسے پکڑ کر میز پر سے اُٹھا لے جاتے تھے - اسی پادری نے ایک بار اپنے کسی ماتحت کی جائداد پر دست برد کرنا چاہی اور جب اُس کی طرف سے مزاحمت ہوئی تو اسے زندہ دفن کرا دیا - مگر وہ اتفاق سے زندہ بچ آیا - اور جب اُس نے اس جرم کو طشت از بام کیا تو پادری کو تنبیہ کر دینا کافی خیال کیا گیا بڑے سے بڑے ظالم و سیہ کار تاجداروں کے مصاحبین و حوارئین خاص یہی پادری ہوتے تھے - ملکۂ فریڈیگونڈ کے خاص راز دار یہی پادری تھے جن کے ذریعہ سے وہ ہر طرح کی سفاکیوں کا ارتکاب کرتی تھی - خود مشہور پاپاے اعظم سینٹ گری گوری ہروقت ملکہ برونہاٹ کی خوشامد میں لگے رہتے تھے - شاہ گونٹری بالڈ نے جب اپنے تینوں بھائیوں کو قتل کر ڈالا تو پادری سینٹ آویٹس نے اس پر ملامت کرنا کیسا نہایت تحسین کی کہ اپنے حریفوں کا خطرہ مٹا کر اس

نے اپنی رعایا کی آسایش کی جڑ مضبوط کردی - پادریوں کا عہدہ اکثر انھیں لوگوں کو ملتا تھا جو حرص و ہوا و عیش پرستی میں خاص شہرت رکھتے ہوتے تھے اور مذہبی مجالس عموماً مینوشی کے مناظر ہوتے تھے - یہ لوگ ایک عرصہ سے مسلم رہنے لگے تھے بلکہ سیلت گری گوری چھٹی صدی کے دو پادریوں کا ذکر کرتا ہے - جنھوں نے اپنے بہت سے دشمنوں کو اپنے ہاتھہ سے ہلاک کیا تھا - غرض اس زمانہ کی تاریخ کے جس کسی صفحہ کو ہم کھولتے ہیں ہر جگہ ظلم و شقاوت ' سفاکی و توحش ' بدچلنی و شہوت پرستی کے مناظر سے دوچار ہونا پڑتا ہے - مخالفوں کے ہاتھہ پیر یا ناک کان کاٹ ڈالنا ایک معمولی بات تھی اور ہر بادشاہ کے لئے اپنے اعزہ کو قتل کرنا تو گویا لازمی تھا - ایک بادشاہ نے اپنے باغی بیٹے ' اپنی بہو ' اپنی پوتیوں کو اپنے سامنے زندہ جلوا دیا - ایک ملکہ نے اپنی بیٹی کو دریا میں غرق کردیا اس ڈر سے کہ کہیں اُس کے سوتیلے باپ کی طبیعت نہ اس پر آجاے ایک اُسقف صاحب ایک مرتبہ کسی معمولی آدمی کے گھر میں گھس آے اور اس کو اُس کے مکان سے باہر نکال دیا تاکہ اُس کی حسین بیوی کے ساتھہ زنا کرسکیں وہ اس میں مشغول تھے کہ شوہر واپس آیا اور عین حالت اختلاط میں زانی و زانیہ دونوں کو قتل کر ڈالا - ایک شہزادہ صاحب کا یہ مشغلہ تفریح تھا کہ اپنے غلاموں کو آگ سے جلواتے رہتے تھے اور دو غلاموں کو اس جرم میں زندہ دفن کردیا کہ انھوں نے بغیر اجازت اپنی شادیاں کرلی تھیں - اس طرح کے واقعات اس زمانہ کی تاریخ کے ہر صفحہ میں

نظر آتے ہیں ملکۂ برو نہاٹ جب اپنے طویل عہد حکومت کے بعد اپنے حریف کلوتیر کے ہاتھ میں گرفتار ہوگئی تو اُسے یہ سزا ملی کہ متواتر تین دن تک انواع و اقسام کے شداید و آلام میں مبتلا کرکے اونٹ کے اوپر بٹھا کر سارے شہر میں پھرائی گئی اور اس کے بعد ایک شریر گھوڑے کی دم میں باندھ کر اُسے تیز دوڑا دیا گیا۔ جس سے ضعیف العمر ملکہ کی لاش کے پرخچے اُڑ گئے —

ایک طرف تو بد اخلاقیوں کے اس مرقع کو پیش نظر رکھو اور دوسری طرف اس حقیقت کو ملحوظ رکھو کہ یہ زمانہ خالص دینداری کا تھا۔ لٹریچر تمامتر مذہبی رنگ میں رنگا ہوتا تھا الحاد و بے دینی کا نام و نشان بھی نہیں رہا تھا۔ راہبوں اور پادریوں کو ہر طرح کی جاہ و ثروت و اقتدار حاصل تھا۔ متعدد سلاطین نے ترک تاجداری کرکے فقیری اختیار کرلی تھی اور ساتویں اور آٹھویں صدی میں نہایت کثرت سے بزرگان دین پیدا ہوتے رہے —

پھر اس زمانہ کے مورخین جس خاص طور پر اندراج واقعات کرتے ہیں وہ بھی ہم لوگوں کے لئے عجیب و غریب ہیں۔ گری گوری آف تورس جس کی تاریخ ہمارا اصل ماخذ ہے۔ بہت مشہور اور بڑا محتاط و متقی پادری تھا۔ جو ہر واقعہ کو مذہبیت کی عینک سے دیکھتا ہے تاہم جب اپنے مخالف عقیدہ والوں کا ذکر کرنے لگتا ہے۔ تو اس کا حس اخلاق حیرت انگیز طور پر مردہ ہو جاتا ہے — مثلاً کلووس ایک مشرک رئیس تھا جو مسیحی ہوگیا — اصطباغ کے بعد ہی اسے یہ دیکھ کر تاسف ہوا کہ گال کے ایک

بڑے علاقہ کا تاجدار ایک بد عقیدہ شخص ہے - چنانچہ اس کے ملک پر حملہ کا قصد کیا اور اس حملہ کے دوران میں معجزات اس کی تائید کرتے گئے - مسیحی ہو کر سب سے پہلے جنگ آزمائی کی ابتدا اسی نے کی - بالآخر فتح اسی کو نصیب ہوئی اور اب اس کی نظریں اور بلند ہوئیں - اس جنگ میں اس کو بڑی مدد اپنے ایک عزیز سگبرٹ سے ملی تھی جو ایک اور صوبہ کا فرماں روا تھا - کلو وس نے اس کے لڑکے کو ترغیب دی کہ اپنے باپ کو قتل کر ڈالے - چنانچہ اس مشورہ پر عمل کیا گیا - اب یہ پدر کش فرزند تخت نشین ہوا - اور کلووس نے اس کے پاس اظہار محبت و اخوت کے لئے اپنے سفیر بھیجے لیکن در پردہ اُنھیں یہ حکم دیا کہ اسے قتل کر ڈالنا اس حکم کی بھی تعمیل ہوئی اور ملک بے والی و وارث رہ گیا اب کلووس وہاں پہنچا اور ایک تقریر میں رعایا کے سامنے بکمال حکمت عملی ان کی طوایف الملوکی و خانہ جنگیوں پر اظہار تاسف وقلق کر کے یہ کہا کہ " میں خود تمہاری حفاظت کے لئے تیار ہوں " - لوگوں نے اس تجویز کا خوشی سے خیر مقدم کیا اور یوں بے لڑے بھڑے کلووس ایک اور تخت پر قابض ہو گیا - اب طمع اور بڑھی - یہاں تک کہ پورے ملک گال پر قابض ہو کر اور وہاں کے جائز حکمرانوں کو جو زیادہ تر اس کے عزیز ہوتے تھے قتل و معزول کر کے اُس نے بجز اپنے بیوی بچوں کے اور تمام اعزہ کو خفیہ طور پر قتل کرا ڈالا تا کہ کوئی دعویدار سلطنت باقی نہ رہے اس کے بعد اپنے ارکان دربار کے سامنے اس نے اپنی تنہائی پر زار و قطار رونا شروع کیا کہ دنیا میں میرا

کوئی رشتہ دار باقی نہیں رہا - یہ تقریر بھی مکر سے خالی نہ تھی کہ اس کا اصل مدعا یہ پتہ لگانا تھا کہ اب بھی کوئی ممکن رقیب باقی ہے یا نہیں ۔ چند سال کے بعد اس نے وفات پائی اور اس سیرت و طبیعت کا تاجدار بکمال اعزاز و احتشام اپنے تعمیر کرائے ہوئے قبرستان میں دفن ہوا - اور سینٹ گری گوری جو ان واقعات کے راوی ہیں انہیں بے تکلف لکھتے ہیں اور نا پسند کرنا کیسا اس پر فخر و مسرت کا اظہار کرتے ہیں کہ کفار و اہل ضلالت کو شکست ہوئی اور نصرت غیبی سے دین حق کا ہر جگہ بول بالا رہا - اُسی طرح کہ جیسے اس سے قبل ابراہیم ' یعقوب ' موسیٰ ، ہارون ' داؤد کا رہا تھا - خاتمہ کے یہ فقرے سننے کے قابل ہیں :—

„ ایریس جس نے بدعت و ضلالت کی بنا ڈالی ' لقمہ اجل ہوتے ہی واصل جہنم ہوا - لیکن حامی دین حق پلیسری کو اگرچہ حمایت تثلیث میں جلا وطن ہونا پڑا - لیکن وفات کے بعد اُسے جنت میں گھر ملا . شاہ کلووس تثلیث پر دل سے ایمان رکھتا تھا - اسی قوت ایمانی کے اعانت سے اُس نے کفار پر فتح پائی اور تمام ملک گال پر قبضہ حاصل کیا - الارک کو حق سے ارتداد کا یہ ثمرہ ملا کہ سارا ملک چھن گیا اور آخرت میں عذاب الیم نصیب ہوا “ —

یہ ایک نمونہ ہے اُس زمانہ کے بہترین مورخ کے طرز خیال و تاریخ نگاری کا جس کے صدہا نظایر اور پیش کئے جاسکتے ہیں - لیکن دنیا میں کوئی شے شر

مطابق نہیں ہوتی - ہر شر میں خیر کے پہلو ضرور شامل رہتے ہیں - اس بنا پر باوجود اس کے اُس وقت کا اخلاقی مطلع نہایت غبار آلود تھا - تاہم فضایل اخلاق کی جگمگاہٹ سرے سے فنا نہیں ہوگئی تھی - یہ ضرور ہے کہ اس وقت کے حکماء و علماء بجائے اخلاق کے اصولی و اساسی مباحث کے اپنی ساری قوت فقہ کے کسی جزئی مسلہ کی تحقیق میں صرف کرتے رہتے تھے اور لوگ فرایض ملکی و خانگی سے غافل ہو ہو کر راہبانہ ریاضتوں میں تضیع وقت کرتے تھے - تاہم اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ پھر بھی مذہب کے اثر سے فوائد مترتب ہورہے تھے - ایک یہی فائدہ کیا کم تھا کہ ہزارہا آدمیوں کو جو دشمنوں کے ستائے ہوتے تھے - خانقاہوں میں ایک امن و سکون کی جگہ مل جاتی تھی اور جنگ و جدل کی ہنگامہ آرائیوں میں کم از کم کچھہ لوگ تو یکسوئی واطمینان کی زندگی بسر کر سکتے تھے - یا پھر دنیا پرستی کے غوغاے عام میں جب وہ کسی مشہور بزرگ کی زیارت کے مشتاق ہوکر اس کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے تو قناعت واستغنا کی ایک صورت تو انھیں بہر حال نظر آتی تھی - اس وقت دنیا کی بہبود و فلاح اسی میں تھی کہ کلیسا کی عمارات و جائدادیں احترام و شرف کے پردہ میں ہمیشہ محفوظ رہیں - چنانچہ ان سے بے ادبی کرنے والوں کی غیبی سزاؤں کے جو افسانے مشہور تھے - وہ کوئی خالی از مصلحت نہ تھے - اسی طرح مذہبی جشن اور تہواروں کے جو دن مقرر تھے - ان کا ہونا بھی بہت اچھا تھا کہ ان دنوں اسی بہانہ سے غلاموں اور خادموں کو چھٹی مل جاتی تھی - اتوار کے روز تعطیل منانے کا دستور اگرچہ شروع سے چلا آتا تھا -

لیکن اب اس پر اور زیادہ زور دیدیا گیا کہ یہ روز صرف عبادات کے لئے مخصوص ہے - قسطنطین نے یہ قانون نافذ کر دیا تھا کہ اتوار کو بجز زراعت کے اور کسی قسم کا کام غلاموں اور خادموں سے نہ لینا چاہئے - تھیو دوسیس نے ملاعب عامہ کی بھی ممانعت کر دی تھی - قرون وسطیٰ میں کلیسا نے اسے اور زیادہ اہمیت دیدی اور بیسیوں افسانے اس مضمون کے شائع ہو گئے کہ جن لوگوں نے یکشنبہ کا روز دنیوی مشاغل میں صرف کیا اُن پر عجیب عجیب مصیبتیں اور بلائیں نازل ہوئیں خیر و خیرات کا رواج حد سے زیادہ تھا - بلکہ بعض فرماں رواؤں کے سوانح زندگی تو بجز اس کے اور کچھ معلوم ہی نہیں کہ انھوں نے فلاں فلاں فیاضیاں کی ہیں - خود پادریوں کی جماعت میں اگرچہ بڑی تعداد اوباشوں کی ہوتی تھی - تاہم اسی زمرہ میں بعض بعض حقیقی متقی بھی گزرے ہیں - قیدیوں کو فدیہ دے کر چھڑانا یہ ان کا خاص شیوہ تھا - چھٹی صدی میں پیرس کا ایک پادری سینٹ جرمینس اس باب میں خصوصیت کے ساتھ شہرت رکھتا تھا - چنانچہ جب اُس کا انتقال ہو گیا تو بہت سے قیدیوں نے اُس وقت اُس کی نعش سے دعا کی کہ " ہمیں بھی رہا کیجئے " اس پر نعش اس قدر بھاری ہو گئی کہ کسی طرح اُٹھائے نہیں اُٹھتی تھی آخر کار جب اُن قیدیوں کو رہا کر دیا گیا - تب کہیں جنازہ اُٹھ سکا - اس طرح کے افسانے گو ایک طرف طفلانہ و مضحک ہیں تاہم اس میں بھی شک نہیں کہ مذہبی سادگی کے لحاظ سے بیحد موثر بھی ہیں -

مگر اس دور کا سب سے زیادہ زرین کارنامہ مشنریوں کی سعی تبلیغ و دعوت ہے پہلے مشنریوں کا سیلاب

فلسطین و اٹلی سے رواں ہوا تھا مگر اب اس کا دھارا مغرب سے چل رہا تھا - اس میں حق تقدم آیرلینڈ کے مشنریوں کو حاصل ہے - جنھوں نے پہلے اپنے وطن پھر انگلستان اور پھر وہاں سے باہر نکل کر گال ' سوئزرلینڈ اٹلی و جرمن کے دور دراز اقطاع تک اپنی سرگرمی دکھانی شروع کی - اس تحریک کا چھٹی صدی کی ابتدا میں آغاز ہوا تھا اور ایک صدی بعد دوسرے ممالک کے لوگوں نے اس کی تقلید شروع کر دی ' بالخصوص اہل انگلستان و گال نے - چنانچہ مشہور پر جوش اینگلوسیکسن مشنری سینٹ بونیفیس کا دائرۂ دعوت و تبلیغ جرمنی تک پہنچ گیا - یہ سرگرمی تین صدیوں بعد تک پورے جوش و خروش سے قایم رہی اور اس تحریک کے سہارے پر باوجود ہر طرح کے علمی سیاسی و اخلاقی انحطاط کے لومبرڈی سے لے کر سویڈن تک جو تخم ریزی ہوتی رہی ' اُسی نے آگے چل کر تمدن کے برگ وبار پیدا کئے —

الغرض اگرچہ بحیثیت مجموعی ' قرون وسطیٰ یعنی زوال شہنشاہی رومہ سے لے کر شارلیمین تک کا زمانہ ' انتہائی جہالت و ظلمت کا دور رہا ہے - تاہم اسی کے پہلو بہ پہلو جدید تمدن کے قصر و ایوان کی داغ بیل بھی پڑ رہی تھی - اس تحریک اخلاقی نقطۂ خیال سے دو عنصر تھے - ایک مسیحیت میں عسکریت کی روح کا پیدا ہو جانا - دوسرے دنیوی مناصب میں تقدس و احترام کی آمیزش آیندہ دو فصلوں میں ہم انہیں دونوں چیزوں کو کسی قدر کھول کر بیان کرتے ہیں —

فصل (۱۵)

کلیسا میں عسکریت کا آغاز اور نشو و نما

یونانیوں کا قول تھا کہ دیوتاؤں کو اپنی نذر و نیاز کے لئے جس قدر مال غنیمت پسند ہے اتنی اور کوئی شے مرغوب نہیں۔ شروع شروع مسیحت کا اصول و دستورالعمل اس کے بالکل مخالف بلکہ متضاد تھا۔ چنانچہ ابتدا میں مسیحیت کا یہ قانون تھا (جیسا کہ پیشتر گزر چکا ہے، کہ کسی مسیحی کو مسلح نہ رہنا چاہئے اور سپاہی جنگ سے معاودت کے بعد حصول تبرکات میں کبھی شرکت نہیں کر سکتے، تاوقتیکہ ایک مدت تک توبہ و استغفار نہ کر چکیں مفتیان شرع کی ایک زبردست جماعت نے جس کے ارکان کلیمنٹ آف الگزندریا، ترتولین اُریجن، لیکٹینٹیس و بیسل ہوئے ہیں یہ حکم لگا دیا تھا کہ مسیحی کے لئے ہر قسم کی جنگ میں شرکت نا جائز ہے۔ چنانچہ اسی فتوے پر عمل کرکے میکز یمیکیلیس نے ڈیوکلیشین کے زمانہ میں بحیثیت سپاہی کے شرکت جنگ سے انکار کر دیا اور بالآخر اسی جرم میں اسے مرتبۂ شہادت نصیب ہوا۔ بلکہ بعضوں کا تو یہاں تک خیال ہے کہ یہی مسئلہ ایک بڑا سبب تھا ڈیوکلیشین کی تعدیوں کا بت پرستوں کی طرف سے مسیحیت پر یہ ایک الزام تھا (جسے مسیحی متکلمین صاف تسلیم کرتے تھے اور علانیہ اس کا اعتراف کرتے تھے) کہ مسیحیت

سپاهیانہ زندگی کے بالکل منافی ہے ۔ گو اسی کے ساتھہ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ مسیحیوں کی دعا ' سپاہیوں کے آلات حرب سے زیادہ موثر ہوتی ہے - ایک طرف یہ سب کچھہ تھا لیکن با ایں ہمہ شروع ہی سے کچھہ لوگ ایسے موجود تھے جو باوجود مسیحی ہونے کے فوج میں بھرتی ہوتے رہتے تھے - چنانچہ ڈیوکلیشین کی تعدیوں کا اصل ہدف مسیحی سپاہی ہی بنے تھے اور قسطنطین کے زمانہ میں تو سپاہ کا بڑا حصہ مسیحیوں پر مشتمل ہو گیا تھا - اسی عہد میں ایک انجمن کلیسا نے یہ فتوی شائع کیا کہ جو مسیحی سپاہی شرکت جنگ سے انکار کرتے ہیں وہ نمک حرامی کے گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں - اور سینٹ آگسٹاین جیسے ذی اثر شخص نے اس کی تائید کی - مگر باوجود اس کے کہ فوج میں داخلہ اب حرام نہیں رہا تھا - تاہم مذہبی حلقوں میں اسے پسندیدگی سے اب بھی نہیں دیکھا جاتا تھا - کیونکہ مسیحی و مشرکانہ تخیل اخلاق ہی میں زمین و اسمان کا فرق تھا - مشرکوں کا مطمح نظر وطن تھا اور ان کے نزدیک وطن پرستی وسپہگری زبدۃ الفضائل تھے - بخلاف اس کے مسیحی نصب العین ' ثواب آخرت تھا اور اس نقطہ خیال سے ترک دنیا اور رہبانیت کو راس الحسنات کا مرتبہ حاصل تھا - چنانچہ چوتھی اور پانچویں صدیوں میں جوانان صالح کی تعداد کثیر برابر فوج سے منتقل ہو ہوکر زاہدوں و راہبوں کی صف میں شامل ہوتی جاتی تھی —

پہلی شے جو مذہب و عسکریت کے درمیان مصالحت کا باعث ہوئی وہ یہ عقیدہ تھا کہ ہردنیوی معاملہ براہ راست کسی مداخلت غیبی کا نتیجہ ہوتا ہے - یعنی

تمام قومی مصیبتیں کفر یا فسق وفجور کا نتیجہ ہوتی ہیں اور اس کے مقابلہ میں جاہ و ثروت امارت و حکومت غرض ہر دنیوی خوشحالی خوش اعتقادی و نیک عملی کا انعام ہوتی ہے - اس اصول کی بنا پر جنگ میں فتح و کامیابی بھی انھیں لوگوں کے حصہ میں آسکتی تھی جو با ایمان و خوش اعمال ہوں - چنانچہ ہزارہا اشخاص نے اسی لالچ میں اصطباغ لے لیا - خود قسطنطین کے لئے تو قطعاً اور کلووس کے لئے غالباً یہی محرک قبول مسیحیت کا تھا اور بربریوں پر تو یہ محرک جس بڑی حد تک موثر ہوتا تھا اُس کا ذکر گزر چکا ہے ۔ پھر جب کچھ روز میں قسطنطین کو خواب میں فتح کی بشارت ملنے لگی جب صلیب فوج کے علم پر آویزاں کی جانے لگی اور صلیب کی کیلیں اُکھاڑ اُکھاڑ کر تبرک کی طور پر زرہ و خود میں لگائی جانے لگیں تو مذہب و عسکریت کا اتحاد ایک بالکل غیر مخفی حقیقت بن گیا —

اس تحریک عسکریت کی رفتار کو بعض خارجی واقعات نے اور تیز کردیا - مثلاً ایک بڑا سبب یہ ہوا کہ شمال کے جنگجو قبائل تعداد کثیر میں مسیحیت قبول کرنے لگے - تبدیل مذہب سے ان کی سرشت کیونکر بدل سکتی تھی ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے اپنی جنگجوئی کو اس نئے مذہب میں بھی داخل کردیا - ایک طرف یہ ہوا اور دوسری طرف بہت سے راہبوں اور پادریوں نے زمانہ کی نزاکت کو دیکھکر مجبوراً فوج کشی میں اپنے متبعین کی قیادت و سرداری شروع کردی - مگر ان سب اسباب سے بڑھ چڑھ کر جو سبب مسیحیوں میں عسکریت کی روح پھونکنے کا ہوا وہ اسلام کی تقلید تھی کہ اسی نے درحقیقت مسیحیوں

کی سی نرم و آشتی سرشت جماعت کو محاربات صلیبی کا پر جوش مجاهد بنا دیا —

اس عظیم الشان مذهب نے جو اتنے عرصه تک مسیحیت کا مد مقابل رها ایک زمانه میں دنیائے مسیحیت کے دلوں پر اپنی شدید ترین هیبت بالکل بجا طور پر بٹھادی تھی - اس نے بغیر اصنام و تماثیل کی مدد کے اور بغیر عبد و معبود کے درمیان اشخاص متوسط کا سلسله قایم کئے جاهلوں اور بربریوں کے سامنے خالص ترین توحید اور بحیثیت مجموعی اعلیٰ ترین نظام اخلاق کی تعلیم پیش کی اور اپنے متبعین کے قلوب میں وه جوش خلوص و انهماک پیدا کردیا جس کی نظیر کسی دوسرے مذهب میں نهیں ملتی - اس نے اس حقیقت اهم سے واقف هوکر که نجات کو محض ایمان پر منحصر کر دینا نفس بشری پر خصوصیت کے ساتھه موثر هوتا هے اس عقیده کو مسیحیت سے اخذ کیا اور جنت کے جسمانی لذایذ و نعایم اور جهنم کے مادی آلام و شدایذ اس جزئی تفصیل سے بیان کئے که نا تربیت نفوس کا متخیله ان سے بالکل مسحور هوکر ره گیا - اس مذهب نے جو صحیفهٔ ربانی پیش کیا وه گو انجیل کے مقابله میں کتنے هی کمتر درجه کا هو تاهم صدیوں تک لاکھوں کروڑوں آدمیوں نے اس سے تسکین و تسلی حاصل کی هے - اس کی ایک خالص تعلیم مسله تقدیر هے - جس نے گو آج پیروان اسلام کے قوائے عمل کو شل کر رکھا هے - تا هم اول اول اس کا یه اثر نه تھا - بلکه قرون اولیٰ میں اسی عقیده نے مسلمانوں کو جرأت و شجاعت کا مجسمه بنا دیا تھا - اور خیر یه چیزیں تو تھیں هی

مگر سب سے بڑہ چڑہ کر اس کا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے جہاد (یعنی مقاتلہ کفار) کو راس الفضائل کے درجہ پر رکھدیا اسے اولین فریضۂ مذہبی قرار دیا اور مجاہد کو قطعاً جنتی ہونے کی دستاویز دیدی - یہ اسی تعلیم کا اثر تھا کہ اسلام میں برگزیدگی و سپہگری کے ڈانڈے مل گئے اور پیروان محمد میں وہ عدیم النظیر جوش پیدا ہوگیا کہ اپنے نبی کی وفات کے ایک صدی کے اندر ہی انھوں نے مشرقی حکومتوں کو مسخر کر لیا - مسیحیت کو اُس کے وطن اصلی سے تقریباً خارج البلد کر دیا - ان کا پرچم ایشیا و افریقہ سے لے کر اسپین تک لہرانے لگا - بلکہ اگر چارلس مارٹل نہ اُٹھہ کھڑا ہوتا تو قریب تھا کہ وسطی یورپ کی حکومتیں بھی اُن کے زیرنگیں آجائیں - یہاں اس امر پر قیاس دوڑانا تحصیل حاصل ہے کہ یہ ٹیوٹن نسل کی قومیں جن کے اوپر موجودہ تمدن کی ترقی کا اس قدر دار و مدار رہا ہے اگر اسلام کے زیرنگیں آگئی ہوتیں تو آج تمدنی زندگی میں کیا کیا انقلابات ہوگئے ہوتے - ہم صرف واقعات کو دیکھتے ہیں اور واقعتاً اسلامی فتوحات کے اثر سے عملاً ابنائے مسیحیت میں ایک انقلاب تو ہو ہی گیا اور وہ یہ ہوا کہ اسلام کی جنگی وعسکری روح رفتہ رفتہ مسیحیت میں سرایت کر گئی - یہ معلوم ہے کہ بہت سی مسیحی المذہب قومیں بالطبع جنگجو و محاربہ پسند تھیں اب جب کہ انھوں نے اپنی حریف جماعت کی جنگجوئی کے مناظر دیکھے تو اس مثال سے غیر متاثر نہ رہ سکے - کچھہ یہ اور کچھہ اس جوش انتقام سے کہ جس نے ہم کو بے خانماں اور ہمارے دین کو بے حرمت کیا ہے ہم بھی اُسے بے خانماں اور اُس

کے دین کو بے حرمت کردیں گے - ہزارہا پادریوں نے کلیسا کی بلندیوں سے وعظ کرنا شروع کیا کہ مسلمانوں سے لڑنا فرض عین ہے اور جنت کا راستہ میدان جنگ میں ہوکر ہے - یہ وعظ دو صدیوں تک قایم رہا اور اس کا یہ اثر ہوا کہ مسیحیوں میں بھی مسلمانوں کے مساوی جنگی جوش پیدا ہوگیا - اور اب جب شام کے وقت ایک مسیحی صلیب کے سامنے عبادت کے لئے سر جھکاتا تھا تو جانتے ہو کہ وہ صلیب کیا ہوتی تھی ؟ وہ صلیب تلوار کا قبضہ ہوتی تھی —

مسیحیت کے اس دور عسکریت کا اُس کے اُس ابتدائی دور سے مقابلہ کرو جب امن و آشتی ' صلح و سکون سے اُس کا خمیر سمجھا جاتا تھا تو اس کی اس انقلاب حالت پر تاسف ہوتا ہے - کہاں ایک وہ زمانہ تھا جب مسیحیت سے غایت فقدان عسکریت کی بنا پر جنگجو مشرک اقوام اپنے مردوں کو بجائے لٹانے کے ہمیشہ کھڑا دفن کرتی تھیں تاکہ مسیحیوں سے التباس نہ ہونے پائے اور کہاں اب یہ وقت آگیا کہ جنگ و جدل کشت و خون جزو مسیحیت بن گئے —

مسیحیت کا اثر جنگ پر کیا پڑا ؟ یہ ایک مہتم بالشان مسئلہ ہے - مگر مختصراً ہم اس کا جواب یہ دے سکتے ہیں کہ -

(۱) مسیحیت کے اثر سے مسیحیان قرون اولی کی پیشین گوئیوں کے علی الرغم جنگ کا انسداد یا وقوعات جنگ میں تخفیف بالکل نہ ہوسکی - افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ قسطنطین کے بعد سے کوئی زمانہ ایسا نہیں ملتا ہے جس میں مقتدایان کلیسا نے جنگ کے

انسداد کی کوشش کی ہو - بلکہ بخلاف اس کے وہ اپنے
متبعین کو ہمیشہ محاربات صلیبی پر اُکسا تے ہی رہے -
لے دیکھے انھوں نے اُن خانگی لڑائیوں کو جنھیں انگریزی
میں ,, ٹرویل " کہتے ہیں بند کرنا چاہا - لیکن یہ بھی
اُن کا کوئی خاص احسان نہیں یہ طریقہ مشرکین کے
زمانہ میں سرے سے مفقود تھا پادریوں کے سامنے جاری
ہوا اور وہ اسے نہ روک سکے ' اب اس کا انسداد ترقی
تمدن سے خود بخود ہوتا جاتا ہے - اس کے سوا اور کسی
حیثیت سے تو آئمہ مسیحیت نے انسداد جنگ میں حصہ
لیا نہیں بلکہ یہ بحیثیت مجموعی ہم کہ سکتے ہیں
کہ بجز اسلام کے اور کسی مذہب کے نام سے دنیا میں
اتنا کشت و خون نہیں ہوا جتنا مسیحیت سے ہوا -
امن و آشتی کی تعلیمات قدیم - تقویم پارینہ ہو گئیں
تھیں اور صدیوں تک قتل و خونریزی کے وعظ ہوتے
رہے - اب آخری زمانہ میں البتہ صلح و آشتی کی تحریک
کی پھر تجدید ہو رہی ہے مگر اس تحریک کے بانی محض
دنیا دار لوگ ہیں جنھیں مسیحیت سے کوئی واسطہ نہیں -
(۲) مگر مسیحیت کے اثر سے جنگ کی وحشت و بربریت
میں ضرور حیرت انگیز کمی ہوگئی - اگلے زمانہ
میں جنگ مرادف تھی ہر قسم کی اخلاق شکنی و
قانون شکنی کے مگر مسیحیت نے اسے بالکل بدل دیا -
اس میں شبہ نہیں کہ کہیں کہیں قدماء کے ہاں بھی
اسیران جنگ و مفتوحوں کے ساتھ حسن سلوک کی
ہدایات ملتی ہیں - مثلاً فلاطون نے یہ قاعدہ مقرر کیا
تھا کہ یونانی اسیران جنگ کو ایک رقم معین بہ طور
فدیہ لینے کے بعد چھوڑ دینا چاہئیے - مگر اس پر

عمل ایک آدھ بار سے زائد نہیں ہوا - یا مثلاً روما میں سسرو ' و سائنسٹ نے یہ کہا تھا کہ جنگ کا مقصد ہمیشہ قیام امن ہونا چاہئیے اور اس کے سوا فوج کشی ہر حالت میں ناجائز ہے - بلکہ پلینی محض اس بنا پر سیزر کے ساتھ " اعظم " کا لقب نہیں استعمال کرتا تھا کہ اُس نے اس قدر خونریزی کی تھی ' اور مارکس آریلیس تو فاتحین اور رہزنوں کو ایک درجہ میں رکھتا تھا یہیں سپاہیوں کے ہاتھوں عورتوں کی آبروریزی بھی ایک سخت جرم سمجھی جاتی تھی - لیکن یہ مثالیں خال خال ملتی ہیں - ورنہ دنیا کی عام حالت اُس وقت یہ تھی کہ فاتحین کے اوپر کوئی ذمہ داریاں و فرایض عاید نہ تھے وہ ایک غیر مسئولانہ اقتدار کے ساتھ جو چاہتے مفتوحوں کے ساتھ سلوک کرتے اور یہ سلوک کیا ہوتا تھا ؟ قتل غلامی یا سیافی *

---

* ضمیریت پر جہاں اور بہت سے اعتراضات کئے جاتے ہیں وہاں ایک استشہاد اس واقعہ سے بھی کیا جاتا ہے کہ اگر حس اخلاق فطری ہوتا تو مختلف قوموں میں اسیران جنگ کے ساتھ مختلف برتاؤ نہ ہوتے - لیکن ہم اس قسم کے تمام اعتراضات کی جڑ پہلی جلد کی فصل اول میں کاٹ چکے ہیں - ہم نے تفصیل سے یہ بتایا ہے کہ انسان میں نفس ضمیر تو فطرتاً اور خود غرضی و نفع اندوزی کے حس سے متمایز و ممتاز موجود ہوتا ہے - لیکن یہ مادہ فطرتاً ودیعت نہیں ہوتا کہ اس کا رخ کس سمت کو رکھنا چاہئیے اس کا تعین تمامتر گرد و پیش کے حالات اور ماحول کے اثرات پر

(بقیہ نوٹ برصفحہ آئندہ)

مسیحیت نے آکر یہ ورق اُلٹ دیا۔ اُس نے مفتوحوں کے حقوق قایم کئے۔ اس باب خاص میں مسیحیت کے کارناموں کو ہم عنوانات ذیل کے تحت میں رکھہ سکتے ہیں —

(الف) اس نے سیافی کا بالکل سد باب کر دیا۔ اور یوں هزار ها جانیں بچالیں —

(ب) کچھہ روز کے بعد رفتہ رفتہ اس نے یہ قاعدہ مقرر کر دیا کہ مسیحی اسیران جنگ تو کسی حالت میں بھی غلام نہیں رہ سکتے هیں اور غیر مسیحی اسیران جنگ فدیہ دے کر رهائی حاصل کر سکتے هیں —

(ج) قدما کے هاں سپاهیانہ زندگی کا جو تخیل تھا وہ بالکل درشتی اور کھرے پن کا تھا مسیحیت نے اس تخیل میں نرمی ' لینت و خلق و آدمیت کی آمیزش کر دی۔ اور مسیحی سپاهی کے لئے یہ وصف امتیازی قرار پا گیا کہ وہ نہ صرف شجاع و دلیر هوتا هے۔ بلکہ کمزوروں اور ضعیفوں پر رحم کرتا هے۔ اور مفتوحوں سے بہ حسن سلوک پیش آتا هے —

هے۔ چنانچہ عالم توحش و بربریت میں انسان یہ سمجھتا هے کہ اُس پر صرف اُس کے خاندان و قبیلہ کے حقوق هیں اور بس اسی بنا پر وہ غیر قبیلہ کے لوگوں کے قتل کو اُسی قدر غیر معیوب و بے ضرر سمجھتا هے جتنا جانوروں کے شکار کو البتہ جب تمدن و روشن خیالی کے اقتضا سے اُس کے خیالات میں وسعت آتی هے تب وہ یہ سمجھنے لگتا هے کہ نوع انسان کے بھی کچھہ حقوق اس کے اوپر هیں —

فصل (۱۶)

دنیوی مراتب کا مذھبی احترام

عسکریت کے علاوہ دوسرا نیا عنصر اب مسیحیت میں یہ بڑھا کہ دنیوی مراتب کا مذھبی اکرام و احترام ھونے لگا - یہی وہ شے ھے جس نے آگے چل کر کبھی رعایا سے امراء کی غلامی کرائی اور کبھی بادشاہ کو ظل اللہ کا لقب دلوایا - گزشتہ صفحات سے معلوم ھی ھو چکا ھے کہ رومی شہنشاھی کی طبعی رفتار، شہنشاھی اقتدار کی جانب تھی، آگسٹس کے آئینی استبداد کی جگہ ڈیویکیٹس کے استبداد مطلق نے لے لی تھی سینٹ کی حیثیت مجلس ملازمان سرکار سے زیادہ نہیں رہ گئی تھی اور رواقیت کے ساتھہ ساتھہ رومی حریت کا بھی خاتمہ ھو گیا تھا - یہ انقلاب حالات کیوں ھوا؟ یہ کوئی ایسا غامض مسئلہ نہیں - یہ فطرت بشری کا اقتضاے طبعی ھے کہ استبداد جہاں نا تربیت یافتہ و پست دماغ قوموں کے حق میں بہترین نظام حکومت ھے، وھاں متمدن و تعلیم یافتہ جماعات کی زندگی کے لئے یہ ایک مرض ھے، اور مرض بھی کیسا؟ سخت اور متعدی - جب متمدن و مہذب جماعتیں ایک مرتبہ سیاسی غلامی کے پھندے میں آجاتی ھیں، تو ان کی رگ رگ میں استعباد کی روح حلول کر جاتی ھے، بلکہ حوصلگی و خواھش حریت کا خاتمہ ھو جاتا ھے، اور انحطاط و انحلال لازمی طور پر شروع

ہو جاتا ہے - اقوام مثل افراد کے ذی حیات ہوتی ہیں۔ حرکت اُن کا لازمی خاصہ ہے - اگر یہ حرکت ترقی کی طرف نہ ہو گی تو لا محالہ تنزل کی طرف ہو گی —

اس خاص انقلاب کی تشکیل میں مسیحیت کا کچھہ ایسا اثر نہیں ابتدا میں اس کی سیدھی سادی تعلیم یہ تھی کہ امور دنیوی میں حاکم وقت کی بیچون و چرا تابعداری کرو ' اور امور مذہبی میں اُن کی دست اندازی کو بالکل گوارا نہ کرو - لیکن کچھہ عرصہ کے بعد یہ نقطۂ خیال بدل گیا - قسطنطین کے بعد ان کی خالص و بے آمیز مذہبیت مدھم پڑ گئی - البتہ اُس کی جگہ پاپایانہ و احبارانہ خود غرضیوں نے لے لی - اب ان کا اُصول یہ قرار پایا کہ اگر کوئی تاجدار کلیسا کا ہمدرد ہے - تو فرشتہ ہے ' اور اگر مخالف ہے ' تو شیطان ہے ' اس سے بالکل قطع نظر کرکے کہ فی نفسہ اس کی سیرت و اخلاق کیا ہے ؟ مثلاً ایک شاہ قسطنطین ہی کو لیجئے جس کے اصل اخلاق کا اندازہ ایک اسی واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ قبول مسیحیت کے بعد اس نے بہ کمال شقاوت و سفاکی اپنی بیوی ' لڑکے اور بھتیجے کو قتل کر ڈالا - مگر پادری یوسیس اُس کی مدح و ثنا میں اس قدر رطب‌اللسان نظر آتا ہے کہ گویا وہ ظل‌الله تھا —

اس نقطۂ خیال کے سب سے بہتر نظایر دو بالکل مختلف سیرتوں کے تاجدار جولین و فوکس کے حالات زندگی کے مطالعہ سے معلوم ہوتے ہیں - جولین کی خانگی زندگی بے داغ تھی رواداری اُس کے خمیر میں تھي ' اور اُس کی طرز حکمرانی بالکل حکیمانہ انداز کی تھی ' تا ہم چونکہ کلیسا کے ساتھہ اس کا سلوک اچھا نہ تھا ' اس لئے وہ ہر طرح کے سب و شتم کا

ھدف بنا رہا۔ یہاں تک کہ جب اپنے ملک کی حمایت میں وہ میدان جنگ میں کام آیا، تو اُس کے مرنے کے بعد بھی بدگویوں نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا اور اُس کی موت پر تاسف کیا معنی، اس پر اظہار مسرت و شادمانی کیا - اس کی شجاعت، جانبازی و وطن پرستی میں سے کوئی شے اس کی شفیع نہ ہو سکی، متعدد مقامات پر مسیحیوں نے تھیٹروں اور گرجاؤں میں جمع ہو کر، اُس کی موت پر خوب جشن کئے - اور سینٹ گریگوری اعظم نے اپنی پیہم تقریروں میں جی کھول کر اُسے کوسا، اور اس پر اظہار افسوس کیا کہ اس کی نعش دفن کیوں ہوگئی، وہ تو اس قابل تھی کہ مزبلہ میں پھینک دیجاتی، بلکہ اُس زمانہ کے بعض مشرکوں کا تو یہ بیان تھا کہ جولین ہمارے ھاتھہ سے قتل نہیں ھوا، بلکہ اُسی کی فوج کے کسی شخص نے اُسے مار ڈالا - یہ الزام اگرچہ کوئی بنیاد نہیں رکھتا، تاہم مسیحیوں کو اس کے تسلیم کرنے میں کچھہ عار نہ تھا - وہ غداری اور کور نمکی کی اس روشن تصویر کو معیوب ھی نہیں سمجھتے تھے، بلکہ اس کی واقعیت کو تسلیم کر کرکے اِس کے جواز بلکہ استحسان کو ثابت کرتے تھے —

ایک مسیحی مورخ کہتا ھے کہ

"ایبانیس نے یہ دعویٰ کیا ھے کہ بادشاہ کسی عیسائی کے ھاتھہ سے قتل ھوا، اور یہ دعویٰ غالباً صحیح ھے - یہ بالکل قرین قیاس ھے کہ خود رومی فوج کے کسی شخص نے اُن قدماء کی تقلید کی ھو جو ملک و قوم کی حریت کے خاطر اپنے مستبد فرمان رواؤں کو ھلاک کر ڈالتے تھے - تو جب ملک و قوم کی حمایت میں بادشاہ کشی قابل ملامت نہیں تو حمایت دین حق

میں اسے کون معیوب کہہ سکتا ہے ؟ "

ایک طرف تو جولین کے ساتھہ یہ سلوک تھا - دوسری طرف فوکس کی وہ آؤ بھگت ، ثنا و صفت تھی ' کہ گویا وہ خدائی کے درجہ پر تھا ، حالانکہ قسطنطنیہ کے تخت پر شاید اس سے زیادہ ذلیل اخلاق کا کوئی شخص نہیں بیٹھا ہے - مگر بات کیا تھی کہ یہ ہر وقت گرجا والوں کی پشت پناہی پر مستعد رہتا تھا ' اور اسی کے صلہ میں اس کی یہ ساری قصیدہ خوانی تھی - یہ ابتدائی پست حالت سے ترقی کرتے کرتے بادشاہ بن بیٹھا - اور سلطان جایز شاہ مارس کو معزول کردیا - اس کے بعد اس نےشاہ معزول کو مع اُس کے پانچوں بیٹوں کے اپنے سامنے پابزنجیر بلایا اور جلاد کو حکم دیا کہ ان سب لڑکوں کو ان کے باپ کی آنکھوں کے سامنے گردن مارے - شاہ‌مارس کے صبر و ضبط کی یہ حالت تھی کہ یکے بعد دیگرے اپنے سب بیٹوں کو قتل ہوتے دیکھتا تھا ' اور زبان سے یہ کہتا جاتا تھا کہ " الہی تیرا نام عادل ہے - تو عدل و انصاف ہی سے فیصلہ کرتا ہے '' چار لڑکے اِسی طرح قتل ہو چکے تھے کہ جب پانچویں لڑکے کی جو بالکل خورد سال تھا ' باری آئی تو اُس کی دایہ نے بکمال شفقت اُسے چھپا کر اپنے لڑکے کو آگے کردیا - مگر مارس بے اختیار پکار اُٹھا کہ اس معصوم کو کیوں مارتے ہو ' یہ میرا لڑکا نہیں - چنانچہ بالآخر وہ پانچواں لڑکا بھی تہ تیغ کیا گیا - یہ سب کچھہ ہوا مگر چونکہ مارس نے پا پایانہ اقتدار کو توڑا تھا ' اس لئےاُس کی یہ تمام مظلومیت و بیکسی غیر موثررہی 'اور ہرطرف سےحیوان سیرت وسفاک‌فوکس کی واہ‌واہ‌ہوتی رہی - بلکہ سینٹ‌گر یگوری نے شاہ فوکس اور اس کی ملکہ کو نہایت مبالغہ آمیز تہنیت‌نامے

لکھے جن میں یہ تک تحریر کردیا کہ آپ کے کارناموں پر آسمان و زمین فخر و مسرت کرتے ھیں - اور ان دونوں کے بت پرستش کے لئے رکھوانے کا حکم دیدیا —

مگر واقعات کی یہ رفتار ، مشرق و مغرب دونوں جگہہ بالکل یکساں نہ تھی ، بلکہ ایک زمانہ تک ان میں کافی اختلاف رھا - مشرق میں قسطنطین نے بالکل مشرقی تزک و احتشام اختیار کیا ، اور اپنی ایسی دھاک بٹھائی کہ سارے اھل کلیسا اس سے مرعوب ھوگئے اور اُس وقت سے مشرقی کلیساؤں کی آزادی کا خاتمہ ھوگیا ، لیکن مغربی کلیسا نے اپنی آزادی کو برقرار رکھا ، اور رومی پادریوں نے یہی نہیں کہ شاھی اشاروں پر چلنے سے انکار کردیا بلکہ متعدد مواقع پر علانیہ شاھی احکام کی مخالفت کرتے رھے - رومہ سے شہنشاھانہ دارالحکومت کے قسطنطنیہ منتقل ھوجانے سے رومی پادریوں کے اقتدار وطلق العنانی میں اور اضافہ ھوگیا ، کہ اب اس مشہور و قدیم تاریخی شہر میں بجز ان کے اور کوئی صاحب اقتدار رھی نہیں گیا تھا - اب رومہ میں حکمراں طبقہ جو تھا وہ بربریوں کا تھا ، جو فوجی طبیعت کے آدمی تھے ، اُنھوں نے بارھا شاھانہ تکلفات و تزک و احتشام کی نقل کرنا چاھی مگر اسے نباہ نہ سکے ، اور اپنا کوئی خاص اثر واقتدار نہ پیدا کر سکے - بلکہ گال میں مرو ونجین خاندان کے سلاطین کا یہ حشر ھوا کہ چند روز کے بعد سارا اقتدار شاھی محل کے داروغہ کے ھاتھہ میں چلا گیا - سلاطین برائے نام حکمراں رہ گئے ، ورنہ در اصل سیاہ و سفید کے مالک یہی داروغہ ھوگئے —

اس صورت حال سے بادشاہ پرستی یا بادشاہ کی نیابت

الہی کا مسئلہ کیونکر پیدا ہوا ؟ اس کی سر گزشت گو عام طور پر معلوم ہے ' تاہم مختصراً ہم بھی بیان کئے دیتے ہیں —

آتھویں صدی میں شاہ لیو نے چاہا کہ گرجاؤں سے بت بالکل اُتھا دئیے جائیں ' تا کہ شرک کا احتمال باقی نہ رہے - قسطنطنیہ کے پادریوں نے اس کی کچھہ مخالفت کی ' مگر بالآخر شاہی اقتدار کے مقابلہ میں ہتیار ڈال دئیے - لیکن پاپائے روم نے اس کی پر زور مخالفت کی ' اور جب دیکھا کہ بادشاہ اپنی ضد سے باز نہیں آتا تو خود اُس کے ارتداد کا فتویٰ دیا ' اور اس طرح اٹلی بالکل خود مختار ہوگیا - اس کارنامہ جرأت سے پاپا کے اقتدار و نفوذ کو چار چاند لگ گئے - اب وہ ساری دنیائے مسیحیت کا رہبر و محافظ تسلیم کیا جانے لگا - لوگ بحیثیت اٹلی کے نجات دہندہ کے اس کی بیحد تعظیم کرنے لگے اور نظام خانقاہیت کا جس کی شاخیں گوشہ گوشہ میں پھیلی ہوئی تھیں ' صدر تو وہ پہلے ہی سے مسلم تھا - پھر اس نے اپنی اس فتح عظیم کے موقع پر جس متانت ' وقار ' و عالی ظرفی سے کام لیا ' اس نے اس کی عظمت کا سکہ اور بھی لوگوں کے دلوں پر بتھا دیا —

لیکن ایک بڑا خطرہ اب بھی باقی تھا ' اور وہ لومبرڈی کے بربری حکمرانوں کی طرف سے تھا ' ان کے پہلے ایک آدہ فرماں روا تو پاپایانہ جبروت و طنطنہ سے ذرا دب گئے تھے ' لیکن موجودہ تاجدار استولفس کسی کو خاطر میں لانے والا نہ تھا ' اس کی طرف سے پاپا کو ہر وقت دھڑکا لگا رہتا تھا ' ادھر خود پاپا کی جنگی قوت اس کے مقابلہ میں شمہ برابر بھی نہ تھی - اور اگر رومہ کی

بقا مد نظر تھی تو خارجی استعانت ناگزیر تھی - ایسی حالت میں پاپا نے سب سے پہلے قدرتی طور پر چارلس مارٹل سے استمداد امداد کی کہ اسی نے یورپ کو مسلمانوں کے قبضہ سے بچایا تھا مگر اُس نے اِدھر ذرا توجہ نہ کی ' بلکہ خوش اعتقادوں کے نزدیک اسی جرم کی پاداش میں اس کی موت ہوئی - اور بعد موت - واصل جہنم ہوا ' اس کی وفات پر پاپا نے اس کے فرزند و جانشین پیپن کی طرف رجوع کیا - اس نے کچھہ تو ہوس ملک گیری اور کچھہ اپنی بڑھی ہوئی خوش اعتقادی کی بنا پر اس درخواست کو منظور کرلیا - اس میں اور پاپا میں ایک معاہدہ ہوا جو آیندہ تاریخ پر خاص اہمیت رکھتا ہے - اس نے یہ عہد کیا کہ پاپا کو دشمنوں کے گزند سے محفوظ رکھے گا - اور پاپا نے یہ عہد کیا کہ اسے وہ مذہبی حیثیت سے تخت نشین کرے گا - مرووِنجین خاندان کو معزول کر کے سارے ملک کی حکومت مذہبی حیثیت سے اُس کے ہاتھہ میں آجاوے گی —

فریقین میں سے دونوں نے اپنے اپنے شرائط کو پوری طرح پورا کیا - اِدھر پیپن نے دو مرتبہ فوج کشی کرکے پاپا کو اُس کے دشمنوں سے مستقل طور پر نجات دلادی ' اور خود اُس کے تفویض ایک ریاست کر کے اُسے پہلی مرتبہ ملکی حیثیت سے بالکل خود مختار کر دیا - اُدھر پاپا نے خاندان مرو ونجین کی معزولی کے بعد ' پیپن کو سارے گال کا فرماں روائے غیر مسئول بنادیا تخت نشینی کے بعد خود اپنے ہاتھہ سے اُس کے سر پر تاج رکھا اور یہ فتویٰ دیدیا کہ یہ نائب خدا ہے ' جو شخص اس کے یا اس کے ورثاء کے احکام سے سرتابی کرے گا

وہ خلیفۃاللہ سے بغاوت کرے گا - اس واقعہ کا ظاہری پہلو تو یہی تھا کہ ہر دو فریق اپنی اپنی جگہہ پر شاد کام رهیں - لیکن درحقیقت تاریخ پر اس کا وسیع و مستقل اثر یہ پڑا کہ ایک طرف پاپا کو سلاطین کے عزل و نصب کا اختیار حاصل ہوگیا ' جس نے آگے چل کر بڑے بڑے اثرات پیدا کئے ' دوسری طرف سلاطین کی نیابت و خلافت الٰہی مسلم ہوگئی یہ حیثیت مشرک سلاطین نے بھی اپنی رعایا کی زبان سے کہلا کر پیدا کرنی چاہی تھی - مگر ظاہر ہے کہ اس کو اتنا استحکام نصیب نہیں ہوسکتا تھا ' جتنا پاپا کی زبان سے ان الفاظ کے نکلنے سے ہوا —

مگر یہ لحاظ رکھنا چاہئے کہ اسقدر مہتم بالشان مسئلہ محض ایک اتفاقی واقعہ کا معلول نہیں ہوسکتا - پاپا کا فتویٰ اگر چہ بجائے خود نہایت قوی اور موثر تھا ' تاہم اُس کی تائید میں کچھہ اور موثرات بھی تھے ' جب جاکر نیابت و خلافت الٰہی کا مسئلہ دلوں میں راسخ ہوسکا - یہ خاص تائیدی موثرات ہمارے نزدیک یہ دو تھے :—

(۱) اول تو نظام خانقاہیت - و رہبانیت کی بنیاد ہی نفس کشی ' خود فراموشی ' تذلل ' انکسار ' فروتنی پر تھی ' اور چونکہ تعلیم و تربیت و لٹریچر کی کنجی انہیں خانقاہ نشینوں و راہبوں کے ہاتھہ میں مدت سے چلی آتی تھی ' اور انہیں کے تربیت دادہ آگے چل کر مدبرین مملکت و واضعین قانون ہوتے تھے ' اس لیے جذبات مذکور کی بنا پر ملک کی خود داری و حریت پہلے ہی رخصت ہوچکی تھی ' اور اس عقیدہ کو قبول کرلینے کے لیے وہ تیار ہوچکا تھا —

(۲) دوسرے نظام جاگیرداری - پہلے صرف رعایا و سلطان '

یہی حاکم و محکوم کے دو طبقے تھے لیکن اب کچھہ عرصہ سے جاگیروں و معافیوں کا دستور نکلا تھا ۰ یعنی بادشاہ ، کچھہ حصہ ملک کا اُمراء سلطنت کو بطور جاگیر و معافی کے دیدیتا ، یہ لوگ اپنے متوسلین کو جاگیریں دیتے ، اور وہ پھر اپنے متوسلین کو - اس نظام کا یہ اثر ہوا تھا کہ ہر شخص اپنے آقا کو براہ راست اپنے سے قریب پاتا تھا ، اور اس طرح بھی خود داری و مطلق العنانی کا خاتمہ ہوچکا تھا - کاشتکار اپنا آقا پٹی دار کو سمجھتا تھا ، پٹی دار ، زمیندار کو ، اور زمیندار خود بادشاہ کو - غرض اس طرح کوئی شخص آزاد و خود مختار نہیں رہ گیا تھا —

لیکن یہ سب چیزیں مل کر بھی اس عقیدہ کی عام اشاعت کے لیے کافی نہ تھیں - عوام پر جتنا اثر حال کا ہوتا ہے ، قال کا نہیں ہوسکتا - اُن کے لیے زبانی تعلیم و ہدایت بالکل نا کافی ہے ، تاوقتیکہ عملی نمونہ موجود نہو - خود رہبانیت کی اشاعت محض دعوت و ارشاد سے اُس وقت تک ہرگز نہوسکی جب تک اس کی تائید میں بعض راہبین عظام کے نمونہ اور زندگیاں دنیا کے سامنے نہ پیش کی جا چکیں - یہ ضرور ہے کہ شروع میں زبانی تعلیم و ہدایت لازمی ہوتی ہے تاکہ لوگوں کو توجہ ہو ، اور بغیر یوں تیاری کئے ہوئے کوئی بڑا شخص پیدا نہیں ہوسکتا ، لیکن پھر اشاعت عام بھی نہیں ہوسکتی تا وقتیکہ کوئی بڑا عملی نمونہ پیش نظر نہو ، کہ عوام کا متخیلہ صرف عملی نمونے ہی سے متاثر ہوسکتا ہے - چنانچہ عقیدہ زیر نظر کا ایک عملی مجسمہ بھی بالآخر

پیدا ہوگیا ، اور وہ شارلمین تھا —

شارلمین حقیقتاً رجال عظام میں سے گزرا ہے - تاریخی حیثیت سے بھی ، اور اساطیر مذہبی کے نقطہ خیال سے بھی ، گو ان دونوں کے حدود بالکل علحدہ اور باہم مختلف ہیں - تاریخی حیثیت سے دیکھئے تو یہ شخص عجیب جامع و ہمہ گیر دماغ کا تھا - مذہب ، علم ، معاشرت سیاسیات ، ہر صیغہ میں اس نے کافی اصلاح کی ، باوجود متعدد اسباب مخالف ، و ناساعدت زمانہ کے اس نے ، گرد و پیش کے بربری قبائل پر بارہا بذات خود فوج کشی کی ، انہیں شکست پر شکست دی ، سلطنت کی رونق و شان میں اضافہ کیا ، بہت سے مفید قوانین وضع کئے ، اہل کلیسا کے ساتھ احسانات بھی کیے ، مگر ہمیشہ اُنہیں اپنے اشارہ پر چلایا ، تعلیم کی اشاعت و تحفظ میں سرگرمی دکھائی ، درسگاہیں اور کتبخانے قایم کئے - اپنے گرد یورپ بھر کے علماء و فضلا کا مجمع رکھا ، ملک کی تجارت کو فروغ دیا ، ٹکسال کی اصلاح کی ، غرض کوئی صیغہ ایسا نہ تھا ، جس میں اُس نے مفید خدمات انجام نہ دی ہوں ، اور بحیثیت مجموعی اُس کے کارناموں نے خلقت کے متخیلہ کو اس قدر متاثر کیا کہ ہر زبان پر اُس کی عظمت کے صدہا افسانے جاری ہوگئے اور جن دماغوں میں پہلے راہبوں و زاہدوں کی پرستش جاگزیں رہتی ہے ، اُن میں اب وہ جگہہ ایک تاجدار عظیم کے تخیل نے لے لی - رہبانیت و خانقاہ نشینی کا اثر اسی وقت سے ماند پڑنے لگا ، اور اس کے بجائے جہاد و غزا کو اہمیت و تقویت حاصل ہوتی گئی —

یہ کارنامے اگرچہ اس کی تاریخی عظمت کے لئے

بالکل کافی تھے ، لیکن عوام کا متخیلہ اُس کی جس شہرت سے متاثر تھا ، وہ اس حیثیت سے نہ تھی ۔ اس کی بنا ایسی روایات پر تھی ، جنھیں تاریخ سے کوئی لگاؤ نہ تھا ۔ مثلاً یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ شارلمین کی ساری عمر قوم سیکسن سے لڑتے بھڑتے گزری ، جن کے اوپر اُس نے ۳۲ حملے کئے ۔ مسلمانوں سے اس نے بہت ہی کم تعرض کیا ۔ مدۃالعمر میں صرف ایک بار اس سے اور مسلمانوں سے مقابلہ ہوا ، وہ بھی بہت چھوٹے پیمانہ پر ، اور پھر اُس میں بھی اُسے ناکامیابی ہوئی ۔ مسلمانوں کا زور توڑنے والا اصل میں چارلس مارٹل تھا ۔ یہ سب تاریخی حقایق ہیں ۔ لیکن شہرت عام کی باطل پرستی دیکھو ، کہ چارلس مارٹل کے سارے کارنامے شارلمین کے نامہ اعمال میں لکھدئے گئے ۔ دنیائے مسیحیت کو مسلمانوں کے پنجے سے آزادی دلانے والا شارلمین قرار پایا ۔ اور چونکہ چارلس مارٹل ، اہل کلیسا کا دوست نہ تھا ، اِس لیے اس غریب کا کوئی نام بھی نہیں لیتا تھا ، بلکہ یہ عام اعتقاد شایع تھا کہ جس شخص نے اپنی ساری عمر جہاد و غزا میں گزاری وہ شارلمین تھا —

شارلمین کا عہد قرون واسطیٰ کے دور اول کا خاتم ، اور مسیحی عسکریت کا بانی تھا ۔ اور اسی عہد پر ہم تاریخ ہذا کو ختم کرتے ہیں صفحات گزشتہ میں ہمیں معلوم ہو چکا ہے کہ آغسطس سے لیکر شارلمین تک عہد بہ عہد اخلاقی تخیل میں کیا کیا تغیرات ہوتے رہے ۔ ہر زمانہ میں لوگ کن کن چیزوں کو اپنا منتہائے مقصود سمجھتے رہے ۔ یوروپین طبایع پر رومی سلطنت کے کیسے وسیع اور یونانی تمدن کے کیسے دقیق اثرات ہوتے رہے ؛ اور یہ کہ رواقی ،

فلاطونی ، و مصری ، فلسفہ اور اخلاق میں کیا تعلقات رہا کئے - ہمیں یہ بھی معلوم ہوچکا ہے کہ یورپین مسیحیت کا کیونکر نشوونما ہوا ؛ معاشری ، سیاسی ، قانونی تغیرات اس کی بدا پر کیا کیا ہوئے ؛ اخلاق کے شعبہ میں اس نے کیا کیا اصلاحیں کیں ، اور پھر اُس میں انحطاط کیونکر پیدا ہوا ، رہبانیت وعدم رواداری کیونکر پیدا ہوئی ، اور بالآخر بربری قبائل کی آمیزش نے اس کی اصل صفائی و پاکیزگی میں کتنی گندگی پیدا کردی - لیکن خاتمہ سے قبل ایک ضروری باب کا اضافہ لازمی ہے - ہم نے اس مسئلہ پر جابجا ضمنی اشارات کئے ہیں ، لیکن اُس کی اہمیت اس کی متقاضی ہے کہ ایک مستقل باب اس کی نذر کیا جائے - یہ مسئلہ یہ ہے کہ عورت کا ہر زمانہ میں کیا مرتبہ (پوزیشن) رہا ہے ، اور اس کا اثر مرد و عورت کے اخلاقی تعلقات پر کیا پڑتا رہا ہے —

باب پنجم

عورت کا مرتبہ

فصل (۱)

انسان کی طرز معاشرت ' جبتک بر بریانہ و خانہ بدوشانہ رہی اس وقت تک حالات کے لحاظ سے یہ ناگزیر تھا کہ عورت کا مرتبہ پست رہے - اس وقت کے انسانی مشاغل کی کوئی فہرست تیار کرنا چاہے ' تو صرف دو عنوانات کافی ہونگے :- جنگ و صید افگنی - لڑنا بھڑنا ' ایک قبیلہ کا دوسرے پر دھاوا کرنا ' حیوانات کا قدم قدم پر مقابلہ کرنا ' بس یہی وہ چیزیں تھیں جن میں وہ لوگ تمام تر مشغول رہتے تھے ' اور ظاہر ہے کہ اس میدان میں عورت مردوں سے بازی نہیں لے جاسکتی تھی - عورت کا سب سے زیادہ قوی حربہ اس کا حسن ہے ' لیکن حیوان خصلت وحشی انسانوں کو حسن و جمال رعنائی و نزاکت کے معنی ہی سے کوئی واسطہ نہ تھا ' عورت کی زندگی کا اصلی دائرۂ عمل ' فوجی زندگی نہیں بلکہ اجتماعی و خانگی زندگی ہے - لیکن خانہ بدوش صحرائیوں کے ہاں اہلی و خانگی زندگی کا سرے سے کوئی مفہوم ہی نہ تھا - اس وقت عورت کے وجود کے صرف دو مقاصد سمجھے جاتے تھے - ایک یہ کہ مرد کی خدمت گذاری کرے ' دوسرے یہ کہ اس کے قوائے شہوانی

کو تسکین دے - اول الذکر حیثیت میں اس کی زندگی غلامی کی انتہائی سختیوں اور ذلتوں کا نمونہ تھی، اور دوسری حیثیت سے بھی ان ناقابل بیان مصائب وآلام کا متحمل ہونا پڑتا تھا، جن کا نمونہ آج بھی سادہ جانوروں میں نظر آتا ہے —

غرض بہ حیثیت مجموعی عورت کی پستی، عالم وحشت و بربریت کا عین اقتضا تھا - تاہم اس وقت بھی وہ جذبات جو آگے چل کر عورت کی عظمت کے عناصر قرار پائے - سرے سے معدوم نہ تھے - وہ موجود تھے، گو ناقص و نامکمل صورت میں - نکاح کی رسم عفت و عصمت کی خوبی، زناکاری پر تعزیر، ان میں سے کوئی شے غیر موجود نہ تھی - اور عورت کے لئے اپنے جذبات شہوانی پر قابو رکھنا سب سے بڑا وصف امتیازی سمجھا جاتا تھا - گو اس کے مقابلہ میں مرد کو بدچلنی سے روکنے کے لئے براہ راست کوئی قانون نہ تھا - عام ارتقاء تمدن کے ساتھہ، عورت کے مرتبہ میں جو ارتقاء ہوا اس کی ابتدائی کڑیاں یہ دو تھیں :—

(۱) رسم خرید ازدواج کا انسداد :

(۲) وحدت ازدواج، اور اس کی بنا پر خاندان کی تاسیس —

قدیم ترین زمانہ میں شادی کا طریقہ یہ تھا کہ لڑکی کے والد اور اس کے آیندہ شوہر کے درمیان ایک قرار داد ہوجاتی جس کی رو سے آخرالذکر اپنے خسر کو ایک رقم معین دیتا، اس کے بعد وہ لڑکی اس کی کنیز زر خرید ہوجاتی - اور وہ رقم اس کی قیمت سمجھی جاتی، ہندو قانون کو چھوڑ کر، جس نے اس بنا پر

اس کی مخالفت کی کہ اس سے لڑکی فروخت ہوجاتی ہے، باقی تمام زمانہ میں ایک وقت یہ دستور عام تھا، چنانچہ اسرائیلیوں اور یونانیوں میں تو رواج کے عام ہونے کی تحریری شہادت موجود ہے - رفتہ رفتہ یونان میں، اس دستور میں یہ ترمیم ہوئی کہ یہ رقم بجائے لڑکی کی قیمت کے اس کے جہیز کے نام سے موسوم کی جانے لگی، یعنی اب سے والد اپنی لڑکی کو فروخت نہیں کرتا تھا بلکہ سسرال میں اس کے مصارف کے لئے اپنے پاس سے کچھ رقم دیتا تھا - اس ترمیم و رواج سے عزت نسواں کی تاریخ پر جو اہم اثرات پڑے وہ دو تھے :- ایک یہ کہ عورت کی حیثیت غلامانہ نہیں رہی، بلکہ معاہدہ ازدواجی میں اس کی حیثیت بھی ایک فریق کی ہوگئی - دوسرے یہ کہ افتراق کے وقت، روما و یونان کے قانون کے بموجب اسے یہ رقم واپس پانے کا استحقاق ہوگیا - جرمنی میں اس سے کسی قدر مختلف دستور رائج تھا - وہ یہ تھا کہ شادی کے وقت نہ لڑکی اپنے ساتھ جہیز لاتی تھی نہ داماد اپنے خسر کو کچھ قیمت دیتا تھا، بلکہ شب نکاح کی صبح کو شوہر خود بیوی کے ہاتھ میں کچھ رقم دیتا - اور یہی رقم آگے چلکر مہر کے نام سے موسوم ہوئی —

اس سے بھی اہم تر نتائج، وحدت ازدواج کی رسم سے پیدا ہوئے، جس کی بنا پر یونان کو اپنے پیشرو مشرقی تمدن پر ہمیشہ سے تفوق حاصل رہا ہے - اس رسم کو خواہ ضمیریت کے نقطۂ نظر سے دیکھئے خواہ افادیت کی عینک سے، اس کی برتری بہر صورت نظر آئےگی - کثیرالازدواج قوموں میں نکاح کا مدعا ہمیشہ شہوت رانی سمجھا گیا ہے، بہ خلاف اس کے مغربی قوموں میں محرک عقد مناکحت فریقین

کی اُلفت و محبت اور حیات منزلی کی تکمیل رہی ہے ' جس سے صاف عیاں ہے کہ وحدت ازدواج فی نفسہ کثرت ازدواج سے اعلیٰ ' اشرف ' و افضل ہے ' پھر اگر حیثیت افادی کو پیش نظر رکھئے - تو بھی یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ کائنات میں ذکور و اُناث کی مساوات تعداد ' مرد و عورت کی مساوات حقوق ' اور امن و خوش نظمی خاندان کو ملحوظ رکھنے کے لئے اس سے بہتر شادی کی کوئی صورت خیال ہی میں نہیں آتی کہ ایک مرد اور ایک عورت کے درمیان تزویج ہو —

یونان کے عہد اولیٰ میں وحدت ازدواج کا دستور عام تھا ' جس میں شاذ و نادر مستثنیات واقع ہوتے تھے ' وہ بھی کسی اہم ضرورت کے وقت جب ملک کی آبادی میں اضافہ ناگزیر ہوجاتا تھا ' لیکن اس موقع پر ناظرین کو یہ ملحوظ رکھنا چاہئے کہ یونان قبل التاریخ میں جس کی تصویر ہومر کے صفحات میں ملتی ہے ' اور تاریخی یونان میں اس خاص حیثیت سے بہت بڑا فرق ہے ' درحقیقت یونان قدیم میں عورت کی جو عظمت مسلم تھی وہ اپنی نظیر آپ ہی کہی جاسکتی ہے - اور گو تمدن جدید آج عظمت نسواں کے صدہا مختلف اسالیب بیان اختیار کرے ' اور ان میں ہر طرح کا تنوع و تجدد پیدا ہو ' تاہم اس کے جو اُصول اساسی یونان قبل التاریخ نے مقرر کردیئے تھے ان میں سر سو اضافہ نہیں ہو سکتا - ہکٹر و انڈ رو ماش کی ازدواجی اُلفت ' پینیلوپ کی وفاشعاری ' الیسٹس کا جانبازانہ عشق ' انتی گان کی پدر پرستی ' پالیکسنا کی جانبازی ' افیجینیا کا ملکوتی صبر و استقلال ' ناسیکا کی عصمت مآبی ؛ یہ تمام قدیم یونانی خواتین ایسی گزری ہیں کہ ان پر

تفوق کیا معنی، ان کی ھمسری تک روم و یورپ کی بہتر سے بہتر مثالیں بھی نہیں کر سکتیں - کنواریوں کی عصمت شعاری اور بیاھیوں کی شوھر پرستی تو یونان قدیم کی سی کہیں دنیا میں کبھی پائی ھی نہیں گئی - مشاھیر کی فہرست میں جس قدر ممتاز نام رجال کے نظر آتے ھیں، اسی قدر خواتین کے بھی ھیں - جنگ ترائے، جس نے مدتوں یونان کی سر زمین کو انسانی خون سے لالہ زار بنائے رکھا کیا تھی ؟ صرف ایک رشتہ ازدواجی کی بے حرمتی کا نتیجہ تھی - لیکن جہاں ان تمام حیثیات سے عورت کی عظمت مسلم تھی، وہاں عورت کی زندگی میں ذلت آمیز عناصر بھی موجود تھے - شوھر، جتنی خانگیاں چاھتا، بے روک ٹوک رکھ سکتا تھا، جنگ میں گرفتار شدہ عورتیں کتنے ھی معزز طبقہ کی ھوں، سخت سے سخت برتاؤ کی مستحق سمجھی جاتی تھیں - ایک عورت نیڈورا کی بابت عام اعتقاد تھا، کہ وھی تمام دنیوی آفات و مصائب کی جڑ ھے - عورت کی پستی، مرد کے مقابلہ میں علانیہ تسلیم کی جاتی تھی اور اس پر یہ عجیب و غریب طبی استدلال پیش کیا جاتا تھا، کہ قوت تناسل صرف مرد میں ھے، اور عورت عمل تولید میں ایک بہت ھی ادنی حصہ رکھتی ھے —

یہ یونان قبل التاریخ کا حال تھا - تاریخی یونان میں عورت کا قانونی مرتبہ گو کسی قدر بلند ھوگیا تھا، تاھم ساتھ ھی اس کی اخلاقی زندگی میں نمایاں انحطاط پیدا ھوگیا تھا - اب با عصمت عورتوں نے بالکل پردہ نشینی اختیار کرلی، اور اس زمانہ سے خواتین یونانی کے مرقع میں جو سب سے ممتاز و نظر فریب

تصویر ہے - وہ وہاں کے طوایف کی ہے - مردوں کے لئے بھی ' اس زمانہ سے بدچلنی معیوب نہیں رہی —

کسی ملک کی تاریخ اخلاق میں جن حقایق پر روشنی ڈالنا سب سے زیادہ دشوار ہوتا ہے ' وہ وہ ہوتے ہیں جن کا تعلق احساسات سے ہوتا ہے ' یہ بتا دینا نسبتاً نہایت آسان ہے کہ کسی ملک کے باشندے فلاں فلاں اعمال و اشغال میں مصروف رہتے تھے ' یا ان کی فلاں فلاں تعلیمات تھیں ' لیکن اُن احساسات و جذبات کا پتہ لگانا جو ان اعمال و اشغال کے محرک تھے ' سخت دشوار ہے اور پھر خصوصاً ایسے ملک کے باشندوں کی کیفیات نفسی کی تشخیص کرنا جن کی طرز معاشرت اور موجودہ طرز معاشرت میں کوئی مناسبت ہی نہیں - اقوام میں شہوت پرستی و ذہانت کے اجتماع کی مثالیں تو متعدد ملتی ہیں ' اور خود فرانس و اٹلی نے اس کے متعدد شواہد ہمارے پیش نظر کر دیئے ہیں کہ نہایت پست اخلاق جماعات میں علم و تخیل بدرجہ کمال موجود رہا ہے - لیکن یونانی زندگی کی بوالعجبی یہ ہے کہ یہاں شہوت پرستی اپنے شباب پر مشاہیر حکماء اخلاق کی نظروں کے سامنے بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ اُنھیں کے ظل عاطفت میں پہنچی اگر آج ہم سے کوئی یہ بیان کرے کہ فرانس کی مشہور طوائف نینادی‌انکلو کے کمرہ میں پیرس کے دیندار اساطین مسیحیت بیٹھے ہوئے اُسے اُس کی دکان عصمت فروشی کی رونق و ترقی سے متعلق مشورہ دے رہے ہیں ' تو ہم میں سے ایک شخص کو بھی اس روایت پر یقین نہ آئے گا - لیکن واقعہ یہ ہے کہ بعینہ یہی تعلق سقراط اعظم اور طوایف تھیو دوتا کے درمیان تھا !

لیکن اگر همیں اخلاقئین یونان کی حیات نفسی کو صحیح طور پر سمجھنا مقصود هے، تو چاهئے کہ سب سے پہلے کچھہ اُس موضوع اهم پر گفتگو هو لے جس کا اخلاق و قانون سے یکساں تعلق هے، یعنی یہ کہ خود طوائفوں کے پیشہ عصمت فروشی کا اخلاقی نقطۂ خیال سے کیا مرتبہ هونا چاهئے؟

قدیم علماء مسیحیت کا ایک مشہور مقولہ هے کہ جذبۂ شہوت انسان کی معصیت اولین هے، اور اس میں شبہہ نہیں کہ علم و سائنس کی موجودہ ترقیوں نے بھی اس راهبانہ خیال کی عملاً تصدیق کر دی هے کہ انسان میں یہ جذبہ نطرتاً اس سے زیادہ رکھہ دیا گیا هے، جتنا کہ نظام عالم کی بہبودی کے لئے لازمی تھا - مالتھس کی تحریروں نے ثابت کر دیا هے کہ اگر انسان اپنے فرایض ازدواجی کو پابندی و اعتدال کے ساتھہ ادا کرتا رهے، تو کچھہ عرصہ میں دنیا کی مردم شماری میں اس قدر غیر محدود اضافہ هو جائے گا - کہ آدمی کو سانس لینا دشوار هو جائے گا، اور دنیا انواع و اقسام کے فتنہ و فساد، مصائب و الام کی آماجگاہ بن جائے گی - نیز یہ کہ گو انسان میں بہت هي نو عمری سے توالد و تناسل کی قابلیت پیدا هو جاتی هے، تاهم ترقی تمدن کا تقاضا یہ هے کہ وسیع و گنجان آبادیوں میں نکاح بہت سن پر پہنچ کر هوا کریں - چنانچہ یہ دستور کسی بھی متمدن جماعت میں نہیں پایا جاتا کہ ابتدائی علامات بلوغ کے ظہور پر نکاح هو جایا کرے، اور سائنس کی روز افزوں ترقی صغر سنی کی شادیوں کو شان سے شان تر کرتی جاتی هے پھر اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ حکماء اخلاق عصمت

و عفت کے مذاقب پر کتنا ہی زور دیں، عملاً اُن کے معیار پر پورا اُترنا کیسا، دنیا کبھی اس کے لگ بھگ بھی نہیں پہنچ سکی ہے، بلکہ ہر قوم، ہر ملک، اور ہر زمانہ میں ایک عظیم‌الشان تعداد ایسے افراد کی پائی جاتی ہے، جو قوانین عصمت کی خلاف ورزی کرتے رہتے ہیں اور دنیا کی موجودہ خرابیوں اور ابتریوں کے اسباب کی اگر تحصیل کی جائے، تو ہر دوسرے سبب کے مقابلہ میں یہ سبب نہایت قوی ثابت ہوگا۔ ان حقایق کو مالتھس نے بہ تصریح ثابت کیا ہے، لیکن کیا عجب ہے کہ اخلاقئین یونان کی نظر سے بھی یہ مخفی نہ ہوں —

حکماء اخلاق اس مسئلہ کو حل کرتے وقت دو چیزوں کا خصوصیت سے لحاظ رکھتے ہیں۔ ایک یہ کہ پرورش اولاد کا بار والد کے سر رہے جو دنیا میں اس کے وجود کا باعث ہوا۔ دوسرے یہ کہ خاندان کا امن و نظام قایم و برقرار رہے۔ کہ حقیقتاً ملک کی خوش نظمی و امن منحصر ہے خاندان کی خوش نظمی و امن پر، اور اجتماعی مسرت کا راز خانگی خلوص و وفا کے اندر مضمر ہے۔ اس کے ساتھ محبت ازدواجی کا یہ خاصہ ہے اور انسان اس پر مجبول ہے کہ جس بچہ کی پرورش و تربیت اُس کے سر پر پڑی ہے، اُس کی بابت اُسے اطمینان کامل ہو کہ وہ اسی کی اولاد ہے، اور یہ اسی خواہش کا نتیجہ ہے کہ جہاں شوہر کو اپنی بیوی کی عصمت پر کچھ بھی شبہہ ہو جاتا ہے، حیات منزلی میں امن و سکون کی جگہ ایک سخت تلاطم برپا ہو جاتا ہے۔ لیکن اسے کیا کیجئے کہ جذبۂ جنسی کی قوت اس قدر شدید ہے کہ جماعت کی طرف سے یہ تمام بندش، یہ ساری روک تھام بے اثر ہو جایا

کرتی ہے، اور ایسے واقعات ہر جگہہ بکثرت پیش آتے رہتے ہیں جن سے امن و نظم خانگی مختل ہوجاتا ہے —

ان تمام حالات کی کشمکش کے درمیان وہ ہستی معرض وجود میں آگئی، جو اخلاقی نقطۂ نظر سے یقیناً سب سے زیادہ مذموم اور بعض حیثیات سے سب سے زیادہ خطرناک ہے - وہ بدنصیب ہستی جو بجائے خود فحش کے مرادف ہے، وہ ناپاک ہستی جو عشق و محبت کے پاک و لطیف جذبات کو جلب منفعت کا آلہ بناتی ہے وہ ہستی جو اپنے تئیں تمامتر دوسروں کی شہوت رانی کے لئے وقف رکھتی ہے؛ وہ ہستی جس کا وجود صنف نازک کے لئے باعث توہین کہا جاتا ہے: اور وہ ہستی جس کی زندگی ذلت و امراض خبیثہ سے لبریز ہوتی ہے، ہمیشہ سے ہر ملک میں موجود رہی ہے، اور اس کا وجود ہر زمانہ میں جبین انسانیت پر معصیت کا ایک مستقل و نمایاں داغ رہا ہے - یہ گو اپنی ذات سے ایک مجموعہ معاصی ہے، تاہم اس کا وجود ہئیت اجتماعیہ کے قیام کا ضامن، اور سب سے بڑا محافظ عصمت ہے - اگر یہ نہ ہوتی تو آج جو شوہر اپنی بیویوں کی عفت شعاری پر نازاں ہیں، ان کی زبانوں پر کلمات محبت و فخر کی جگہ ان کی گردنیں شرم و پشیمانی سے خم ہوتیں، اور ان کے دل رشک و انتقام کے جذبات سے جوش زن ہوتے - ہیجان شہوت کا وہ طوفان جو ایک خاص پیشہ کی عورتوں کے حلقہ کے اندر محدود ہوکر رہ گیا ہے، کسی عورت کا پردۂ عصمت باقی نہ رہنے دیتا، یہ پیشہ وہ ہے جس کی عمر انسانیت کے دامن سے بندھی ہے - مختلف تمدن، مختلف مذاہب، و مختلف اُصول اخلاق، پیدا

ہوئے اور فنا ہوگئے ، لیکن یہ پیشہ جوں کا توں قایم و زندہ ہے —

عیسائی قوموں نے اس طبقہ کی (اور اس طبقہ پر کیا موقوف ہے ہر ایسی عورت کی جس نے قانون عفت کو ملحوظ نہیں رکھا) قسمت کا فیصلہ کرنے میں انتہائی سختی سے کام لیا ہے - اور اینگلو سیکسن اقوام تو اس باب میں اتنی متشدد ہیں کہ ان کے نزدیک اگر کسی عورت سے ایک مرتبہ بھی یہ جرم سر زد ہوجائے تو اسے ایسا داغ لگ جاتا ہے کہ کوئی توبہ و استغفار ، کوئی امتداد زمانہ ، اور کوئی کفارہ اُسے نہیں مٹا سکتا - اور اس تعزیر شدید کی بنا محض نقل پر نہیں ، بلکہ عقل پر بھی سمجھی جاتی ہے - مثلاً یہ کہا جاتا ہے کہ جماعت کے نظام کا دار و مدار تمامتر حیات منزلی کی خوش نظمی پر ہے ، اور اسے برقرار رکھنے کے لئے لازمی ہے ، کہ جو چیزیں اس میں خلل انداز ہوتی ہیں ، انہیں پوری قوت و شدت سے روکا جائے ، اور جماعت کے ہاتھہ میں ذلت و تحقیر کی جو آخری حد ہے ، یہ مجرم اس کے مستوجب قرار دیئے جائیں - اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کے اوصاف مخالف یعنی عصمت و عفت کی خوبیاں از خود عورتوں کے ذہن نشین ہو جائیں گی اور انہیں باعصمت و عفیفہ رکھنے کے لئے شوہروں کی نگرانی بالکل غیر ضروری ہوجائیگی اس سے ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ ان کی اخلاقی زندگی کے دوسرے شعبے بھی ایک بڑی حد تک اصلاح پذیر ہوجائیں گے —

(براہین بالا کے جواب میں فریق ثانی جو دلائل پیش کرتا ہے وہ خالی از وزن نہیں - یہ فریق دلائل ذیل

پیش کرتا ھے :—

(۱) اول یہ کہ یہ دستور متنے والا نہیں - پھر اس قدر سختی سے کیا فائدہ ؟ اس کا نتیجہ صرف یہ نکلتا ھے کہ پہلے جو چیز کُھلے خزانہ ھوتی ' وہ اب منافقانہ انداز سے چرا چھپا کر کی جاتی ھے ' اور یہ اخفاء درحقیقت گناہ کے بوجھہ اور جرم کے وزن کو اور زیادہ بھاری کئے دیتا ھے - طوائفوں کا شمار روز افزوں ھے - سنہ ۱۸۶۴ ع کی مردم شماری کے لحاظ سے انگلستان میں صرف ان طوائفوں کی جن کا نام درج رجسٹر تھا تعداد ۵۰۰۰۰ تھی اور جو چوری چھپے یہ پیشہ کرتی تھیں ان کا تو کوئی حساب ھی نہیں اور اب تو یہ تعداد بدرجہا بڑہ گئی ھے —

(۲) غیر معتدل شرم و حجاب کا نتیجہ یہ ھوتا ھے کہ وہ خبیث و موذی مرض جو زانی شوھر سے معصوم بیوی بلکہ اُس کے بچوں تک منتقل ھوتا رھتا ھے - یعنی آتشک ' اس کی رفتار سرعت کے ساتھہ بڑھتی جاتی ھے اور قانون اس کے اسباب کی باضابطہ تحقیقات اور اس کے انسداد کی تدابیر اختیار کرنے سے جھجکتا ھے —

(۳) وہ خفیف اخلاقی لغزشیں جو دیگر ممالک یورپ میں قابل اعتنا بھی نہیں سمجھی جاتیں بلکہ جو اکثر دو زندگیوں کی باھمی محبت ' مسرت و پاک بازی کا مقدمہ ثابت ھوتی ھیں اُن کا ارتکاب انگلستان میں دائمی بربادی کا پیش خیمہ ھوتا ھے —

(۴) ایک نتیجہ اس طرز عمل کا یہ بھی ھے کہ اطفال کشی کا شمار روز افزوں ھے —

(۵) اس حقیقت کی بیشمار نظیریں ملتی ھیں کہ پاکباز

و عصمت سرشت لڑکیاں جن سے محض ایک بار اتفاقاً لغزش ہوگئی - انہیں سوسائٹی کی اس شدید رائے کے خوف سے اپنی زندگی دائمی عصمت فروشی کی نذر کردینا پڑی ہے —

(۹) پھر یہ حقیقت بھی نظر انداز کئے جانے کے قابل نہیں کہ اس متروک و مردود طبقہ میں اکثر لڑکیاں ایسی بھی ہوتی ہیں جو فطرتاً نہایت سلیم الطبع ، وفا سرشت و نیک خصال ہیں اور جنہوں نے محض کسی مجبوری سے اس پیشہ کو اختیار کیا ہے - مثلاً بعض ایسی ہوتی ہیں جو اپنے فاقہ کش والدین کے لئے ذریعہ معاش اس صورت سے بنتی ہیں یا بعض خود فاقہ کشی کی حالت میں اس پر مجبور ہوتی ہیں و قس علیٰ ھذا —

ان مختلف خیالات سے جنھیں میں نے بغیر جرح و تنقید محض نقل کر دیا ہے - ناظرین کو اس کا اندازہ ہو گیا ہو گا کہ مسئلہ زیر بحث کس قدر اہم و مختلف فیہ ہے - یونانی مقننین و اخلاقئین نے اس کے حل کی یہ صورت نکالی - کہ جنس نسواں کو دو بالکل مختلف طبقوں میں تقسیم کر دیا - ایک گھر والیاں جو شوہروں کی حد درجہ وفادار بیویاں ہوتی تھیں - دوسرے باہر والیاں جو آشنائی کرتی پھرتی تھیں - گھر والیاں سخت پردے کے اندر رہتی تھیں اور عموماً بہت کم سنی میں بیاہ دی جاتی تھیں - ان کے لئے مکان کا ایک پردہ دار حصہ مخصوص ہوتا تھا اور ان کے مشاغل یہ ہوتے تھے - چرخہ کاتنا - سینا پرونا - خانہ داری کا انتظام - اور بیمار غلاموں کی تیمارداری - ان میں سے جو خوشحال ہوتی تھیں وہ بہ استثناء شاذ ، کبھی باہر نہیں نکلتی تھیں اور جب کبھی

نکلتیں تو خادمہ کو ساتھہ لے کر عام مجالس و ملاعب میں
کبھی شرکت نہیں کرتی تھیں ، اور تاو قیتیکہ ان کے شوہر
موجود نہ ہوں کسی مرد سے نہیں ملتی تھیں - اجنبی مرد
کے سامنے کھانا تک نہیں کھاتی تھیں - ان کا سب سے بڑا
جو ہر عصمت تھا جسے انھوں نے غالباً ہمیشہ قایم رکھا - اور
اس حفظ ناموس کے بعض خارجی مویدات بھی تھے - مثلاً یہ
کہ انھیں جادۂ عفت سے ہٹنے کے موقع بھی بہت کم حاصل
ہوتے تھے یا یہ کہ جو مرد انھیں خراب کرنے کی کوشش کرتے
تھے سوسائٹی اُن کے ساتھہ نہایت سختی سے پیش آتی تھی '
نیز یہ کہ مردوں کو جب حظ نفس کے اور وسائل حاصل تھے
تو ادھر متوجہ ہونے کی بھی چنداں ضرورت نہ تھی - ان
کی یہ طرز زندگی گو ایک طرف ان کی عصمت و ناموس
کی سب سے بڑی محافظ رہی لیکن دوسری طرف اس کا یہ
اثر بھی ہوا کہ ان کے قوائے ذہنی کی تربیت نہ ہوسکی
اور ہر وقت لونڈیوں باندیوں کے درمیان گھرے رہنے سے
ان کی نظریں لازمی طور پر پست و تنگ ہو گئیں - گھر
والیوں کی خوبی کا بڑا معیار یہ تھا کہ ان کی بابت نیک
یا بد کسی حیثیت سے بھی سوسائٹی میں کہیں ذکر
نہ آنے پائے —

اپنے اس محدود دائرہ زندگی کے اندر بیویاں غالباً بہت
خوش رہتی تھیں - عادت اور رسم و رواج نے اس مقید
خانگی زندگی کو ان کی فطرت ثانیہ بنا دیا تھا اپنے شوہروں
کی غیر معتدل بد چلنیوں پر یہ عموماً صابر رہتی تھیں -
گھر کے اندر جو اخلاق و آداب رائج تھے وہ بہت ہی
شریفانہ تھے - بیویوں پر کسی طرح کے مظالم کا پتہ نہ
تھا - شوہر زیادہ تر باہر رہا کرتے تھے - جس سے ان کی

بیویوں کو رشک و رقابت کے مواقع بہت کم ملتے تھے اور وہ اِن کے ساتھہ دلی اُلفت و محبت رکھتی تھیں - زنا فن کے ذریعہ سے ہمیں ایک شوہر کی طرز زندگی کی یہ تصویر نظر آتی ہے کہ اس نے ایک پانزدہ سالہ لڑکی سے شادی کی ہے جو بالکل آلھڑ اور دنیا کے حالات سے ناواقف ہے - شوہر اُس کی طرف انتہائی لطف و شفقت سے مخاطب ہوتا ہے - لیکن انداز خطاب یہ ہے کہ گویا کسی بچہ سے گفتگو کررہا ہے وہ اسے سمجھاتا ہے کہ شہد کی مکھیوں کی ملکہ کی طرح اُسے بھی ہر وقت گھر کے اندر اور انتظام خانہ داری میں مصروف رہنا چاہئیے - لونڈی غلاموں کو اُن کے کام پر مقرر کرنا ، خانگی مصارف میں کفایت مدنظر رکھنا ، اسباب خانہ داری ، کپڑے ، جوتے ظروف وغیرہ کو قرینہ سے رکھنا ، یہ سب سےاہم اُس کےفرائض ہیں - ان کے علاوہ اسے اپنے بیمار غلاموں کی تیمارداری بھی کرنا چاہئیے - جب شوہر اپنی تقریر کے اس حصہ پر پہنچتا ہے تو بیوی ایک طفلانہ بے اختیاری کے ساتھہ بول اُٹھتی ہے کہ " ہاں مجھے یہ کام سب سے زیادہ پسند ہے - اگر وہ غلام مجھے زیادہ چاہنے لگیں " پھر شوہر نہایت ملایم لہجہ میں اُسے سمجھاتا ہے کہ اونچی ایڑی کے جوتے پہننے اور چہرہ پر سرخ غازہ لگانے کی عادت کو ترک کردینا چاہئیے - خاتمۂ تقریر پر وہ اس سے کہتا ہے کہ اگر وہ اپنے ان فرائض میں پوری طرح مشغول رہی تو وہ خود اُس کا سب سے زیادہ اطاعت کیش و وفا شعار غلام بن جائے گا —

حیات از دواجی کی ایک تصویر پلو ٹارک کے صفحات میں بھی ملتی ہے - مگر وہ بہت آخر زمانہ کی ہے - یہ وہ زمانہ ہے جبکہ بیوی کی حیثیت محض مکان دار یا داروغہ

کی نہیں رہ گئی تھی بلکہ وہ شوہر کی زندگی میں اس کی شریک و سہیم ہو گئی ہے ۔ اب شوہر یہ چاہتا ہے کہ اس کی بیوی اعلیٰ درجہ کی تعلیم یافتہ ہو اور وہ خود اُسے اس کے حقوق کی پر زور طریقہ پر تعلیم دیتا ہے ۔ نکاح کا طریق و اسلوب جو وہ بیان کرتا ہے اُس کا بھی معیار اسی قدر بلند ہے جتنا موجودہ زمانہ کا ہے ۔ بچہ کی وفات پر شوہر بیوی کے نام تعزیت نامہ لکھتا ہے ۔ جس کے حرف حرف سے محبت و الفت ٹپکتی ہے ۔ اسی شوہر سے اور اس کے سسرالی اعزہ سے کچھہ بے لطفی ہوگئی تھی ۔ بیوی کو خیال گزرا کہ کہیں اس کا اثر خود ان دونوں کے باہمی تعلقات پر نہ پڑے ۔ یہ خیال آتے ہی اس نے شوہر کو اپنے ہمراہ سفر پر آمادہ کیا ۔ اسے لے کو مقدس پہاڑی کوہ ہیلیکون پر گئی ۔ جہاں عشق کی دیوی کا مندر تھا ۔ اس کے آگے قربانی چڑھائی اور دونوں نے مل کر یہ دعا کی کہ ان کی باہمی اُلفت و محبت تا زیست کبھی نہ کم ہو —

بایں ہمہ بہ حیثیت مجموعی ' باعصمت یونانی بیوی کا مرتبہ بہ غایت پست تھا ۔ اس کی زندگی مدۃالعمر غلامی میں بسر ہوتی تھی ۔ لڑکپن میں اپنے والدین کی جوانی میں اپنے شوہر کی اور بیوگی میں اپنے فرزندوں کی وراثت میں اِس کے مقابلہ میں اس کے مرد اعزہ کا حق ہمیشہ راجح سمجھا جاتا تھا ۔ طلاق کا حق اُسے قانوناً ضرور حاصل تھا ۔ تاہم عملاً وہ اس سے بھی کوئی فائدہ نہیں اُٹھا سکتی تھی کہ عدالت میں اس کا اظہار دینا یونانی ناموس حیا کے منافی تھا ۔ البتہ وہ اپنے ساتھہ جہیز ضرور لاتی تھی اور اپنی لڑکیوں کو بھی شادی کے وقت جہیز دینا اُس کے فرایض میں داخل تھا ۔ دوسری بات یہ بھی تھی کہ اثینیا کا قانون یتیم لڑکیوں

پر خاص طور سے مہربان تھا - لیکن بس اِن دو باتوں کے سوا اور کوئی شے حقوق نسوان کی تائید میں نہیں پیش کی جاسکتی - فلاطون نے بے شبہ مرد و عورت کی مساوات کا دعویٰ کیا تھا - لیکن یہ تعلیم محض زبانی تھی - عملی زندگی اس سے بالکل غیر متاثر رہی - ازدواج کا مقصد خالص سیاسی رکھا گیا تھا - یعنی یہ کہ اس سے طاقتور اولاد پیدا ہو جو حفاظت ملک کے کام آئے - اور اسپارٹا کے قانون میں تو یہ تصریح موجود تھی کہ مسن و ضعیف القویٰ شوہروں کو اپنی کمسن بیویاں کسی نوجوان کے حبالۂ نکاح میں دیدینا چاہئیے - تاکہ فوج میں قوی سپاہیوں کی تعداد میں اضافہ ہو - یہ نقطۂ خیال گو جذبات محبت و الفت کا قاطع تھا، تاہم اس سے اہل اسپارٹا میں ایک مردانہ حب وطن ضرور پیدا ہوگیا تھا - ایسی اسپارٹن عورتوں کی بہ کثرت مثالیں موجود ہیں، جنھوں نے وطن پرستی کے مذبح پر اپنی اولاد کو قربان کردیا - اور جنھوں نے راہ وطن میں اُن کی شہادت پر علانیہ اظہار فخر و مسرت کیا - یہ سب کچھ تھا - لیکن یونانی تاریخ کے صفحات میں باعصمت گھر والیوں کے نام شاذ و نادر ہی نظر آتے ہیں - ایک اثینیا کے سردار فوکیون کی بیوی اور گنتی کی چند اور بیویوں اور بیٹیوں کے ایثار کے واقعات، بس یہی ساری یونانی تاریخ میں شریف گھر والیوں کے کار ناموں کی کائنات ہیں - البتہ صنف نازک کے جس طبقہ کی تعداد کثیر نے اِس وقت شہرت و امتیاز حاصل کیا وہ تمامتر دوسرے طبقہ کی عورتیں تھیں جن کا نام اوپر گزر چکا یعنی باہر والیاں یا بازاریاں —

اس طبقہ کو یونانی حیات اجتماعی میں جو مرتبہ حاصل تھا - اُسے پوری طرح سمجھنے کے لئے ہمیں اپنے تئیں ایک ایسی فضائے اخلاق میں موجود فرض کرنا چاھئے جو موجودہ اخلاقی فضا سے بالکل متبائن ومتغائر تھی - تکملہ اخلاق بشری کا تخیل یونانیوں کے ذھن میں یہ تھا کہ انسان بلا کسی زھد و رھبانیت کی آمیزش کے اپنے تمام قوائے فطری و اعضا کے مقتضیات و مطالبات کو پورا کرتا رھے - اس قدر اُنھیں بلاشبہ مسلم تھا کہ انسانی قویٰ میں فرق مراتب ھے - اور یہ کہ ادنیٰ خواھشات کا دل و دماغ پر غالب آجانا دون نفس کی علامت تھی - لیکن یونانی دماغ کے لئے یہ عقیدہ بالکل غیر مفہوم تھا کہ کسی فطری خواھش کو سرے سے دبائے رکھنا چاھئے مقنّنین ، حکماء اخلاق ، اور عام افراد اس تخیل کے نہ صرف دل سے قایل تھے ، بلکہ جہاں تک حیات جنسی کا تعلق ھے اس پر بے تکلف عامل بھی تھے - چنانچہ اُن کے مقدس ترین اشخاص عادۃً بالاعلان ایسے افعال کے مرتکب ھوتے تھے جو ھمارے نقطۂ خیال سے بیحد معیوب و شرمناک خیال کئے جائیں گے —

قطع نظر اس عام سبب کے کہ ایک جنس کی غیر محدود آزادی عموماً جنس مقابل کی سلب حریت کا باعث ھوتی ھے - یونان میں اور بھی متعدد اسباب ایسے جمع ھوگئے جنھوں نے وھاں زنا بازاری کے مرتبہ کو اس قدر ممتاز و بلند کردیا کہ دنیا کی کسی جماعت میں اس کی نظیر نہیں ملتی - عشق کی دیوی ایفرد ڈایت کی پرستش نے گویا ان کے پیشہ پر مذھبی استناد کی مہر لگادی تھی - اس کے مندر کی پجاریاں ، زنان بازاریاں تھیں -

اور کارنتھہ کی درگاہ کے مجاور بھی اسی طبقہ کی عورتیں تھیں، جن کی بابت روایت ہے کہ انھیں کی دعاؤں سے شہر مصائب شدیدہ سے محفوظ و مصئوں رہا بلکہ منقول تو یہ ہے کہ بابل بابلیس، سائپرس وکارنتھہ میں عصمت فروشی، جزو مذھب بن گئی تھی - اور ان مقامات کے علاوہ - میطس تین دوس، لیسبوس، و ابیڈوس - عصمت فروشی کے لئے خاص شہرت رکھتے تھے - جو معابد کے ظل عاطفت میں پروان چڑھ رہی تھی —

مذھبی عنصر کے شمول کے علاوہ ایک اور بڑا سبب یہ بھی ھوا کہ یونان میں حسن پرستی کا جو مذاق رائج تھا - اس کا لازمی نتیجہ اس خیال کی صورت میں ظاھر ھوا کہ جو سب سے زیادہ حسین ہے - وہ سب سے زیادہ معزز ھے مناظر طبیعی قدرتاً خوشنما، اھل صنائع حسن کی مرقع نگاری پر تلے ھوئے غرض ھرشے حسن و جمال کی آب و ھوا میں نشو و نما پاتی تھی - دنیائے ادب کی جان حسن ادا تھی - اھل صنعت کا کمال فن یہ تھا کہ نقاش یادستکار حسن صورت کی نقل کو اصل سے ملادے - مائیں اپنی دعاؤں میں سب سے مقدم دعا یہ رکھتی تھیں کہ اولاد حسین پیدا ھو - خود اھل حکمت و معلمین اخلاق فضیلت اخلاقی کی تعریف کے لئے پیرایۂ بیان یہ اختیار کرتے تھے کہ وہ نام ھے ایک غیر مادی و اکمل ترین حسن و جمال کا - غرض ھرشعبۂ حیات میں حسن و جمال کو انتہائی عظمت و احترام کا مرادف سمجھا جاتا تھا، اور جو طوائفیں ھوتی تھیں وہ گویا حسن کی پتلیاں ھوتی تھیں یہ اسی کا اثر تھا کہ عشق کی دیوی کا بت، جو سارے ملک کا مرجع عظمت و عقیدت تھا،

ایک طوائف کی شکل میں تھا، مشہور نقاش پریکزتیلس اپنی آشنا فراینی کے مجسمہ تیار کرتا تھا جس کا ایک طلائی مجسمہ اپالو کے مندر میں بھی رکھا گیا - اس پر لوگوں نے غل مچایا کہ اس سے نوجوانوں کے اخلاق بگڑے جاتے ہیں اور بالآخر عدالت سے چارہ جوئی کی - فراینی مدعا علیہا قرار پائی - لیکن عین دوران مقدمہ میں وکیل ھایپریدس نے دفعتاً اپنی پری جمال موکلہ کو حاکمان عدالت کے سامنے لاکر بے نقاب کر دیا - حکام اس کے فرط حسن سے مبہوت ہو گئے، اور ملزمہ کو فوراً بری کر دیا اپیلس اس زمانہ میں بہت مشہور نقاش تھا - سکندر اعظم نے اُسے اپنی خاص محبوبہ لایس کا مجسمہ تیار کرنے کو بلایا - اپیلس نے مجسمہ تیار کر دیا - لیکن اس اثنا میں خود بھی اس پر فریفتہ ہوگیا - اس کی محنت کا سب سے بڑا صلہ جو سکندر نے دیا وہ یہ تھا کہ خود لایس کو اس کے حوالہ کردیا - اسی طرح اس وقت جو شخص پھولوں کی تصویر کشی کا سب سے بڑا استاد گنا جاتا تھا، اُسے اپنی صنعت میں کمال یوں حاصل ہوا تھا کہ وہ ایک پھول بیچنے والی لڑکی پر مفتوں تھا، اور پھولوں سمیت اُس کی تصویر کھینچا کر تا تھا - رفتہ رفتہ اس طرح اُس کو خاص پھولوں کی مصوری میں ماہر فن کا مرتبہ حاصل ہوگیا - پنڈر ارو سموینڈس جیسے مشاہیر شعراء علانیہ طوائفوں کی مدح و ثنا میں قصائد کہتے تھے، اور بڑے بڑے حکما و فلاسفہ زنان بازاری سے بالکل غیر مخفی راہ و رسم رکھتے تھے —

ایسی حالت میں اگر اُس وقت کی اکثر اعلیٰ تعلیم یافتہ و بلند نظر خواتین زنان بازاری کی صف میں شامل ہوجاتی

تھیں تو اس میں حیرت کی کیا بات ہے ؟ پردہ میں رہ کر سوسائٹی میں نام و نمود حاصل کرنا ناممکن تھا - درحقیقت سارے اٹھینیا میں جو عورتیں آزاد کہی جا سکتی تھیں ' وہ صرف اسی طبقہ کی ہوتی تھیں اور وہ خود اس آزادی سے یہ فائدہ اُٹھاتی تھیں کہ اعلیٰ تعلیم و تربیت سے اپنی دلفریبیوں کی فہرست میں ایک اور عنوان کا اضافہ کر لیں - ان کے گرد ہر وقت مشاہیر شعرا ' ماہرین فنون لطیفہ مورخین و فلاسفہ کا مجمع لگا رہتا تھا - یہ اُن کے علمی و ادبی مشاغل میں حصہ لیتی تھیں اور اکثر ان کا مکان ایک بہترین علمی صحبت کا مرکز ہوتا تھا - مشہور مدبر و خطیب پیریکلس کی معشوقہ حسن و جمال کے ساتھ علم و فضل میں بھی یگانہ روز گار تھی - بلکہ روایت تو یہاں تک ہے کہ پیریکلس کو فن خطابت کی تعلیم اسی ایسپیسیا نے دی تھی اور اُس کے بہترین خطبات اسی کے املا کئے ہوئے ہوتے تھے - اہم معاملات میں یہ مشیر کا کام دیتی تھی - اور دیگر حکما سے قطع نظر کرکے خود سقراط اس کی مجلس میں شریک ہوتا تھا ' اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ سقراط خود اپنی تعلیم کے لئے جس کا بہت زیادہ ممنون تھا وہ بھی ایک طوائف ڈیوٹیما تھی - اور اپیکورس (بانی فرقہ لذتیہ) کے ممتاز ترین تلامذہ میں بھی ایک طوایف لیونٹیم کا نام نظر آتا ہے —

اسباب بالا کے علاوہ ایک اور سبب قوی بھی اُس وقت موجود تھا ' جس کا ذکر کرتے ہوئے بھی ہم ہچکچاتے ہیں - لیکن تاریخ نگاری کے فرایض پر رسمی شرم و حیا کا جذبہ غالب نہیں آ سکتا اور اس لئے ہمیں بادل نا خواستہ ذکر کرنا ہی پڑتا ہے - اس سے ہماری مراد - محبت خلاف

وضع فطری سے ھے - جو مرد و مرد کے درمیان پائی جاتی تھی - اور اس کے مقابلہ میں زنا کاری یقیناً بسا غنیمت تھی اس بیہودگی کا پتہ ھومرو ھیسیڈ کے صفحات میں نہیں چلتا ' لیکن عام مردانہ ورزشوں کی کثرت نے جن میں مرد بالکل برھنہ ھو جاتے تھے ' لوگوں کی طبیعت کو اس جانب مایل کر دیا ' تا آنکہ کچھہ روز میں یہ عادت خبیث یونانی تمدن کے رگ و ریشہ میں سرایت کر گئی اور اس سے محترز رھنا ایک غیر معمولی زھد و اتقا کی دلیل سمجھا جاتا تھا ۔ رفتہ رفتہ مذھبی عنصر کی اس میں بھی آمیزش ھو گئی - یعنی دیوتاؤں کے خدام ۔ مردوں کی شکل میں دکھائے جانے لگے ۔ اور بڑے بڑے صناع اپنی صناعیوں کا نمونہ انھیں کے مجسموں کی تعمیر میں ظاھر کرنے لگے - اصولاً اسے جواز کا مرتبہ کبھی حاصل نہیں ھوا - بلکہ ھمیشہ یہ ناجائز ھی قرار دیا گیا - لیکن عملاً یہ عادت اس قدر عام تھی کہ ھمارا وھم و گمان بھی وھاں تک مشکل سے پہنچ سکتا ھے - حد یہ ھے کہ سب سے پہلے یونانیوں نے اپنے جن دو ھموطنوں کے مجسمہ بطور یادگار نصب کرائے وہ ھارموڈیس واستوجیشن وہ دو مرد تھے ۔ جن کے درمیان یہی غیر فطری تعلق تھا *—

ھر بڑی برائی کے مقابلہ میں چھوٹی برائی قابل ترجیح

---

* زیلو ' بانی فرقۂ رواقیہ زھد و اتقا ' خشک مزاجی و تعبس کی تصویر تھا - اُس کی بابت ڈیوجانس لیرٹیس نہایت مسرت سے لکھتا ھے کہ " وہ افلام سے برائے نام شوق رکھتا تھا " - مشہور شاعر سوفکلس کو اس کا خصوصیت کے ساتھہ شوق تھا ۔

ہوتی ہے - اغلام کے مقابلہ میں زناکاری بدرجہا بہتر تھی ' اسی سبب سے طوائفوں کا مرتبہ اتنا پست نہیں ہونے پایا جس کی وہ مستحق تھیں تاہم اس میں شبہہ نہیں کہ اخلاقی نظر سے وہ انتہائی پستی و تذلل کے غار میں دھنسی ہوئی تھیں اور اُن میں شاذ و نادر ایسی نکلتی تھیں جنھیں ہم خانگیوں کے درجہ میں بھی رکھہ سکیں - بیوفائی ' حرص زر ' شہوت پرستی وغیرہ جو اوصاف اس طبقہ کی عورتوں میں عموماً ہوتے ہیں وہی اُن میں بھی تھے - گویہ ضرور ہے کہ اس کلیہ میں متعدد مستثنیات بھی تھے - مثلاً ہارموڈیس کی آشنا لینا اس قدر باوفا تھی کہ پولیس کی سختیوں سے مرگئی - مگر اپنے آشنا کے جرایم کا کسی طرح افشا نہ کیا - اس کی یادگار میں یونانیوں نے ایک شیرنی کا مجسمہ نصب کرایا ' جس کے زبان نہ تھی - اسی طرح ایک اور طوائف بیک کس کی خوش اخلاقی و ہردلعزیزی بھی مشہور ہے - اصل یہ ہے کہ سوسائٹی نے گھر والیوں اور بازاریوں کے چونکہ فرایض و حدود عمل بالکل علحدہ قرار دیدئے تھے - اس لئے بازاریوں سے اُن اوصاف کی توقعات ہی نہیں رکھی جاتی تھیں جو گھر والیوں کے ساتھہ مخصوص تھے اور نہ اُن سے اُن کے پیشہ سے متعلق گفتگو کرنا کچھہ معیوب خیال کیا جاتا تھا - زنافن روایت کرتا ہے کہ سقراط کے کان تک جب مشہور طوائف تھیوڈیٹا کے حسن و جمال کا شہرا پہنچا تو وہ اس کی تصدیق کے لئے خود اُس کے مکان پر مع اپنے تلامذہ کے پہنچا - یہاں پہنچکر اُس نے تھیوڈیٹا سے اُس کے نفیس مکان و سامان آرایش وغیرہ سے متعلق استفسارات کئے - اور جب ان کے جواب میں معلوم ہوا کہ یہ سب اسی پیشہ

کی آمدنی سے ہوا ہے - تو سقراط نے طوایف کو بجائے کسی قسم کی اخلاقی پند و موعظت کے اس کے پیشہ کے فروغ کی تدابیر بکمال فصاحت بیان کرنا شروع کیں - مثلاً یہ کہ اسے چاہئے کہ بد تمیزوں کو اپنے یہاں نہ آنے دے اپنے عاشقوں کی بیماری میں عیادت کرے - اپنے چاہنے والوں کو خود بھی چاہا کرے - وقس علیٰ ھذا اس لکچر کے خاتمہ پر یہ حکیم اعظم' طوایف کے حسن و جمال کا اعتراف کرتا ہے اور بکمال سنجیدگی و متانت واپس چلا آتا ہے !

ان نا خوش گوار واقعات کا ذکر مجھے اپنے فرایض کے خیال سے مجبوراً کرنا پڑا کہ بغیر ان کے تاریخ اخلاق اجمالاً بھی نامکمل رہ جاتی - اب ناظرین کی سمجھ میں یہ مسئلہ آگیا ہوگا کہ جس سر زمین سے اس قدر مشاہیر رجال پیدا ہوئے وہاں باکمال خواتین کیوں اس قدر کمیاب ہیں ؟ اس دور کی یونانی اخلاقی زندگی کی اہم دفعات کو ہم بطور خلاصہ یوں رکھہ سکتے ہیں :-

(۱) یونانی اخلاقئیں کو بھی گو ہماری طرح جذبات بشری میں اصولاً فرق مراتب تسلیم تھا تاہم اس کی تعین میں ہمارے مطمح نظر سے ان کا معیار اخلاق بالکل جدا گانہ تھا —

(۲) یہ مسیحی تعلیم کہ بجز نکاح کے اور ہر صورت سے مرد و عورت کا تعلق نا جائز ہے ' یونانی دماغ کے لئے بالکل غیر معلوم تھی —

(۳) بیویوں پر سخت فرایض و ذمہ داریاں عاید تھیں - شوہروں پر بھی یہ ذمہ داریاں عاید کی گئیں ' مگر بہت ہلکی اور بہت آخر زمانہ میں —

(۴) جرایم خلاف وضع فطری کی وہ گرم بازاری تھی ' کہ هم اُس کے سننے کی بھی تاب نہیں لاسکتے —

(۵) شادیوں کا رواج کم ہوتا گیا اور لوگ ناجائز تعلقات کھلے خزانے رکھنے لگے —

(۶) خانگیاں و بازاریاں ' اگرچہ گھروالیوں کے مقابلہ میں عزت و عظمت کچھہ بھی نہیں رکھتی تھیں ' تاهم جو کشش اُن میں تھی اور جو مقبولیت اُنھیں حاصل تھی اُس سے بیویاں بالکل محروم تھیں —

فصل (۲)

روما کی اخلاقی زندگی کی افضلیت

رومی تمدن کی تاریخ پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کی اخلاقی زندگی یونان سے بدرجہا بر تر تھی - یہ هم کہیں پہلے کہہ آئے ہیں کہ عفت و عصمت کی خوبی پر دو مختلف پہلوؤں سے نظر کی جاسکتی ہے - ایک مادیت کے نقطہ خیال سے دوسرے روحانیت کے پہلو سے مادی پہلو جو ان ممالک میں غالب ہے جہاں مذہبیت کم اور سیاست زیادہ ہے یہ ہے کہ نکاح اشرف الاعمال ہے کہ حکومت کا قیام نظام و فلاح اسی کے دم سے وابستہ ہے - روحانی عقیدہ جو ان ممالک میں شایع ہے جہاں سیاست کا زور کم اور مذہب کا غلو زیادہ ہے یہ ہے کہ شرم و حجاب اُم‌الفضائل ہے عورت کا

مطمح نظر مدت العمر کی دوشیزگی ہونا چاہئے اور نکاح دیگر بکارت شکن صورتوں کے مقابلہ میں غنیمت ہے - بس ٹھیک انہیں دونوں خیالات کی مطابقت میں روما میں دو مختلف مذہبی سلسلے قایم تھے - ایک مردانہ سلسلہ تھا جس کے ارکان فلیمن کہلاتے تھے دوسرا زنانہ سلسلہ تھا جو کنواریوں پر مشتمل تھا - دونوں کا انتہائی احترام و تقدس ملحوظ رکھا اور دونوں گویا مذہب کے کلید بردار سمجھے جاتے تھے - فرق صرف یہ تھا کہ اول الذکر حرمت ازدواجی کا مظہر تھا اور آخرالذکر دوشیزگی و کنوار پن - پاک کنواریوں کے چھیڑنے والے کو سخت سے سخت ممکن سزائیں دی جاتی تھیں اور ہر فلیمن کے لئے متاہل ہونا لازمی تھا بیوی کو وہ کسی حالت میں نہیں چھوڑ سکتا تھا - اور اگر بیوی فوت ہو جاے تو وہ اپنے عہدہ سے ہٹا دیا جاتا تھا - مگر اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ ان دونوں سلسلوں میں سے سلسلۂ فلیمن ' رومی جذبات کا بہتر و صحیح تر ترجمان تھا - کیونکہ رومی مذہب تمامتر ایک خانگی مذہب تھا - اور قانون کا مدعاے خاص یہ تھا کہ رسم ازدواج کو ہر قسم کے شرف و احترام کا مرکز رکھا جائے وحدت ازدواج کا دستور قدیم سے چلا آتا تھا اور پوری پابندی کے ساتھ بلکہ یہ رومی ہی تمدن کا ایک احسان ہے کہ یورپ میں بھی یہی دستور رواج پا گیا - روما کے جو قدیم ترین افسانے ہیں ' اُن میں بھی عورت کے مرتبۂ عالی اور رومی زندگی میں اُس کے نمایاں حصہ لینے کی صاف تعلیم نکلتی ہے - لکریشیا و ورجینیا سے زیادہ کس نے دنیا میں ناموس شوہری کی حفاظت میں جانبازی سے کام لیا ہے ؟ یا سابی عورتوں اور کوریولینس سے بڑھ کر کون حب وطن کا ثبوت

دے سکتا ہے؟ ایک مندر روما میں اُن خواتین کی یاد گار میں تعمیر تھا جنھوں نے اپنی زلفیں کاٹ کر سپاہیوں کو دیدیں تاکہ کمانوں کی ڈوریوں کا کام دے سکیں۔ ایک اور مندر ایک ایسی خاتون کے نام کو قایم کئے ہوئے ہے جس کی ماں قید خانہ میں گرسنگی سے ہلاک ہونے کے واسطے رکھی گئی تھی، مگر جس نے تن تنہا اندر جا جا کر اُسے اپنا دودھ پلا کر زندہ رکھا —

عورت کا مرتبہ رومی قانون نے البتہ ایک عرصہ دراز تک نہایت پست رکھا۔ افسر خاندان جو باپ ہوتا یا شوہر، اُسے اپنے بیوی بچوں پر پورا اختیار حاصل تھا اور وہ عورت کو جب چاہے گھر سے نکال سکتا تھا۔ جہیز یا دلہن کے والد کو نذرانہ دینے کی رسم کچھ بھی نہ تھی اور باپ کو اس قدر اختیار حاصل تھا کہ جہاں چاہے اپنی لڑکی کو بیاہ دے، بلکہ بعض دفعہ تو وہ کی کرائی شادی کو توڑ سکتا تھا۔ زمانہ ما بعد، یعنی دور تاریخی میں یہ حق باپ کی طرف سے شوہر کی طرف منتقل ہوگیا اور اب اس کے اختیارات یہاں تک وسیع ہو گئے کہ وہ چاہے تو بیوی کو قتل تک کر سکتا تھا۔ ۵۲۰ سال تک طلاق کا کسی نے نام بھی نہیں سنا۔ آداب معاشرت اس قدر سخت تھے کہ ایک ممبر سینٹ کو محض اس جرم میں سزا ملی کہ وہ اپنی لڑکی کے سامنے اُس کی ماں یعنی اپنی بیوی کا بوسہ لے کر فحش کا مرتکب ہوا اور کسی ماں کے لئے اپنے بچہ کی رضاعت دایہ سے کرانا سخت توہین کا باعث سمجھا جاتا تھا۔ خانگی زندگی کے جزئیات تک قانونی شکنجہ میں کسے ہوئے تھے۔ کسبیوں کا طبقہ گو بہ لحاظ تعداد بہت بڑا تھا لیکن نہایت ذلت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ ان

کے لئے جونو کے مندر کی قربان گاہ کو چھونا ممنوع تھا۔ اور ان کے لئے سب سے بڑی لعنت یہی سمجھی جاتی تھی، کہ انہیں اپنی زبان سے اپنے شرمناک پیشہ کا اعتراف کرنا پڑے - ایک سرکاری افسر کی بابت یہ واقعہ منقول ہے کہ اس پر حملہ ہوا مگر اس کا استغاثہ محض اس لئے غیر مسموع رہا کہ محل واردات ایک کسبی کا مکان تھا عورت کے ناموس و حیا پر تمام کارخانۂ فطرت گواہ سمجھا جاتا تھا - بڑے بڑے وحشی و خونخوار جانور باکرہ عورت کے سامنے سرنگوں ہوجاتے تھے - برہنہ عورت اگر کھیت کے گرد پھرتی تو حشرات الارض مرجاتے - غرق شدہ مردوں کی تلاش سیدھی تیرتی، لیکن غرق شدہ عورتوں کی اوندھی تیرتی، جو بقول رومی سائنس دانوں کے عورت کی افضلیت کی دلیل تھی —

ارسطو، کا دعوی تو یہ تھا کہ وحشیوں پر یونانیوں کی افضلیت کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ ان کی طرح یونانی اپنی بیویوں کو غلام نہیں سمجھتے بلکہ بطور اپنے رفیق و شریک زندگی کے رکھتے ہیں - لیکن ہمارے نزدیک یہ دعوی بجائے یونانیوں کے رومیوں کے منہ پر زیادہ کھلتا ہے اور جیسا کہ ایک رومی مصنف نے لکھا ہے یہی ایک امر یونانی تمدن کے مقابلہ میں رومی تمدن کے شرف و فضل کے لئے بس کرتا ہے - بہ قول اس کے یونانیوں کا طرز عمل اپنی بیویوں کے ساتھہ یہ تھا کہ انہیں اپنی محلسراؤں کے اندر مقید رکھتے تھے اور بجز اپنے اور کسی مرد کے ساتھہ کھانے نہیں دیتے تھے - بہ خلاف اس کے رومی شوہر نے اپنی بیوی کو ہر طرح کی آزادی دے رکھی تھی - ہمیں اس امر

کا صحیح علم نہیں کہ جس زمانہ میں روسی بیویاں تمام تر اپنے شوہروں کی مملوک ہوتی تھیں، اس وقت خانگی زندگی میں مسرت کہاں تک رہتی تھی، لیکن یہ تقریباً یقینی ہے کہ ازدواجی خلوص و وفا شروع سے روسی زندگی کا جزو رہی ہے اور جس روسی مقنن نے نکاح کی یہ تعریف کی کہ وہ دینی و دنیوی حقوق کے دایمی اتحاد و اشتراک کا نام ہے اس نے اپنے ہموطنوں کے ہر دور کے تخیل و طرز عمل کی صحیح ترجمانی کردی —

جمہوریت کے خاتمہ پر اور قیاصرہ کے عہد میں روسی اخلاق میں جو انحطاط عظیم پیدا ہوگیا اس کے اسباب اہم کا ذکر ہم کہیں پیشتر کرچکے ہیں - یہ انقلاب ایسا جامع و ہمہ گیر تھا جو مذہب معاشرت، سیاست، غرض ہر شعبۂ حیات میں سرایت کر گیا تھا - فلاسفہ کی تشکیک نے قدیم مذاہب کی جڑ کاٹ دی تھی مشرقی تعیش و مشرقی بد اخلاقیوں کا ایک سیلاب آگیا تھا اور ایسی حالت میں زناکاری کے واقعات خاص طور پر نمایاں و کثیرالتعداد ہوگئے تھے - غلاموں کی گھر گھر کثرت اور غلام بھی ایسے جو دنیا بھر کے آوارہ خاندانوں کے چھٹے ہوئے، یونانی و ایشیائی خانگیوں کا داخلہ، ہر گھر میں فحش تصاویر لگانے کا دستور، تھیٹروں میں ایکٹروں کی نہایت حیا سوز حرکات و اعمال، دولت و ثروت میں دفعتہً افزایش، استبداد و حکومت کے باعث سیاسی مشاغل کا سد باب، ان تمام چیزوں نے مل ملاکر سیہ کاری کی وہ گرم بازاری کردی، جس کی کوئی انتہا نہیں بے شبہ ایسے دور تاریخ میں ایسے بہت سے ملیں گے جن میں فضائل اخلاق کا اس زمانہ سے بہت زیادہ قحط تھا لیکن

ایسا کوئی زمانہ تاریخ پر ہرگز نہیں گذرا ، جس میں رذایل اخلاق کی یہ کثرت و فراوانی رہی ہو ، جو قیاصرہ کے عہد میں تھی یونانیوں کی شہوت پرستی پھر بھی غنیمت تھی ، کہ کم از کم اس میں لطافت و نفاست تو تھی ، لیکن یہاں تو یہ قیامت تھی کہ اس کا پتہ بھی نہ تھا بلکہ خاص قسم کی شقاوت و قساوت بھی شہوت پرستی و سیہ کاری کے ساتھہ ملی ہوئی تھی ۔ نوجوان سلاطین امرا و خوشامدی ارکان دربار سب کے سب اس رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے اور بڑے بڑے مصنفین و اهل ادب مثلاً مارٹیل ، اپولس وینس اور لوسین تک کے صفحات فحش سے لبریز ہیں !

اس زمانہ سے کچھہ تو مذکورہ بالا مخرب اخلاق موثرات کے اثر سے اور نیز اس سبب سے کہ معاصرانہ پبلک نظامات کا رجحان بھی اس جانب تھا ایک عام ہوا یہ چل گئی تھی کہ نکاح کی طرف سے لوگوں کو بے رغبتی و بے التفاتی ہونے لگی اگسٹس نے اس کے روک تھام کی بڑی کوشش کی ۔ تجرد کے خلاف تعزیری قوانین نافذ کئے جو شخص تین بچوں کا باپ ہو ان کے لئے خاص انعامات تجویز کئے لیکن یہ ساری کوشش نا کام رہی اس زمانہ کی ایک تحریر دستیاب ہوئي ہے جو رسم نکاح کی حمایت میں کی گئی تھي اس کا ایک دلچسپ فقرہ یہ ہے : —

" اے برادران وطن ، اگر ہمارے لئے یہ ممکن ہوتا کہ بغیر بیویوں کے رہ سکیں ، تو ہم ہرگز اس تکلیف دہ شے کو گوارا نہ کرتے لیکن چونکہ فطرت نے یہ قاعدہ مقرر کیا ہے کہ نہ بغیر بیویوں کے گزر ہو سکتی ہے اور نہ اُن کے

ساتھہ کافی لطف حاصل ھو سکتا ھے تو ایسی
صورت میں ھمیں اپنی تھوڑی سی بے لطفی
گوارا کر کے آیندہ نسل کے بقا و قیام کے خیال
سے اس دستور کو جاری رکھنا چاھئیے "

ایک طرف تو یہ اخلاقی انحطاط تھا لیکن اسی کے پہلو بہ پہلو دوسری طرف قانون کی نظروں میں عورت کے مرتبہ کو ترقی ھورھی تھی - پیشتر عورت کی زندگی یکسر غلامانہ تھی ' لیکن اب اسے اتنے حقوق حاصل ھوگئے جو پھر کبھی زمانہ مابعد میں نہیں نصیب ھوئے - رومہ میں شروع سے ازدواج کے دو بالکل مختلف طریقے رایج تھے - ایک طریقہ یہ تھا کہ عورت کا ھاتھہ شوھر کے ھاتھہ میں دیدیا جاتا جو اس وقت سے ھر طرح پر اس کی جان و مال کا مالک ھوجاتا تھا - یہ طریقہ بہت مضبوط و مستحکم خیال کیا جاتا تھا اور جمہوریت کے زمانہ میں اسی کا عام رواج تھا - اس کی تین صورتیں تھیں ایک وہ جس میں کبھی علیحدگی ھوھی نہیں سکتی تھی اور جو بالکل ایک مذھبی رسم تھی دوسری ایک محض معاشری رسم تھی - اور تیسری کا مدعا یہ تھا کہ ایک عورت اور ایک مرد کو سال بھر کی مدت تک بغیر کسی دوسرے کے دخل و تصرف کے مباشرت کا حق حاصل رھتا تھا - جمہوریت کے خاتمہ کے ساتھہ اس طریقہ ازدواج کا بھی خاتمہ ھوگیا اور اب ایک دوسرا طریقہ عام ھوگیا - جس میں کوئی مذھبی یا معاشری رسم ادا نہیں کی جاتی تھی اور جس کے لئے صرف فریقین کی رضامندی کافی تھی - اس طریق ازدواج سے قانوناً عورت اپنے باپ ھی کے خاندان میں شامل رھتی

تھی - شوہر کو اس پر کوئی حق نہیں حاصل ہوتا تھا اور وہ قانونی حیثیت سے خود مختار رہتی تھی - ایک جہیز کو چھوڑ کر کہ وہ البتہ شوہر کے قبضہ میں چلا جاتا تھا اور باقی اپنی تمام جائداد کی مالک وہ خود رہتی تھی - اپنے باپ کی وراثت میں پورا حصہ پاتی تھی۔ غرض ہر حیثیت سے وہ آزاد و خود مختار رہتی تھی اس دستور کا ایک خاص اثر یہ ہوا کہ بڑی بڑی جایدادیں عورتوں کے قبضہ میں آگئیں ، ملک کی ثروت کے بڑے حصہ کی وہ مالک ہوگئیں اپنے شوہروں پر حکومت کرنے لگیں - شوہروں کی حیثیت محض ان کے کارکن یا کارندہ کی رہ گئی بلکہ مشہور تو یہاں تک ہے کہ اکثروں نے اپنے شوہروں کو گراں شرح سود پر قرض دینا شروع کیا —

عورت کی اس قانونی آزادی اور جدید طریقۂ ازدواج کے دو خاص اثرات یہ ہوئے :-

(۱) اول عورت کی عظمت میں بے حد اضافہ ہو گیا -

پہلے نظام خاندان کی بنیاد افسری و ماتحتی پر تھی ، اب اشتراک و معاونت پر قایم ہوگئی - قدامت پرست طبایع کو یہ قدرتاً ناگوار گزرا اور بعض قوانین ایسے منظور کرائے گئے جن کی بنا پر عورت کی آزادی کو محدود کرانے کی کوششیں کی گئیں - لیکن ان قوانین کا بعض حالتوں میں نفاذ ہی نہیں ہوا اور جب کبھی ہوا بھی تو بعد چندے منسوخ بھی ہو گئے —

(۲) دوسرا اور اہم تر اثر یہ پڑا کہ اب نکاح کا انحصار

زن و شوهر کی موافقت پر رہ گیا جب ان کی خوشی ہوتی شادی کرتے اور جب چاہتے افتراق کرلیتے اور اور اس طرح طلاق کی گرم بازاری ہوگئی ۔ بات بات پر شوہروں نے اپنی بیویوں کو چھوڑنا شروع کردیا ایک صاحب جو اس معاملہ میں بہت ہی آزاد تھے اُن پر لوگوں نے اعتراض کیا تو اُنہوں نے جواب دیا کہ "حضرت آپ تو چھڑے کی چمک دمک و خوش خوئی کو دیکھتے ہیں آپ کو یہ کیا خبر کہ جوتے کے اندر کون سی کیل میرے پیر میں چبھ رہی ہے"۔ ایک عورت نے ۵ سال کے عرصہ میں ۸ شوہر کئے ایک اور عورت نے ۱۰ نکاح کئے ۔ سب سے بڑھ کر سینٹ جروم کی یہ روایت ہے کہ ایک عورت نے جو ۲۲ شوہروں کے عقد میں رہ چکی تھی ایک تئیسواں نکاح کیا ایسے شخص کے ساتھ جو ۲۰ بیویاں چھوڑ چکا تھا اور یہ اس کی اکیسویں بیوی ہوئی !! بڑے بڑے مشاہیر یہ کرتے تھے کہ جو عورت غیر کی منکوحہ پسند آگئی اس کے شوہر پر دباؤ ڈال کر اس سے طلاق دلا کر خود شادی کرلی ۔ اکثر ایسے بھی تھے جو اپنے احباب و اعزہ کی خاطر سے خود اپنی بیویاں چھوڑ چھوڑ کر انہیں بیاہ دیتے تھے طلاق کی اس غیر معمولی گرم بازاری کو تمام تر قانون مروجہ کا معلول نہ سمجھنا چاہئے ۔ کیونکہ اس میں بہت بڑا دخل معاصرانہ بد اخلاقیوں کو بھی ہوتا تھا جب طینت خراب ہوجاتی ہے طینت اخلاق شکنی پر مائل رہا کرتی ہے تو قانون ایک بہانہ مل جاتاہے

ہے - اس بد اخلاقی کے سیلاب کو اگر قانون دبانا چاہتا بھی تو نہیں دبا سکتا تھا - اگر اس وقت قانون نے طلاق کو جائز نہ کردیا ہوتا تو یہ لوگ یقیناً چوری چھپے آشنائیوں اور بد چلنیوں میں مصروف رہتے —

میں جلد گذشتہ کی کسی فصل میں کہہ آیا ہوں کہ ماضی میں بر خلاف زمانہ حال کے بہ مقابلہ رذایل کو مغلوب رکھنے کے فضائل کو اُبھارنے کی قوت زیادہ تھی اسی لئے اس وقت جہاں معاصی کی کثرت تھی وہاں اُن کے پہلو بہ پہلو محاسن کو بھی خوب فروغ رہتا تھا - اس کلیہ کی ایک اور شہادت اعمال متعلق بہ جذبہ جنسی میں ملتی ہے - آوارگی ، بدچلنی ، شہوت پرستی ، شاہد بازی ، و جرایم خلاف وضع فطری کی جس قدر گرم بازاری رومہ کے دربار میں تھی ، آج یورپ میں کہیں اس کی نظیر نہیں مل سکتی - تاہم اس اخلاق شکنی کے سیلاب عظیم کے درمیان وفاداری ، ناموس پرستی ، عصمت طینتی کے بھی حیرت انگیز نمونے بکثرت ملتے ہیں - معاشرت کی سادگی کا یہ عالم تھا کہ آگسٹس کی لڑکیاں اور پوتیاں سینے پرونے کا کام کرتی تھیں اور اُس کی پوشاک کا اکثر حصہ اس کی بیوی اور بہن کے ہاتھہ کا بنا ہوتا تھا - امور خانہ داری خصوصاً کپڑے بننے میں سلیقہ عورت کا خاص جوہر سمجھا جاتا تھا - علم و تعلیم کا چرچا خواتین میں بہ کثرت تھا - اور ازدواجی الفت کا پیکر مجسم خواتین ذیل میں نظر آتا ہے پامپئی کی بیوی کارنیلیا سنیکا کی دوست مارسیا اور سنیکا کی والدہ ھلویا شمالی اٹلی کے متعدد شہر خصوصاً پیڈوا و بریسیا طبقہ نسواں کی عفت شعاری کے باب میں شہرت رکھتے تھے - اسی کے زمانہ میں ایک امیرلیڈی میلونیا پر

جب ٹائیبریسیس نے دراز دستی کرنا چاہی تو اُس نے اپنے شکم میں خنجر بھونک کر اپنے تئیں ہلاک کرڈالا —

پورشیا * (زوجہ بروٹس) پالینا † (زوجہ سینکا) اور ایریا ‡ (زوجہ پیٹس) سے بڑھ کر دنیا میں کس خاتون نے استقلال ناموس پرستی و جانبازی کی مثال پیش کی ہے ناظرین اُن کے مختصر حالات حاشیہ میں ملاحظہ کریں —

شوہر کی وفات پر خود کشی کرلینا شوہر کے ساتھہ از خود جلا وطنی میں چلے جانا اور نازک موقع پر بھی شوہر کا ساتھہ دئے جانا یہ ایسے واقعات ہیں جن کے متعدد شواہد اسی زمانہ

---

* بروٹس جب انقلاب حکومت کے متعلق گہری سازشوں میں مصروف تھا تو اسے متفکر دیکھہ کر پورشیا کو یہ فکر پیدا ہوئی کہ وہ بھی اس کی پریشانیوں میں شرکت کرلے لیکن راز داری کی شرط بڑی سخت تھی ' بروٹس کو اس کا کیونکر اطمینان ہو سکتا تھا کہ پورشیا کبھی اور کسی حالت میں اس کے راز کا افشا نہ کرے گی ؟ اپنے استقلال و ہمت کا ثبوت دینے کے لئے اُس نے خود اپنی ران میں چھری مارلی-اور اس امتحان ضبط میں جب پوری اُتر چکی جب جاکر اُس نے اپنے شوہر سے محرم راز بننے کی خواہش کی —

† سنیکا جب ظالموں کے ہاتھہ سے مارا گیا ہے تو پالینا نے معاً اپنی وریدوں کے منہ بھی کھولدئے تاکہ خون نکلتے نکلتے خود بھی وفات پاجائے - خون کی دھار جاری ہوگئی اور بہت ساخون نکل گیا اس وقت اس کے غلاموں کی نظر پڑی - اُنہوں نے جھپٹ کر وریدوں کے منہ بند کئے اور زخم کی مرہم پٹی کی مگر پالینا کو اس سے جو لاغری و نقاہت ہوگئی تھی وہ مدت العمر قایم رہی —

تیسرا نوٹ اگلے صفحہ پر

کی رومی بیویوں میں ملتے ہیں - رومی تاریخیں اس طرح کے متعدد تذکروں سے پر ہیں اور اُن سے زیادہ بلیغ وہ یادگاری کتبات ہیں جن میں بیوی کی عاشقانہ و والہانہ وفاداری کو ان کا سب سے بڑا جوہر دکھایا گیا ہے - رومی تابوت سنگین پر جو تصویر کھنچی رہتی

---

‡ پیٹس کو یہ حکم نادری ملا کہ اپنے ہاتھ سے اپنے تئیں ہلاک کرے اور خنجر ہاتھ میں دے دیا گیا - ایریا وہاں موجود نہ تھی جوں ہی اُسے یہ خبر پہنچی اس ارادہ سے چلی کہ شوہر کے ساتھ ہی اُس کے پہلو بہ پہلو اپنی زندگی کا بھی خاتمہ کرے گی اعزہ نے بہت روکنا چاہا مگر کامیابی نہ ہوئی - داماد نے آکر عرض کیا کہ " اگر مجھے سزاے موت کا حکم ملے تو کیا آپ اپنی لڑکی کی خودکشی جائز رکھیں گی " ؟ اس جوان مرد خاتون نے جواب دیا کہ " بیشک اگر اُسے تمہارے ساتھ ایسا ہی چین اور سکھ مل چکا ہو ، جیسا مجھے اپنے شوہر سے ملا ہے " جب یہ تدبیر بھی کارگر نہ ہوئی تو اعزہ نے اُسے کمرہ میں بند کردیا - یہاں اس نے اپنے سر کو دیوار پر اس زور سے دے مارا کہ بیہوش ہوکر گرپڑی اور ہوش میں آتے ہی کہا کہ مجھے عزت کی موت سے روکتے ہو تو ذلت کی موت سے تو نہیں روک سکتے " باالآخر صفیں چیرتی ہوئی اُس مقام پر پہنچی جہاں پیٹس خنجر بکف کھڑا ہوا تھا اور حب حیات ہاتھ کو جنبش نہیں ہونے دیتا تھا ایریا نے اس کی کشمکش دیکھ کر معاً وہ خنجر اُس کے ہاتھ سے لے کر اپنے سینہ میں بھونک لیا اور وہی خون افشاں خنجر اُس کے ہاتھ میں دے کر بولی کہ " دیکھا پیارے پیٹس اس میں ذرا بھی تکلیف نہیں ہوتی — "

تھی اس سے زیادہ پر اثر موقع اور کیا ہوسکتا ہے ؟ وہ یہ کہ میاں بیوی دونوں نہایت سکون کے ساتھ ایک دوسرے کے گلے میں ہاتھ ڈالے ہوئے ہیں - گویا جس طرح زندگی میں دونوں ایک جان دو قالب رہے اسی طرح موت بھی انہیں ایک دوسرے سے علحدہ کرنے میں نا کام رہی —

شہنشاہیت کے آخری دور میں حکومت نے سیہ کاریوں کا سد باب کرنا چاہا - چنانچہ ڈومیٹین نے جرایم خلاف وضع فطری سے متعلق تعزیری قانون نافذ کیا ، وسپیسین نے دربار کے تعیش کو گھٹایا ، میکر نیسین نے زانی و زانیہ کو ایک میں بندھوا کر زندہ جلائے جانے کا حکم دیا ، مرد و عورت کے ساتھ نہانے کے دستور کو ہیڈرین و الگزنڈر سیورس نے کم کیا اور قسطنطین نے بالکل بند کردیا - اور دلالوں اور میر شکاروں کے قلع قمع میں الگزنڈرسیورس و فلپ نے پوری سرگرمی سے حصہ لیا - یہ تمام بیہودگیاں انٹونانیس کے عہد کے بعد سے از خود بہت گھٹ گئیں تاہم اُن کے استیصال میں بہت بڑا دخل اس امر کو ہے کہ پایہ تخت روم سے قسطنطنیہ کو منتقل ہوگیا اور مسیحیت نے بڑا اصلاحی اثر ڈالا —

خالص اخلاقی حیثیت سے اس دور میں جو تغیرات ہوئے اُن میں سے ایک اہم تغیر یہ تھا کہ شروع میں جو وفا شعاری صرف بیوی کے لئے مخصوص تھی وہ اب شوہر پر بھی واجب سمجھی جانے لگی - یونانیوں میں یہ خیال بیشک ابتدا سے موجود تھا لیکن رومیوں کے ذہن میں اگر یہ تخیل تھا بھی تو کم از کم اس پر عمل کبھی نہیں تھا - زناکاری کا مفہوم ان کے یہاں صرف اسقدر تھا کہ بیوی نے امانت

میں خیانت کی لیکن اب یہ صورت حال تبدیل ہوگئی ۔ ارسطو تو شروع ہی سے اس کا موئد تھا لیکن اب پلوٹارک اور سنیکا بھی پوری قوت و زور کے ساتھہ یہی تعلیم دینے لگے کہ شوہر پر حقوق کے ساتھہ فرایض بھی عاید ہیں اور جس قدر بیوی پر ازدواجی امانت داری فرض ہے اسی قدر شوہر پر بھی - ' انٹونینس پی اس ' نے ایک عورت کے مقدمہ کے فیصلہ میں اس کے شوہر کے استغاثہ پر یہ فقرہ کیا خوب لکھا کہ —

" ہاں اس عورت پر زناکاری کی حد ضرور جاری کی جاے بشرطیکہ یہ ثابت ہوجاے کہ تم نے خود اپنی زندگی سے اُسے وفاداری و امانت کا سبق دیا ہے - بیوفا شوہر کو بیوی سے وفاداری کی توقع رکھنے کا کوئی حق نہیں " —

اسی زمانہ کی ایک خاتون زوجہ سیپیو کا یہ ایک پر اثر واقعہ منقول ہے کہ اس کا شوہر ایک لونڈی پر فریفتہ تھا - جب شوہر کا انتقال ہوگیا تو اس نے لونڈی کو بھی یہ کہہ کر فوراً آزاد کردیا کہ میں اپنے پیارے شوہر کی معشوقہ پر حکومت نہیں کرسکتی —

دوسرا اہم تغیر فلسفۂ فیثا غورث و فلاطونیت جدید کے اثر سے یہ ہوا ، کہ عصمت و عفت قطع نظر اپنی مفید نتائج کے بجاے خود مستحسن و محمود سمجھی جانے لگی - ورنہ پیشتر بت پرستوں کا یہ عام اعتقاد تھا کہ بے عصمتی صرف ازدواج کے بعد معیوب ہے کہ اس سے نظام خاندان میں ابتری پھیلتی ہے کیٹو و سسرو وغیرہ کے نزدیک قبل ازدواج کے کسی بدچلنی میں عیب نہ تھا - خود سسرو کی تقریر کا یہ فقرہ

موجود ھے —

" اگر ھم میں سے کسی شخص کا یہ خیال ھے
کہ نوجوانوں کو طوایفوں کی صحبت سے بالکل
محترز رکھنا چاھئے تو میں کہوں گا کہ اس کا
خیال بہت ھی سخت ھے آج تک کس نے
اس کی پابندی کی ھے ؟ اور آج کل کیا قدماء
میں کب کوئی اس خیال کا گزرا ھے ؟ کب اور
کس زمانہ میں کسی نے اس کے جواز پر
شبہ کیا ھے ؟ " —

خود ایپکٹیسٹس جیسا خشک فلسفی بھی اسے کچھہ زیادہ معیوب نہیں قرار دیتا - اور الگزنڈر سیورس جو بد چلنیوں کے انسداد میں سب سے زیادہ شہرت رکھتا ھے، جب کسی ناکتخدا شخص کو صوبہ کی گورنری تفویض کرتا تھا تو جہاں اُس کے خدام وغیرہ کا انتظام کرتا تھا وھاں اُس کے لئے ایک کنیز کا بھی اھتمام کردیتا تھا ، کیونکہ بہ قول مورخین کے بلا اس کے گزر ممکن ھی نہ تھا —

اس عام حالت کے ساتھہ ضرور ھے کہ بعض مثالیں اس کے مخالف بھی ملتی ھیں جو گو شمار میں قلیل ھیں تاھم وزن سے خالی نہیں - موسونیس روفس اس کی بالتصریح و پر زور تعلیم دیتا تھا کہ بجز نکاح کے تمام تعلقات مابین مرد و عورت ناجائز ھیں - ڈیون کر یزوسٹم چاھتا تھا کہ طوایفوں کا پیشہ قانوناً ممنوع قرار پا جاے - اپولونیوس نے ساری عمر اس خیال سے تجرد میں گزاری کہ ازدواج بھی اخلاق کے اعلیٰ معیار سے پست ھے - ملکہ زنوبیہ کبھی اپنے شوھر کے ساتھہ مباشرت پر راضی نہ ھوئی بجز اس صورت کے جب ایسا کرنا ولیعہد سلطنت

کو وجود میں لانے کے لئیے ضروری ہوگیا - ھاپیشیا کی شادی ہوگئی تھی، تاہم وہ عمر بھر باکرہ رہی یعنی شوہر کو کبھی اپنے ساتھہ صحبت نہ کرنے دی - تیسری صدی میں یہ خیال ان لوگوں میں عام ہوگیا تھا کہ ازدواج بھی ایک دنیوی آلایش ہے اور آلایش دنیوی سے جہاں تک ممکن ہو بچنا چاھئیے - مارکس آریلیس و جولین دونوں کی بیویوں کا انتقال ہوگیا تھا اور دونوں بڑے پاکباز و متقی تھے تاہم اتقاء کے تخیل میں اس عرصہ میں اتنا فرق ہوگیا تھا کہ مارکس آریلیس نے ایک کنیز رکھہ لی - بہ خلاف اس کے جولین نے بقیہ عمر بالکل تجرد میں گزاردی -

فصل (۳)

مسیحیت کا اثر

واقعات بالا سے جنھیں یہاں بغیر کسی جرح و تنقید کے صرف نقل کردیا گیا ہے ناظرین کو اس کا اندازہ ہوا ہوگا کہ ابتداً رومہ کے جذبات اس بارہ میں کیا تھے اور اب اُن میں رفتہ رفتہ کیونکر ترمیم ہوتی جاتی تھی - اس تغیر و ترمیم میں مشرقی مذاہب فلسفہ کی کافی تائید شامل تھی تاہم اس میں سب سے زیادہ دخل جس شے کو تھا وہ مسیحیت تھی - مسیحیت نے عصمت کو اُم الفضائل قرار دیا تھا اور عملاً اسے قایم رکھنے کے لئے ہر طرح کی تدابیر و وسائل سے کام لیا تھا - سلاطین نے اس باب میں سخت سے سخت قوانین نافذ کئے - میرشکاروں کے لئے یہ سزا قرار پائی کہ پگھلا ہوا سیسہ اُنھیں

پلایا جانے لگا - زنا بالجبر کے جرم میں زانی اور اگر زانیہ کی کچھ بھی رضامندی پائی گئی تو اس کی بھی سزا موت قرار پائی - ایکٹر سوں کو اس کی اجازت مل گئی کہ بپتسمہ لینے کے بعد فوراً اپنا پیشہ چھوڑ سکتی ہیں رقاصہ لڑکیوں کے پیشہ کو پہلے تو پادریوں نے ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا اور پھر آخر میں اُسے بند ھی کرادیا —

مسیحی قانون کی تائید مسیحی شریعت نے کی - بے عصمتی سخت سے سخت عذاب کی مستحق قرار دی گئی - جرایم خلاف وضع فطری کرنیوالے اور وہ مائیں جو اپنی لڑکیوں کو طوایفوں کے پیشہ میں شامل کراتی تھیں حصول تبرکات سے محروم کردی گئیں - مردوں کی تخیل پر کنواری شہیدان کلیسا کے تقدس و احترام کی تصویر کا بےحد اثر پڑا - غریب خادمہ بلینڈینا جو لیانس میں شہید هوئی اُس سے روشن تر زندگی کس کی ہوگی ؟ یاسینٹ پرپیتوا کی عین شہادت کے وقت جو واقعہ پیش آیا وہ کس قدر موثر هے ! یہ پاک و معصوم کنواری جب ایک سانڈ کے آگے ھلاک ھونے کو ڈال دی گئی اور اس نے اپنے سینگوں سے اچھال کر اسے اکھاڑہ کی زمین پر پھینک دیا تو اس حالت بیہوشی و نزع میں جو کام اس خاتون نے کیا وہ یہ تھا کہ جلدی سے اپنی پوشاک برابر کرلی کہ بے پردگی نہ ھونے پائے —

یہ تو تاریخی واقعات تھے ، لیکن ان کے پہلو بہ پہلو صدھا قصے و افسانے بھی ایسے مشہور ھوگئے ، جو اگرچہ روایتاً بالکل نا قابل اعتبار ھیں تاھم ان سے اس کا پتہ چلتا ھے کہ لوگوں کی تخیل اب کن روایات کو قبول کرنے کے لئے مستعد تھی ان میں سے ھم بعض یہاں نقل کرتے

هیں سینٹ جروم کی روایت ہے کہ ڈایوکلیشین کی تعدیوں کے زمانہ میں ایک نوجوان مسیحی ریشمی ڈوریوں میں کسا ہوا ایک نہایت خوش نما باغ کے اندر تنہا بیٹھا ہوا تھا، جہاں ہر قسم کا سامان عیش و عشرت موجود تھا اتنے میں ایک حسین طوایف آئی اور لگاوٹ کی باتیں کرنے لگی مگر مسیحی نے اُس کے سارے اظہار عشق کا جواب یہ دیا کہ اپنی زبان دانتوں سے کاٹ کر اُس کے اوپر تھوک دی! بعض مسیحی نوجوان عورتوں کا بھیس بدل کر اُن عورتوں کے ہاں جاتے تھے جنھیں مجبوراً طوایف کا پیشہ اختیار کرنا پڑا تھا اور اپنا لباس اُنھیں پہنا کر اُنھیں آزادی دلا دیتے تھے۔ خاتون سینٹ ایگنس کی بابت یہ روایت تھی کہ جب اُسے برھنہ کرکے اُس پر تازیانوں کی مار پڑنے لگی تو ہر شخص نے اپنی آنکھیں بند کر لیں مگر ایک نوجوان اسے دیکھتا رہا۔ اس بیحیائی کی سزا اُسے یہ ملی کہ بصارت جاتی رہی۔ ایک اور خاتون کے سینہ میں پھوڑا پیدا ہوا اُسے یہ گوارا نہ ہوا کہ کسی طبیب کو دکھائے آخر اسے خدا نے خود بخود اچھا کر دیا۔ بد چلن عورتوں اور شیاطین میں خاص تعلق سمجھا جاتا تھا۔ ایک عورت کے سر پر آسیب تھا اُسے ایک سینٹ کے پاس لائے۔ اُس نے فوراً بتا دیا کہ اُس کا کوئی آشنا موجود ہے۔ ایک طوایف نے ایک اور سینٹ پر اتہام لگایا کہ وہ اُس کے عاشق ہیں مگر جو فیس دینے کو کہی تھی وہ نہیں دیتے۔ سینٹ موصوف نے جب یہ سنا تو رقم مطلوبہ تو فوراً ادا کر دی مگر ساتھ ہی طوائف کے سر پر آسیب بھی آ گیا۔ متعدد خواتین جو آگے چل کر سینٹ ہوئیں ابتداً طوایفیں تھیں۔

سینٹ و یٹیلیس ہر شب کو اپنے ہمسایہ کے طوایفوں کے یہاں جاتے تھے اُنھیں روپیہ دے کر اس کا عہد لیتے تھے کہ وہ کم از کم اس رات کو حرام کاری سے محترز رہیں گی۔ اور خود اُن کے حق میں دعا کرتے تھے۔ سینٹ سراسن کی بابت یہ روایت منقول ہے کہ جب وہ مصر میں دورہ کر رہے تھے تو ایک طوایف نے اُنھیں اپنے پاس بلایا۔ یہ وقت مقررہ پر اُس کے پاس گئے۔ مگر یہ کہا کہ میں ایک شغل سے فارغ ہولوں تو مخاطب ہوں۔ یہ کہہ کر اُس نے زانو کے بل کھڑے ہو کر بآواز بلند اپنے اور اپنے میزبان کے حق میں بہ کمال تضرع و الحاح دعا مانگنا شروع کر دی۔ اس منظر سے طوایف بغایت متاثر ہوئی، یہاں تک کہ اُس کے آنسو نکلنے لگے اور وہ بھی سینٹ کے ہمراہ زانو ٹیک کر دعا مانگنے میں شریک ہو گئی۔ سینٹ کا خضوع و خشوع بڑھتا گیا اور لہجہ و آواز میں زیادہ رقت و درد پیدا ہوتا گیا یہاں تک کہ ساری شب اسی عالم میں گزر گئی اور جب صبح طلوع ہونے لگی تو طوائف نیم مردہ ہو کر سینٹ کے قدموں پر یہ چلاتی ہوئی گر پڑی کہ "میں اپنے سارے گناہوں پر توبہ و استغفار کرتی ہوں مجھے لٹہ بچالو" —

لیکن رہبانیت کے یہ اثرات جہاں ایک طرف عصمت وعفت کی ترقی دینے کے حق میں نہایت مفید تھے، وہاں دوسری طرف نکاح کی وقعت کو بھی لوگوں کی نظر میں بہت گھٹانے والے ثابت ہوے اس وقت کے سارے پادریانہ لٹریچر کے ضخیم دفتر میں صرف دو تین اقوال نکاح کی تائید میں ملتے ہیں ورنہ عموماً یہ تعلیم دی جاتی تھی کہ ازدواج ایک طرح کی معصیت ہے جو صرف اس لیئے جائز ہے کہ اُس کے وساطت سے

آدمی بزرگ تر معاصی سے محفوظ رہے نیز اس لئے کہ بقاے نسل ہو ورنہ تقویٰ تو اُسی میں ہے کہ انسان ہمیشہ مجرد رہے اس نقطہ خیال سے اولاً تو نکاح فی نفسہ معیوب تھا اور پھر اگر کہیں ہو بھی جاتا تو اُس کی کوشش ہوتی ، کہ افتراق ہوجاے اور یہ بھی نہ سہی تو بہرحال اتنا تو ہو کہ میاں بیوی ہمبستری سے محترز رہیں - شہنشاہ روما ہنری ثانی ، شاہ انگلستان ایڈورڈ کنفسر ، و شاہ اسپین الفانسو ثانی ان سب کی شادیاں اس اصول پر ہوئیں - اس سلسلہ میں گال کے ایک نوجوان امیر کا قصہ بہت دلچسپ ہے - شادی کی پہلی رات کو اُس کی محبوبہ نے آنکھوں میں آنسو بھر کر اس سے کہا کہ " میں نے ہمیشہ باکرہ رہنے کا عہد کیا ہے اور شادی صرف تمہاری محبت کی خاطر سے کی ہے " - عاشق شوہر نے کہا کہ مجھے تیرے عہد کا پاس ہر طرح منظور ہے - چنانچہ سالہاسال گذر گئے اور عاشق و معشوق دونوں اپنے عہد پر قایم رہے - اس کے بعد جب بیوی کا انتقال ہوگیا اور شوہر اُسے قبر میں اُتارنے لگا تو بہ کمال متانت کہا کہ " پروردگار ، میں نے اُسے جس طرح باکرہ پایا تھا اوسی طرح باکرہ تجھے واپس کرتا ہوں " - اس پر عورت کی لاش متبسم ہوئی اور بولی کہ " جس شے کی بابت تم سے سوال نہیں کیا جاتا اُس کا کیوں اظہار کرتے ہو " - کچھہ روز کے بعد جب شوہر کا بھی انتقال ہوگیا اور وہ علحدہ مدفون ہوا ، تو ملائکہ نے اس کا تابوت اُٹھا کر اُس کی بیوی کے پہلو میں رکھہ دیا - بہت سی مثالیں ایسے لوگوں کی بھی ملتی ہیں جو اپنی بیویوں کو چھوڑ چھوڑ کر صحرا نشیں ہوگئے - اور بہت سے ایسے افراد بھی گزرے ہیں

جنھوں نے گو اپنی بیویوں کو باضابطہ طلاق نہیں دی لیکن اُن سے کسی قسم کا تعلق بھی نہیں رکھا - بعض ایسے مصنفین جن کی شادی ہو چکی تھی فضیلت تجرد پر تصانیف لکھتے اور اپنی ذاتی بدقسمتی پر سخت ماتم کرتے تھے —

ان عقاید و تعلیمات سے خانگی زندگی میں سخت ابتری پھیل گئی اور اس خوف سے دانشمند مقتدایان کلیسا نے یہ فرمان جاری کردیا کہ جب تک میاں بیوی دونوں کی رضا مندی نہ ہو کوئی ایک دوسرے کو نہیں چھوڑ سکتا ہے لیکن جو راہبانہ نصب العین چل پڑا تھا وہ اس فرمان سے نہ بدل سکا اور وہ مدتوں کسی نہ کسی شکل میں گرجا پر محیط رہا - مثلاً قرون وسطیٰ میں صدیوں تک یہی اعتقاد قایم رہا کہ کسی مذہبی رسم و جشن میں شریک ہونے کی رات سے پیشتر زن و شو کو ہمبستری سے محترز رکھنا چاہئے اور اگر کوئی اس کے خلاف کرے گا تو گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوگا - چنانچہ خوش اعتقادی نے ایسی عورتوں کی مثالیں بھی گنا دیں ' جنھوں نے اس شرط کو پورا نہیں کیا اور اس کی پاداش میں دنیا ہی میں انھیں سزا مل گئی اور بارھویں صدی میں البیرک نے خواب میں جہنم کا وہ پر ہیبت منظر دیکھ لیا جس میں طرح طرح کے درد ناک و دہشتناک عذاب ان لوگوں کے لئے تیار ہیں جو اس جرم کے مرتکب ہوں گے —

ازدواج کو اس راہبانہ نظر سے دیکھنے کے دو اور خاص اثرات پیدا ہوے - ایک یہ کہ عقد ثانی بالکل ممنوع قرار پا گیا اور دوسرے مقتدایان کلیسا میں تجرد کا شوق بہت پیدا ہوگیا ان میں سے اول الذکر یعنی عقد ثانی کی

کراہت کا پتہ قدیم رومیوں کے ہاں بھی چلتا ہے جن کا خیال یہ تھا کہ مرد کو بیوی کے ساتھہ اس درجہ اُلفت و شیفتگی ہونا چاہئے کہ اُس کی موت کے بعد دوسری شادی کا تصور بھی دل میں نہ لانا چاہئے۔ ورجل، تیکتیس، وغیرہ کے صفحات میں جا بجا یہ خیال پایا جاتا ہے - ایک اور رومی شاعر کہتا ہے کہ " بیوی کی زندگی میں اس سے محبت رکھنا ہماری راحت ہے - لیکن اس کی موت کے بعد اس محبت کو قایم رکھنا ہمارا مذہبی فرض ہے " اس رومی خیال کی پابندی عملی زندگی میں بیوی کے اوپر نہایت لازمی تھی، لیکن شوہر پر چنداں ضروری نہ تھی اور جہاں کہیں تھی بھی تو صرف اس بنا پر کہ اگر اس کے اولاد موجود ہے تو سوتیلی ماں کے آنے سے اُسے تکلیف ہوگی ـــ

رومیوں کے اس خیال کو مسیحیت نے بےحد تقویت دے دی - گو اس نتیجہ کے مقدسات اُن کے پاس بالکل مختلف تھے، پہلے شوہر کی محبت کا اُن کے یہاں کہیں ذکر بھی نہ تھا اُنھوں نے اس رسم کی جو مخالفت کی تو اس بناپر کہ اُن کے نزدیک عقد ثانی و ثالث کے محرکات صرف جذبات شہوانی ہو سکتے تھے بعض گروہوں نے تو اُسے بالکل ممنوع ہی قرار دیدیا - لیکن گروہ کثیر جس نے اسے جائز رکھا اُس نے بھی بہ اکراہ اوربادل ناخواستہ، ایک پادری صاحب کا مقولہ تھا کہ عقد ثانی ایک دوسرا نام ہے زناکاری کا - ایک اور پادری صاحب فرماتے ہیں کہ " عقد ثانی کر نے والے کی نجات تو مسیح کی سفارش سے ہوجائے گی، لیکن اُسے مسیح کی خوشی کبھی حاصل نہیں ہوسکتی "۔اس طرح کے اور بہت سے اقوال موجود ہیں- مذہبی مراسم کے مقتدا بعض

مخصوص حالات میں وہ لوگ ہو سکتے تھے جو خود پادری نہ تھے، لیکن جو شخص عقد ثانی کا مرتکب ہوچکا ہوتا وہ کبھی اور کسی حالت میں یہ اعزاز نہیں حاصل کرسکتا تھا - غرض اس طرح عقد ثانی مسیحیوں کے یہاں گویا بالکل معلوم ہوگیا —

اب دوسرے اثر یعنی ارباب کلیسا کے تجرد کو لیجئے، جس پر میری گفتگو لامحالہ بہت مختصر ہوگی کیونکہ یہ موضوع ایسا ہے جس پر بہت بڑی بحث بھی شاید کافی نہ ہو۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے قابل لحاظ یہ حقیقت ہے کہ گو ازدواج کا جواز شروع سے مقتدایان مسیحیت کے لئے موجود تھا تاہم ازدواج کی کراہت بھی شروع سے مسلم تھی اور کلیسا کی مقدس جماعت کا دامن خصوصاً اس کراہت سے پاک رہنا چاہئے تھا - یہ خیال ان دو تفریعات کی شکل میں ظاہر ہوا اول یہ عام اعتقاد کہ پادریوں کے لئے عقد ثانی یاعقد بیوگان قطعاً ناجائزہے یہ اعتقاد اوایل مسیحیت سے موجود تھا اور متعدد صدیوں تک قایم رہا - ثانیاً یہ خیال کہ پادریوں کے لئے یہ شرط تقویٰ ہے، بلکہ آگے چلکر تو یہ اُن کے فرایض میں داخل ہوگیا کہ اپنی بیویوں کے ساتھ ہمبستری سے محترز رہیں - شروع شروع میں یہ شرط لازمی نہیں قرار پائی - لیکن چوتھی صدی میں پادریوں کے لئے تاھل جرم قرار پا گیا - تاہم شادی کا دستور عملاً مسدود نہ ہوسکا، بلکہ بڑے زور شور سے جاری رہا - کلیسا نے اس بارے میں جو جو عجیب و غریب مختلف طرز عمل اختیار کئے اُن کے مطالعہ سے اس حقیقت پر کافی روشنی پڑتی ہے کہ تجرد سے کیا کیا نقصانات پیدا ہوتے رہے ہیں - بعض واقفوں کا خیال ہے کہ اصلاح کلیسا سے ذرا پیشتر جو بداخلاقی خانقاہوں میں شایع

تھی وہ عدیم النظیر تھی ؛ لیکن دراصل یہ خیال بالکل ناواقفیت پر مبنی ہے - جن لوگوں نے چند صدیوں پیشتر کے کاغذات و مواد تاریخی کا براہ راست مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ آٹھویں صدی سے لیکر بارھویں صدی تک جو بداخلاقی و بدچلنی رایج رہی اُس سے زاید ہرگز بعد کو نہیں ہوئی خصوصاً دسویں صدی میں تو خود پاپاؤں کی زندگی فسق و فجور کی زندگی ہوتی تھی بدچلنی و رشوت ستانی کا بازار گرم تھا - وحشی سردار نوعمری میں متاہل ہوکر ضبط نفس بالکل کھو بیٹھتے تھے اور کلیسا کے مقتدی بن بن کر طرح طرح کی حرام کاریوں میں مصروف رہتے تھے بہ قول دسویں صدی کے ایک اطالوی پادری کے ؛ اگر فطری اصول کی نظر سے دیکھا جاوے تو ایک پادری بھی اپنے عہدہ کا اہل نہیں ملتا - پادریوں پر ایک خاص ٹیکس اس معاوضہ میں لیا جاتا تھا کہ انھیں کنیزوں کے رکھنے کی اجازت رہے - شادی کی اب بھی بعض استثنائی صورتوں میں اجازت مل جاتی تھی لیکن متعدد مجلسان کلیسا اور بڑے بڑے مشاہیر پادریوں نے اسے اصولاً بالکل ناجائز ہی رکھا اور اس سے بداخلاقی کو جتنی تحریک ہوتی رہی وہ اظہر من الشمس ہے —

قاعدہ ہے کہ جب کوئی شخص اپنی طرز زندگی کو فاسقانہ سمجھہ لیتا ہے تو پھر اُسے کسی گناہ میں باک نہیں رہ جاتا - پاپاؤں نے جب بار بار کہہ کے پادریوں کی نظر کے سامنے اُن کی زندگی کو فسق وفجور کا کا مجسمہ بنا دیا تو ان کی زندگی واقعتاً بھی ایسی ہی ہوگئی - خود پاپائے اعظم جان بست و سوم جو زناکاری اور خود اپنی ماں بہن کے ساتھہ زناکاری کے مرتکب

ثابت هوے کنسٹر بری کے اُسقف جو سنہ ۱۱۷۱ ع میں
صرت ایک موضع میں ۱۷ ناجائز بچوں کے والد نکلے ؟
اسپین کے ایک اسقف جو سنہ ۱۱۳۰ ع میں ۷۰ کنیزیں
رکھے ہوئے تھے هنری سوم سیشر کے پادری جن کی
۶۵ ناجائز اولادیں سنہ ۱۲۷۴ ع میں نکلیں ! ان سب کو
مستثنیات سمجھہ کر تھوڑی دیر کے لئےان سب سے قطع
نظر بھی کرلیجئے - تاهم اسے کیا کہجئے گا کہ اس زمانہ
کے پادریوں کی عام بدچلنی و شہوت پرستی کے ثبوت
میں مستند شواهد کے دفتر کے دفتر موجود هیں - اچھوتیوں
کی خانقاهیں اب خانقاهیں نہیں رهی تھیں ' بلکہ حرامکاری
کے اڈے اور ناجائز بچوں کے قبرستان تھے ' حرام کاری و شہوت
پرستی کے جوش میں محرمات وغیر محرمات کی تمیز
اُٹھہ گئی تھی ' چنانچہ بار بار اس طرح کے قوانین کے
نفاذ کی ضرورت پیش آتی رهي کہ پادری اپنی ماؤں
اور بہنوں سے الگ رهیں - اغلام اور شاهد بازی کی گو
مسیحیت نے بیخ کنی کی ' لیکن خانقاهوں کی چاردیواری
کے اندر اس کی سر پرستی قایم رهی - خود ناصحین کی
یہ حالت تھی کہ وهی سب سے زیادہ آلودہ معاصی رهتے تھے
بارهویں صدی میں پاپا صاحب کے ایک سفیر انگلستان میں وعظ
کے لئے تشریف لائے - کلیسا کے اخلاقی انحطاط پر اُنہوں نے
شد و مد سے وعظ کہا لیکن ابھی اس کو چند گھنٹے بھی نہ گزرے
تھے کہ لوگوں نے دیکھا وہ اپنے خلوتکدہ میں ایک طوایف کے
ساتھہ لطف هم آغوشی حاصل کررهے هیں ! یہ سب کیا
تھا ؟ وهی ازدواج کو ممنوع قرار دینے کا وبال - ساری
خرابیوں کی جڑ یہی تھی ' کہ شادی و نکاح کے پاک
و فطری طریقہ کے انسداد کی کوشش کی جاتی تھی -

پانی کے بہاؤ کے قدرتی راستہ کو روکئے گا تو وہ حوض کے اندر لامحالہ گندگی و تعفن پیدا کردے گا —

اساطین دین کی یہ بد اخلاقی لازمی طور پر متعدی ثابت ہوئی - اب یہ بد اخلاقی گویا ساری فضا میں سرایت کرگئی اور عوام و خواص سب اسی رنگ میں رنگ گئے پروٹسٹنٹ ممالک میں جہاں ازدواج کا عام دستور ہے ' اس رسم سے نہایت مفید اثرات پیدا ہوتے ہیں عادت و اطوار کی نفاست و نزاکت بچوں کی تعلیم و تربیت ' مریضوں کی تیمارداری - صفائی و پاکبازی ' حلم و آشتی ' رفق و مروت شفقت و ہمدردی یہ تمام چیزیں پر مسرت خانگی زندگی کے جلو میں آتی ہیں - مصایب زندگی میں بجاے تلخی کے خوش مزگی پیدا کردیتی ہیں اور علمی ' اخلاقی ' مذہبی ' معاشری غرض ہر شعبہ حیات میں ایک نسبت و ملاطفت کی آمیزش کر دیتی ہیں - بخلاف اس کے کیتھولک اصول پر تجرد کی زندگی بسر کرنے سے انسانی دماغ ایک بالکل ہی مختلف سانچے میں ڈھل جاتا ہے اس سے عزم راسخ گو موت سے بے خوفی ' دنیا سے بے تعلقی ثبات و استقلال اور ایثار و مردانگی کو قوت پہنچ جاتی ہے ' تاہم دوسری طرف مزاج میں خاص طرح کی سختی و خشکی ' خشونت و آشفتگی بھی آجاتی ہے اور تعصب ' تنگ نظری و عدم رواداری بھی لازمی طور شامل ہوجاتی ہے جس سے اُن میں بچوں کی تعلیم و تربیت کی ذرا بھی اہمیت نہیں باقی رہ جاتی ' حالانکہ اُنہیں اُسی کا بڑا دعویٰ ہے —

چنانچہ عملاً بھی اس صورت حال کا یہ نتیجہ ہوا کہ

گو قرون وسطیٰ میں بہت سے زاہدان مرتاض و عابدان تارک الدنیا پیدا ہوتے رہے، تاہم اکابر کلیسا کی بداخلاقیاں ساری دنیائے مسیحیت میں سرایت کرگئیں اور مسیحیت کی اصلاحی قوت کو کیتھولک ازم نے مدتوں معطل رکھا۔ رہبانیت کی شدت کا رد عمل یوں ظاہر ہوا کہ لوگ اخلاق شکنی پر ٹوٹ پڑے اور ازدواج کا سا پاک معصوم و پر محبت رشتہ، معصیت سمجھا جانے لگا - پروٹسٹنٹ ازم کا در حقیقت یہ بہت بڑا احسان دنیا پر ہے کہ اُس نے ان غلط فہمیوں کا ازالہ کر کے مسیحیت کی اصلاحی قوت کو از سر نو قایم کیا —

ایک اور مضر اثر جو زیادہ تر رہبانیت کا معلول تھا یہ پیدا ہوا کہ عورت کی سیرت و مرتبہ کی انتہائی پستی کا تخیل قائم ہو گیا یہ تخیل بالکل نیا نہ تھا کیونکہ اس کے ابتدائی اثر کتاب یہود میں موجود تھے - دلہن کے باپ کو قیمت دینے کا دستور اور تعدد ازواج کی رسم علی‌العموم جاری تھی عورت تمام قبایح کی مبدا سمجھی جاتی تھی - وضع حمل کے بعد ایک خاص زمانہ تک وہ ناپاک خیال کی جاتی تھی جو لڑکی پیدا ہونے کی حالت میں یہ مدت بہ مقابلہ لڑکے ہونے کے دگنی ہوتی تھی - اگلی یہودی تاریخ میں فضیلت نسوانی کی جس قدر نظیریں ملتی ہیں وہ سب بہت کم درجہ کی ہیں اور روما و یونان کے مقابلہ میں تو یقیناً نہایت پست ہیں بلکہ خود توریت میں جس عورت کی سب سے زیادہ تعریف کی گئی ہے وہ وہ ہے جس کے پاس ایک شخص آکر پناہ لیتا ہے اور وہ اُسے بہ کمال مکاری قتل کر ڈالتی ہے - غرض یہودیوں کے ہاں یہ مواد تو موجود ہی تھا

اس پر مسیحی رہبانیت نے اور جلا کر دی۔ اس وقت کے پادریوں کی تصانیف کی ورق گردانی سے عورت کے باب میں عجیب عجیب تعلیمات آشکار ہوتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ عورت کا وجود جہنم کا دروازہ اور تمام قبایح انسانی کی جڑ ہے۔ عورت کو ہمیشہ ذلیل اور شرمندہ رکھنے کے لئے اس کا یہی خیال کافی ہے کہ وہ عورت ہے۔ اس کا درجہ ایک دایمی محکومیت کا ہے اُسے اپنے لباس و حسن سے خصوصیت کے ساتھہ محجوب رہنا چاہئے کیونکہ صید معاصی کے لئے حسن ہی اس کے پاس سب سے قوی حربہ ہے۔ حسن صورت اس زمانہ میں عام طور پر گرجا کے نزدیک مذموم سمجھا جانے لگا بجز پادریوں کے حسن کے کہ اُس کا ذکر اُن کے مقبروں کے کتبہ پر فخر کے ساتھہ درج ہوتا تھا —

ان تعلیمات کا اثر قانون پر بھی پڑا بت پرستوں نے اپنے آخری زمانہ میں قدیم مخالف نسواں قوانین کی بہت کچھہ ترمیم کی تھی اور اصلاح کا یہ سلسلہ قسطنطین سے لے کر جستینین تک جاری رہا تھا، لیکن اس دور کے قانون نے عورت کی قانونی ترقی کو پھر کئی صدیوں پیچھے ہٹا دیا۔ طلاق و دیگر حیثیات سے سختیوں کے علاوہ خود وراثت میں عورت طرح طرح کے مظالم کی ہدف رکھی گئی، چنانچہ اکثر حالتوں میں عورت اس پر مجبور ہو جاتی تھی کہ یا شادی کرے یا عمر بھر کے لئے نن بن جائے یہ قوانین اور ان بندشوں کا سلسلہ اٹھارھویں صدی تک قائم رہا، تا آنکہ اٹھارھویں صدی کے خاتمہ پر انقلابئین فرانس نے گو عورت کو سیاسی آزادی نہیں بخشی، تاہم اولاد ذکور و اُناث میں مساوات توریث

قرار دےکر آیندہ کی بڑی بڑی اصلاحات کے لئے داغ بیل ڈال دی —

مسیحیوں کو عصمت و عفت کا معیار بلند کرنے میں بہت بڑی مدد بربریوں کے حملوں اور فتوحات سے ملی غلاموں و خانہ زادوں کی تعداد میں کمی، مناظر تفریح و ملاعب کا تعطل، اور ملک کا عام افلاس یہ سب چیزیں اس باب میں معین ہوئیں - اور بوبری گو کتنے هی جاهل و غیر متمدن هوں، تاهم اس خاص حیثیت سے ان کے اخلاق کی سطح بہت کافی بلند تھی - ٹیکیٹس اپنی ایک مشہور کتاب میں لکھتا ھے کہ زنا کاری ان میں الشاذ کالمعدوم کی مصداق تھی، زانیہ کا سر مونڈ کر اُسے مارتے هوے گاؤں بھر میں پھرایا جاتا تھا اور پھر اُس کے ساتھہ مدت العمر کوئی شخص شادی نہیں کرسکتا تھا خواہ وہ کتنی هی نو عمر حسین و صاحب ثروت هو - تعداد ازدواج صرف سلاطین کے لئے مخصوص تھا اور اُن کا بھی اس سے مدعا شہوت رانی نہیں بلکہ اظہار نام و نمود هوتا تھا - مائیں خود اپنے بچوں کی رضاعت کرتی تھیں - طفل کشی ممنوع تھی - عقد بیوگان نا جائز تھا - مرد عورت کا ادب و احترام کرتے تھے اور اسیری کے وقت خود اپنی ذات سے زیادہ اپنی بیویوں کے گرفتار هو جانے سے ڈرتے تھے —

ٹیکیٹس کی غرض چونکہ اپنے هم وطنوں کو اس مثال سے وعظ و تلقین کرنی تھی - اِس لئے غالباً ان بیانات میں کچھہ مبالغہ هو - تاهم ان کی اصلیت سے هر گز انکار نہیں هوسکتا - سیلوئیس نے تین صدیوں بعد لکھا ھے اور وہ بھی اسی طرح بربریوں کے مناقب عصمت و عفت

کی مدح میں رطب اللساں ہے - اسکنڈینیویا کے اساطیر میں متعدد حوالے اس قسم کے پائے جاتے ہیں کہ عورت کو راہ ہدایت سے ہٹانے والوں کو آخرت میں سخت سے سخت عذاب کا سامنا ہوگا - بر بریوں کے ہاں عورتیں تعبیر خواب کا کام انجام دیتی تھیں، دوا علاج کرتی تھیں خود جنگ میں شریک ہوتی تھیں اور آثار شکست کے وقت سپاہیوں کو از سر نو ہمت و جوش دلاتی تھیں - بر بریوں کی شدت وفا شعاری کو دیکھکر آگسٹس نے یہ اصول بنالیا تھا کہ وہ ضمانت کے وقت بر بری سرداران قبایل کے بجاے اُن کی بیویوں کو حراست میں لے لیتا تھا کیوں کہ اُن کے لئیے اُن سے دست برداری کسی حالت میں ممکن نہ تھی - ماریسس نے جب ایک بار ان پر فتح پائی تو ان کی بیویوں نے محض حفظ ناموس کے خیال سے یہ استدعا کی کہ انھیں مذہبی اچھوتیوں میں شامل ہونے کی اجازت دیدی جاے اور جب یہ التجا نامنظور ہوئی تو سب نے اکبارگی خودکشی کرلی - ازدواجی وفا پرستی کے دو اور قصے ہم یہاں مختصراً درج کرتے ہیں - جن سے عام حالت کا کچھہ اندازہ ہوسکے گا - ایک نامی گرامی امیر نے ایک بار ایک شادی شدہ بر بری عورت 'کاما' سے اظہار عشق کیا اور جب دیکھا کہ وہ اور کسی طرح رام نہیں ہوتی تو اُس کے شوہر کو قتل کرڈالا - بیوہ نے ڈیانا کے مندر میں جاکر پناہ لی - لیکن یہاں بھی امیر کے فرستادوں نے پیچھا نہ چھوڑا یہاں تک کہ ایک روز امیر موصوف بہ نفس نفیس تشریف لے آئے - اب بیوہ نے بھی اظہار رضامندی کیا، خود پجارنی کا لباس پہن کر دیبی کی مورت کے سامنے آئی - ہاتھہ میں جام شراب تھا - نصف خود پی لیا، اور نصف عاشق صاحب کو

چلا دیا، اور جب وہ بھی ختم کر چکا تو جوش مسرت سے چلاکر کہا کہ "شکر ہے اپنے شوہر کے قاتل سے میں نے انتقام لے لیا، شراب میں زہر ہلاہل ملا تھا" - دوسرا واقعہ ایک اور بر بری ایپونیا کا ہے - اس کے شوہر نے شہنشاہ وسپیسین کے خلاف بغاوت کی، مگر شکست کھائی - مفرور ہو کر جان بچانا بالکل ممکن تھا، لیکن پیاری بیوی کو چھوڑنا گوارا نہ ہوا - خود ایک گاؤں میں جاکر تہ خانہ کے اندر روپوش ہوگیا، اپنی موت کی خبر مشتہر کرادی اور اپنی لاش کی معدومیت کے سوال کو یوں حل کیا کہ اس گھر میں آگ لگا دی، تاکہ سب سمجھیں لاش بھی جل کر خاکستر ہوگئی - بیوی نے سنا تو تین روز تک بے آب و دانہ زمین پر پڑی رہی - مگر بالآخر معلوم ہوا کہ یہ غلط خبر قصداً مشہور کردی گئی ہے - ظاہری سوگ اس نے اب بھی برقرار رکھا، لیکن شب کو جاکر شوہر سے چھپ کر مل آیا کرتی تھی - کچھ روز میں حاملہ ہوئی اور مدتوں حمل کو دواؤں سے چھپائے رکھا - بالآخر وضع حمل کا وقت آپہنچا - اور وہ تن تنہا جاکر تہ خانے کے اندر دو توام بچے جن آئی ایک دو روز نہیں پورے ۹ برس تک بچے وہیں پلتے رہے تا آنکہ یہ راز طشت ازبام ہوگیا، باغی پھر گرفتار ہوکر قتل ہوا اور ایپونیا کی یہ آخری التجا رد کردی گئی کہ وہ اپنے شوہر کے ساتھ جان دے سکے —

بربریت و رہبانیت کی پاکبازی کے درمیان ایک اصولی فرق تھا - رہبانیت تجرد کے حق میں معین تھی، لیکن بربری پاکبازی کا رخ اُلفت و خلوص ازدواجی کی جانب

تھا - اور تعداد ازدواج کا دستور تو بربری سلاطین میں برابر جاری رہا - کیریبرٹ و کلفرک کے متعدد بیویاں تھیں کلوتیر نے اپنی بیوی کی حیات میں اپنی سالی کو بھی عقد میں لے لیا - تھیوڈیبرٹ بایں پاکبازی دو دو بیویاں رکھتا تھا - ڈاگو برٹ کی تین بیویاں اور متعدد کنیزیں تھیں

اور کنیزیں تو خود شارلمین کے پاس بھی بکثرت تھیں باوجود دو بیویوں کے - پا پایان روم اور پادری اس وقت اخلاق خانگی کے محافظ و مصلح تھے اور سلاطین و امرا کی کثرت طلاق کی دیکھ بھال رکھا کرتے تھے -

لیکن اس ایک بات کو چھوڑ کے عموماً بربریوں کی پاکبازی بالکل مسلم و غیر مشتبہ ہے جیسا کہ خود اُن کے قوانین سے ظاہر ہوتا ہے عورت کی عصمت کو متہم کرنے والے پر بہ نسبت مرد پر بزدلی کے اتہام لگانے والے کے پندرہ گنی رقم جرمانہ کی سزا ہوتی تھی زنا و زنا بالجبر دونوں پر بہت سخت تعزیرات تھیں - پندرہ اشرفیوں کا جرمانہ اُس شخص پر ہوتا جو نامناسب طور پر کسی عورت کے ہاتھ کو چھو لیتا - اور جراحوں کو ممانعت تھی کہ بغیر شوہروں یا اور قریب ترین اعزہ کی موجودگی کے عورتوں کو فصد دے سکیں —

مسیحیت کے اثر نے عصمت و پاکبازی کی ان تعلیمات کو اور زیادہ قوی کردیا - اب زناکاری کے واقعات شمار میں بھی کم ہوگئے اور جتنے کچھ ہوتے بھی تھے ، بالاعلان نہیں ہوتے تھے - شرم و حجاب کا ایک جدید جذبہ پیدا ہوگیا ، زبان و ادب میں فحش کا عنصر گھٹ گیا اور قانون

ازدواج کی خلاف ورزیاں کیفیت و کمیت دونوں میں کم
ہوگئیں - سینٹ گریگوری نے بعض فلاسفہ مشرکین کی طرح
اس کی تاکید کی کہ مائیں خود اپنے بچوں کی رضاعت کریں
لباس و وضع رفتار و گفتار ہرشے سے متعلق قوانین نافذ
کردئے گئے ' یونان و ایشیاے کو چک کی لائی ہوئی شہوت
پرستی کا سدباب ہوگیا ' اور طوایفوں کا طبقہ ذلت و تحقیر
کا مرادف قرار پاگیا - سب سے بڑی اصلاح اس سلسلہ میں یہ
ہوئی کہ عورت و مرد ' دونوں اس حیثیت سے برابر درجہ
کے مجرم قرار دیدیے گئے - دنیا کا ایک عام دستور یہ ہے
کہ اس باب میں تقریباً سارا الزام عورت پر ڈالدیا جاتا ہے -
اور مرد سے گویا مطلق باز پرس نہیں ہوتی - عورت کو
ایک مرتبہ بھی کہیں لغزش ہوجاے تو پھر زندگی بھر کے
لئے وہ داغی ہوگئی - لیکن مرد کو لے خزانہ عورتیں کرتا ہے
اور پھر معصوم کا معصوم بنارہتا ہے ' حالانکہ یہ بھی ظاہر
ہے کہ محرک و فاعل مرد ہوتا ہے عورت بیچاری تو صرف
ایک حیثیت منفعلہ رکھتی ہے اور پھر ضعیف و کمزور جو
ہوتی ہے سو الگ ' اس عدم مساوات کی توجیہ متعدد
اسباب کی بنا پر کی جاتی ہے مثلاً یہ کہ عورت کے
خاطی ہونے کا ثبوت قطعیت سے مل سکتا ہے اور مرد
کا نہیں ' یا یہ کہ عورت کی ناجائز اولاد کی پرورش
کا بار اگر بے قصور شوہر کے سرڈال دیا جاے تو بڑی
ناانصافی ہے ' وغیرہ - بہر حال اسباب کچھہ بھی ہوں -
یہ عام خیال ہمیشہ سے رہا ہے اور اب بھی موجود ہے -
سنیکا و پلوٹارک کے صفحات میں اس کے خلاف اشارات
ملتے ہیں ' لیکن مسیحی پادریوں نے اس تعلیم کو بہت

زور و قوت کے ساتھہ بیان کیا کہ زنا میں قصوروار اگر ہیں تو مرد و عورت دونوں اور برابر درجہ کے - لیکن یہ تعلیم اس حیثیت سے عمل پر زیادہ موثر نہ ہوسکی - عمل پر موثر ہوئی ضرور ، یعنی ناجائز تعلقات کی ذمہ داری مسیحیوں کے یہاں مرد و عورت دونوں پر یکساں طور پر عائد ہوتی ہے ، تاہم اس کی بنا یہ نہیں ، بلکہ یہ ہے کہ ایک مرد و ایک عورت کا دایمی ازدواج ایک عمل تقدیس ہے جیسا کہ خود مسیح کا ازدواج کلیسا کے ساتھہ ہوا اور جو شخص اس مقدس رشتہ میں کسی حیثیت سے بھی رخنہ اندازی کرنا چاہتا ہے ، خواہ مرد ہو یا عورت ، مجرد ہو یا متاہل وہ گناہ کبیرہ کا یکساں مرتکب ہوتا ہے —

اسی مسئلہ کو مذہبی حیثیت سے قطع نظر کر کے اگر محض دنیوی اعتبار سے دیکھیں تو بھی اس کی تائید میں یہ دو اصول ملتے ہیں —

(۱) ایک یہ کہ فریقین و نیز جماعت کے لئے مفید کون سی صورت ازدواج ہے ؟

(۲) دوسرے یہ کہ ایک ہمارے حس اخلاق کو بلند کرنے والی کیا شے ہے اور پست کرنیوالی کون ؟

ان ہر دو اصول کے معیار پر نظر کرنے سے اس کی تائید نکلتی ہے کہ تعلقات جنسی کی بہترین صورت یہی ہے کہ ایک مرد اور ایک عورت دایمی معاہدہ کرکے ایک دوسرے کے پابند رہیں - لیکن اگرچہ یہ صورت عقلاً بہترین ثابت ہوتی ہے ، تاہم اس کا یہ نتیجہ تو کسی طرح نہیں نکلتا کہ صرت

یہی ایک صورت قابل عمل ہے اور باقی تمام صورتیں مردود ہیں - بلکہ برعکس اس کے تجربہ بتاتا ہے کہ دوسری صورتیں بھی مخصوص حالات کے درمیان مناسب بلکہ ضروری ہو جاتی ہیں - مثلاً جن جماعات میں، یا جس زمانہ میں موقت تعلق: زنا شوئی یا متعہ معیوب نہیں خیال کیا جاتا اور جبکہ اس رسم پر عمل کرنے والوں میں اس سے احساس معصیت یا اور کوئی اخلاق شکن اثر نہیں پیدا ہوتا - یا پھر ایسی صورت میں کہ مرد اپنے جوش شباب میں اگر اپنے ہمسروں میں ازدواج کرتا ہے تو اپنے درجہ کی مالی حالت کو نہیں سنبھال سکتا، اس لئے لامحالہ اُسے اپنے سے کم درجہ عورت کے ساتھہ موقت تعلق پیدا کرنا پڑتا ہے - تو ایسی صورتوں میں یہ موقت تعلقات سوسائٹی کے لئے مضر ہونا کیسا اور مفید ہوتے ہیں —

بت پرست مقننین ان استثنائی صورتوں کے وجود اور اُن کی اهمیت سے پوری طرح باخبر تھے، چنانچہ اپنے قوانین میں انہوں نے ہر جگہہ ان کا لحاظ رکھا ہے اور موقت تعلقات کو اونہوں نے صاف طور سے جائز قرار دے کے اُن کی ایک منضبط و باقاعدہ شکل بنا دی اور طلاق کی آزادیوں نے بہت سی ناجائز صورتوں کو جواز کا جامہ پہنا دیا - کنیزوں کے رکھنے کا دستور بد چلنی کی زیادہ واضح و صریح صورتوں کو روکنے کے لئے جاری ہوا، اور رفتہ رفتہ عام ہو گیا - یہ قانوناً بالکل جائز تھا اور نکاح کے حکم میں داخل تھا - جو شخص ایک کنیز کے ہوتے

ہوئے دوسری کنیز رکھ لیتا تھا ، یا کسی سے نکاح کر لیتا تھا ، وہ قانون کی نظروں میں زناکاری کا مرتکب ہوتا تھا - نکاح کی طرح اس کے لئے بھی کسی خاص رسم کی ضرورت نہ تھی اور نکاح کی طرح اس میں بھی افتراق ہر وقت ممکن تھا - البتہ اس کے ممیزات یہ تھے کہ کنیز اپنے ساتھ جہیز نہیں لاتی تھی - خود ادنیٰ درجہ کی ہوکر اعلیٰ طبقہ کے شخص کو شوہر بناسکتی تھی (درآں حالیکہ نکاح کی صورت میں میاں بیوی کو مساوی طبقہ کا ہونا چاہئے تھا) مگر اس کی اولاد ہمیشہ ماں ہی کے طبقہ میں رہتی تھی ، باپ کی جائداد و نسب سے اُسے کوئی بہرہ نہ تھا —

اس تخیل کے خلاف مسیحیت نے پوری قوت سے علم جہاد بلند کیا - جس کی صدائے بازگشت گو قانون کے پردوں سے عرصہ تک بہت دھیمی آیا کی تاہم مذہبی وکلیسائی تحریروں میں اُنکی گونج ہمیشہ بڑی زور کی سنائی دیتی رہی ہے - مسیحیت نے آکر یہ تعلیم دی کہ تمام دنیوی اغراض و منافع اور مادی نتائج و مصالح سے بالکل قطع نظر کرکے خود ارشاد ربانی کے بموجب مرد و عورت میں مباشرت کا جائز طریقہ وحید صرف نا قابل انفصال عقد مناکحت ہے اور اس کے سوا ہمبستری کی ہر صورت حرام ہے - مسیحیت کے اس قطعی و مدعیانہ تلقین کا اثر ہر شعبہ حیات پر پڑا جس کے شواہد آج بھی ہر طرف نظر آرہے ہیں —

اسی تحریک کا ایک اثر یہ بھی ہوا کہ رفتہ رفتہ عقد نکاح ایک مذہبی رسم قرار پاگیا - یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ زناشوئی کے اہم و دایمی معاہدہ کو

مذهبی استناد کی مهر سے بیحد تقویت پهنچ سکتی تهی - لیکن سب سے پہلے جس نے اس اثر سے کام لیا وہ مسیحیت تهی - گویہ ضرور هے کہ اس دستور نے بہت تدریجاً رواج پایا ' چنانچہ جیسا میں پہلے کہیں لکهہ چکا هوں -غلاموں کے عقد میں مدت تک اس کی ضرورت هی نهیں محسوس هوئی اور آزادوں کے عقد میں بهی اس کا لزوم دسویں صدی سے پیشتر طے نہ پاسکا - تبریک تقدیس سے قطع نظر کرکے کلیسا کو ایک بڑا فائدہ اس سے یہ هوا کہ اس کے هاتهہ میں ایک بڑا زبردست آلہ آگیا - جس سے اساطین کلیسا هر موقع پر فائدہ اوتها کر مسیحی گلہ کی خانگی زندگی کو اپنے قابو میں لا سکتے تهے ' اور اس میں شبہ نهیں کہ زمانہ حال میں " قانونی شادیوں " یعنی بلا پادریوں کے توسط کے مناکحت کا جو جواز هوگیا هے اس سے کلیسا کے اقتدار کو ایک بہت هی گهرا دهکا لگا هے —

اسی کے ساتهہ طلاق کو بهی کلیسا نے مطلقاً ناجائز قرار دینا شروع کردیا - ابتداً قانون اس کی مخالفت کرتا رها- چنانچہ قسطنطین نے شوهر کے تین گناهوں اور بیوی کے تین گناهوں پر طلاق کی اجازت دے رکهی تهی-بلکہ لوگوں کے عام رجحان کو دیکهہ کرجستینین کے زمانہ میں یہ قیدیں بهی اُتهہ گئی تهیں اور اب قانون نے طلاق کے بارے میں پوری آزادی دے رکهی تهی-لیکن دوسری طرف آباے کلیسا اس کی پوری مخالفت کرتے رهے اور عورت سے زناکاری کا جرم سرزد هونے کی مشتبہ الجواز صورت کو چهوڑ کر باقی هر حالت میں طلاق کو قطعاً ناجائز قراردیتے رهے - قانون و شریعت کی یہ کشمکش صدیوں تک قایم رهی - تاآنکہ قانون کو دبنا پڑا -پہلے شارلمین نے گو وہ اس رسم پر خود عامل تها اور اسے قابل تعزیر نہ قرار دے سکا '

تاهم طلاق کو ایک جرم قرار دے دیا - لیکن کلیسا کے جوش و خروش کی اس سے تشفی نہ ہوئی اور بالآخر بارھویں صدی میں قانون نے شریعت کے مقابلہ میں اپنی شکست کامل مان کر خود بھی طلاق کے ممنوع ہونے کا اعلان کردیا —

مجھے یہاں اس سے بحث نہیں کہ اس ممانعت سے دنیا کے اخلاق پر کہاں تک مفید یا مضر اثر پڑا ہے اس موقع پر مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ گو اس ممانعت کی تائید میں آج مادی منافع و دلائل سے بھی کام لیا جاتا ہے تاہم ابتداً اس کی بنا ان چیزوں پر نہیں، بلکہ ازدواج کی تقدیس پر تھی یعنی اس عقیدہ پر کہ ازدواج یادگار ہے خود مسیح اور کلیسا کے درمیان اتحاد و مواصلت کی - اور اس بنا پر زناکاری - خطاے اخلاقی سے زیادہ معصیت مذہبی تھی جمہوریت کے دور آخر میں رومیوں کا خیال تھا کہ ازدواج ایک ملکی و وطنی فرض ہے کہ اس سے حکومت کو فوج کے لئے افراد بہم پہنچتے ہیں، چنانچہ آگسٹس کے قوانین میں مجرد رہنے والوں کے لئے سزائیں بھی مقرر تھیں - لیکن اب مسیحیت کے اثر سے یہ محرک بالکل فنا ہوگیا تھا - اب نہ لوگوں میں محافظت وطن کا کوئی جوش رہا تھا اور نہ ازدواج کوئی فرض سمجھا جاسکتا تھا، بلکہ اب تو رہبانیت کے اثر سے تجرد زیادہ مقدس و محترم سمجھا جانے لگا تھا —

ازدواج کے سلسلہ میں ایک شے اور تھی، جس کا حصول بھی آباے کلیسا اپنے مقاصد کے لئے ضروری خیال کرتے تھے اور وہ یہ تھی کہ مسیحیوں اور غیر مسیحیوں کے درمیان رشتۂ ازدواج نہ قایم ہوسکے - چنانچہ اس

قانون کو بھی اب انھوں نے سختی سے نافذ کردیا - یہ بے شبہ سچ ھے - کہ مختلف العقائد اشخاص کے درمیان شادیاں فریقین کے غلو و تعصب کو ھلکا کردیتی ھیں اور ایک دوسرے کے ساتھہ رفق وملاطفت سے پیش آنے کا سامان بہم کردیتی ھیں - لیکن یہ ایسی صورت میں ممکن ھے - جب فریقین ایک خاص حد تک روشن خیالی و رواداری کا درجہ حاصل کرچکے ھوں تاریک خیالی و تعصب کی انتہائی پستی میں جب کہ ھر فریق دل سے یہ پختہ اعتقاد رکھتا ھے کہ اس کا شریک زندگی نیز اس کے مذھب پر جتنی اولاد ھوگی وہ سب قطعاً ضلالت و گمراھی میں مبتلا ، نجات سے محروم اور ایک عذاب الیم وعقوبت دایمی کی مستحق ھے موافقت و ملاطفت کا کہاں گزر ھوسکتا ھے؟ ایسی حالت میں تو میاں بیوی دونوں کی زندگی تلخ ھو جاتی ھے اور خانگی زندگی ھر وقت رنجشوں کدورتوں کی آماج گاہ بنی رھتی ھے —

خانگی زندگی کی بے لطفیاں و رنجشیں تمام تر مسیحیت کی پیدا وار ھیں - اس سے قبل دنیا کے لئیے یہ نا معلوم تھیں - کیونکہ گو زوج و زوجہ میں اختلاف عقاید پہلے بھی ھوتا تھا تاھم پیشتر ان پر اتنا زور نہیں دیا جاتا تھا اور ان کی اتنی اھمیت نہیں خیال کی جاتی تھی - روما کے قبول مسیحیت کے وقت جو کچھہ حالت ھوگی اُس کا نمونہ ھمیں موجودہ زمانہ میں بھی اپنے گرد و پیش نظر آتا ھے - ایک بڑا غضب یہ ھے کہ اور کسی معاملہ میں اگر دو شخصوں میں اختلاف عقاید ھو تو ناتعلیم یافتہ شخص اپنے سے عالم تر شخص کی پیروی کرنے لگے گا یا کم از کم اس کی رائے کو وقعت واجب کی نظر سے تو ضرور دیکھے گا - لیکن خاص مذھبی

معاملات کے اختلاف کے وقت اس کے بالکل برعکس صورت حال ہوتی ہے یہاں اپنی راے کو قطعاً صادق سمجھنا اور دوسرے کے عقیدہ کو گمراہ اور حصول نجات سے محروم کرنے والا اور منجانب شیطان سمجھنا ارکان ایمان میں سے ہے - اور چونکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ شوہر و زوجہ یا باپ اور بیتے کی علمی سطح برابر نہیں ہوتی - اس لئے اختلاف عقائد کا پیدا ہونا ناگزیر ہے - اور پھر اس سے رنجشوں اور بے لطفیوں کا جو سلسلہ پیدا ہوتا ہے انہوں نے خانگی زندگی کو تمام تر تلخیوں سے لبریز کر دیا ہے - تعصب غلو - حق پوشی - تاریک خیالی ' ضد - عدم روا داری - ان چیزوں کو پرجوش علماے دین جز و مذہب بنا دینا اپنا فرض خیال کیا کرتے ہیں - ایسی حالت میں کیونکر ممکن ہے کہ اختلاف عقائد کے باوجود حیات خانگی ایک لحظہ کے لئے بھی پر لطف رہ سکے ؟

ان خرابیوں کو پیش نظر رکھ کر پادریوں نے امن و لطف کی زندگی کی بقا کے لئے یہ ضروری سمجھا کہ مسیحیوں اور غیر مسیحیوں کے درمیان مناکحت کا سرے سے سد باب کردیں - ایک یہ خیال تھا دوسرے میرے نزدیک اس خیال کو اس عقیدہ سے اور اعانت حاصل ہوگئی کہ رسم نکاح مسیح اور کلیسا کے اتحاد و مواصلت کی یادگار ہے اُس وقت کے حاملین مذہب اس عقیدہ کے استعارتاً نہیں بلکہ اُس کے لفظی معنی میں قایل تھے کہ اُن کے نزدیک یہ ایک سر تھا اسرار ربانی میں سے اور تمام مسیحی اعضا و جوارح تھے مسیح کے ' جن کے لئے کسی غیر مذہب والے کے ساتھ ازدواج کرنا ایک مذہبی معصیت تھی ' جیسا کہ سینٹ سایپرین و ترتولین وغیرہ ائمہ کلیسا نے بہ تصریح کہا ہے —

مرد و عورت کے باہمی تعلقات کے باب میں مسیحیت

ہے جو نتایج پیدا ہوئے اُن کے خلاصہ کو ہم دفعات ذیل کی صورت میں رکھہ سکتے ہیں —

(۱) دوشیزگی و تجرد کی انتہائی تقدیس —

(۲) نکاح کے سوا مرد و عورت کی ہمبستری کی اور تمام صورتوں کا عدم جواز —

(۳) مسیحیوں کے لئے صرف اپنے ہم مذہبوں کے ساتھہ ازدواج کی قید —

(۴) طلاق و افتراق کا عدم جواز —

(۵) اور نکاح کی مذہبی حیثیت —

اِن سب کے علاوہ ایک خاص اثر مسیحیت کا یہ بھی ہوا کہ عورت جن خصوصیات میں مرد پر فضیلت رکھتی ہے - اُن کے لحاظ سے اُس نے اُن کے درجہ کو اور زیادہ بلند کردیا اس کی تفصیل کے لئے آیندہ فصل ملاحظہ ہو —

فصل (۴)

فضایل نسوانی

مرد و عورت کے درمیان کیا باہمی تناسب ہے ؟ اس سوال کا ہر قوم ، ہر مذہب ، ہر ملک اور ہر زمانہ نے ایک نیا جواب دیا ہے اور اس جواب کا اخلاق کے عملی پہلو پر ہمیشہ گہرا اثر رہا ہے - یہ مسئلہ در اصل تین مختلف شعبوں پر تقسیم ہے - جسمانی حیثیت سے دیکھئے تو اس کا فیصلہ بالکل بدیہی ہے - یعنی مرد قوت و

طاقت میں ممتاز ہے اور عورت حسن و نزاکت میں عقلی و دماغی حیثیت سے دیکھئے تو بھی علی‌العموم مرد ھی کی افضلیت نکلے گی - علم و فن ' فلسفہ و حکمت ' زبان و ادب ' غرض کسی شعبہ میں نظر کیجئے - مردوں ھی کے قام نظر آئیں گے اور خواتین کی جماعت میں کسی شیکسپیر - کسی نیوٹن - کسی ریفایل اور کسی هنڈهل کا نام نہ ملے گا - دقت پسندی ' وسعت نظر - قوت تحقیق و تنقید ان سب چیزوں میں مرد کی فضیلت مسلم ہے - البتہ نازک خیالی و لطیف الاحساسی میں عورت کا نمبر بڑھا ھی ھوا ہے - اسی لئے ناول نویسی - ایکٹری و لطیف مکالمت و مراسلت میں عورت کا مرتبہ فی‌الجملہ پست نہیں —

لیکن اب اگر اخلاقی نقطہ خیال سے غور کیجئے تو بہ حیثیت مجموعی عورت ھی کا امتیاز تفوق ثابت ھوگا - سب سے پہلے ھم پولس کے فراھم کردہ اعداد کو لیتے ھیں تو معلوم ھوتا ہے کہ بہ لحاظ جرایم مرد و عورت کے درمیان پانچ اور ایک کی نسبت ہے ! اس کی تاویل میں اگر یہ کہئے کہ مرد پر کنبہ کی پرورش کا بار ھوتا ہے اور اُس کے سامنے قانون شکنی کی زیادہ ترغیبات موجود رھتی ھیں تو اُس کا جواب یہ ہے کہ افلاس و ناداری جو جرایم کی سب سے بڑی محرک ہے اُس کا شکار عموماً عورتیں ھی ھوتی ھیں - لیکن خیر ' پولیس کے اعداد سے قطع نظر کر کے بجائے خود غور کرنے سے معلوم ھوتا ہے کہ ایثار میں عورت کا نمبر مرد سے قطعی بڑھا ھوا ہے فضیلت اخلاق کے سر چشمہ دو ھیں ' ایک اضطراری ' یعنی بلا قصد طبعاً اختیار خیر و ترک شر ، دوسرے ارادی ' یعنی

شاہراہ فرض پر فرض سمجھکر چلتا ہے، سو میرے نزدیک یہ صورتیں عورتوں ہی پر زیادہ موثر ہوتی ہیں۔ مرد کی نسبت یہ اپنے خیال و عمل دونوں میں زیادہ عفیف ہوتی ہیں۔ ان میں گو حسد، رشک، کینہ و حرص کا مادہ زیادہ ہوتا ہے، تاہم ہمدردی، غمگساری، صبر و شکر رضا و تسلیم قناعت و نفس کشی میں اُن کی داد نہ دینا بھی ظلم ہے اور گو مرد میں عزم و بلند نظری ثبات و استقلال، جواں مردی و خود اعتمادی زیادہ ہوتی ہے، تاہم انکسار و تواضع، خلق و تپاک، شرم و حجاب کی حصہ دار یہی ہوتی ہیں۔ مرد کا طبعی رجحان عدل و انصاف کی جانب ہوتا ہے اور اُن کا رحم و خدا ترسی کی جانب۔ ان کی نظریں گو محدود ہوتی ہیں۔ تاہم تخیل بہت قوی ہوتی ہے۔ اور درد و مصیبت کے وقت دوسرے کے کام آنے میں یہ مردوں سے بہت آگے بڑھ گئی ہیں ان کا ذہن کلیات و تعمیمات سے نہیں بلکہ جزئیات و تشخصات سے متاثر ہوتا ہے اور غمگساری و ہمدردی کے مواقع پر مرد ان کا بالکل مقابلہ نہیں کرسکتے —

مسیحیت کا ایک خاص کار نامہ یہ ہے کہ اُس نے اخلاقی تخیل میں تبدیلی پیدا کرکے فضایل نسوانی کو ایک خاص شرف و امتیاز عطا کردیا۔ یونانیوں کا تخیل جس طرح فنون لطیفہ میں مردانہ تھا اُسی طرح اخلاق میں بھی مردانہ تھا اس معنی میں کہ وہ لوگ جن چیزوں کو اُم الفضایل کے درجہ پر رکھتے تھے وہ تمامتر مردانہ خصوصیات تھے، مثلاً جرات و ہمت، اعتماد نفس، و حب وطن اور ان کے مقابلے میں جو فضایل، خصایص نسوانی میں سے ہیں اُن کی جانب کوئی خاص اعتنا نہ تھا مثلاً عصمت و عفت، شرم

و حیا ، ہمدردی و فیاضی - چنانچہ اُن کے یہاں جو مشاہیر خواتین ہوئیں ہیں اُن کے کارنامے بھی تمامتر وہی ہوتے تھے ' جو ایک مرد کے لئے طغرائے امتیاز ہوسکتے ہیں مثلاً یہ کہ ایک ماں کے سامنے اُس کی اولاد نے وطن کی خاطر جان دے دی اور اس کے آنسو تک نہ نکلے - وقس علیٰ ھذا - لیکن جو جذبات لطیف صنف نازک کے لئے مایۂ ناز ہوسکتے ہیں اُن کی طرف سے وہ لوگ غافل سے تھے - رومی تمدن و اخلاق پر سب سے زیادہ اثر رواقیت کا پڑا تھا اور رواقیت کے سب سے زیادہ سر برآوردہ رکن کا خود یہ اعتراف تھا کہ ہمارا تخیل بالکل مردانہ ہے - اور تو اور ایک اسی بات کو دیکھنا چاہئے ' کہ سنگ تراشی میں بت پرستوں کو خاص کمال حاصل ہوا اور نقاشی میں مسیحیوں کو - یہ آخر کیوں ہوا ؟ اس بنا پر کہ سنگ تراشی مردانہ حسن ' یعنی قوت و طاقت کی مظہر تھی ' اور نقاشی زنانہ حسن یعنی لطافت و نزاکت کی ترجمان ہوتی ہے چنانچہ خود مسیحی مصوروں و نقاشوں کے بہتر سے بہتر افراد جو عظمت و قوت کی نقاشی کے عادی تھے مسیحی تخیل کی صحیح تصویر کھینچنے میں ناکام رہے یہ انقلاب حالت تمامتر مسیحیت کا نتیجہ تھا - جس نے قدیم یونانی تخیل کو فنا کر کے اس کی جگہ حلم و انکسار ' خلق و تپاک سنیت و مدارات ' رفق و ملاطفت ' تسلیم و رضا اُلفت و محبت کے جذبات مخصوص بہ نسواں کو رفعت بخشی —

عورتوں میں ایک تو یوں ہی جذبہ مذہبیت بہ مقابلہ مردوں کے قوي ہوتا ہے ' دوسرے مسیحیت نے جو اپنے بانی کے ساتھہ عشق و شیفتگی کو بنیاد دیں

قرار دی اور جس کی بنا پر عورتوں کو اپنے مخصوص فضائل کے اظہار کا غیر متوقع موقعہ مل گیا اس سے مسیحیت کی تبلیغ میں عورتوں کو غیر معمولی حصہ و اقتدار حاصل ہوگیا۔ ایسا کہ کسی اور اہم ذہنی تحریک میں اتنا حصہ عورتوں کا نہیں رہا ہے۔ تعدیوں کے زمانہ میں شہیدان راہ حق کی صف اول میں اکثر ممتاز ترین اسماء خواتین ہی کے نظر آتے ہیں اور مسیحی و مشرک مصنفین متفق اللفظ ہیں کہ خواتین غیر معمولی مستعدی کے ساتھہ کلیسا میں داخل ہوتی تھیں اور مردوں کو اس میں داخل کرانے میں خاص حصہ رکھتی تھیں۔ سینٹ آگستائین، سینٹ کریزو ستم، سینٹ بیسل، سینٹ گری گوری، و تھیو دورٹ، ان سب کی ماؤں کو ان کے مسیحی بنانے میں کافی دخل تھا۔ سینٹ ہیلینا یعنی والدۂ قسطنطین، فلیسلا، یعنی ملکۂ تھیوڈو سیس اعظم، نے پلچیریا، یعنی ہمشیرۂ تھیوڈوسیس مزہ اور پلسیڈیا، یعنی والدۂ ویلینٹنین سوم ان سب کا شمار خاص حامیان دین میں ہے۔ ان کے علاوہ جو فرقے اہل اعتزال کے تھے ان میں بھی مستورات کا خاص زور تھا چنانچہ آریئس، پریسیلین، اور مونتینس، کے گرد صنف نسواں کے ایک لشکر کا ہجوم رہتا تھا۔ تحریک رہبانیت میں بھی عورتیں مردوں کے دوش بدوش تھیں اور خیراتی کاموں کے نظام و نسق میں تو ان کا نمایاں حصہ تھا۔ در حقیقت اس سے زیادہ وہ کسی اور کام کے لئے خلقتاً موزوں ہی نہیں ہوئی تھیں اور گو ہر ملت اور ہر زمانے میں ان کی انفرادی مثالیں اس قسم کے کام کی ملتی ہیں۔ لیکن ان کی اس سرشت و جبلت

سے پورا فائدہ مسیحیت سے پہلے کسی نے نہیں اُٹھایا ۔ فیبیولا ، پالا ، میلینیا وغیرہ بہ کثرت خواتین ایسی تھیں، جنھوں نے اپنی زندگی رفاہ عام کے کاموں کے لئے وقف کردی اور وہ کام بھی اس نوعیت کے کہ پہلے کبھی کسی کے خیال میں نہیں آئے تھے ۔ ملکۂ فلیسلا اپنے ہاتھوں سے شفاخانوں میں بیماروں کی تیمارداری کرتی تھی، اور یہ خدمت تو ہر مسیحی بیوی کے گویا فرایض میں داخل ہوگئی تھی ۔ اس نظیر سے ہر زمانہ میں فائدہ اُٹھایا گیا ہے ۔ اور مسیحیت و کلیسا کی تاریخ میں گو اس پر دیگر حیثیات سے تاریک دور گزرے ہیں، لیکن ایسا کوئی زمانہ نہیں آیا جو ایسی مسیحی خواتین کی تعداد کثیر سے خالی ہو ۔ جنھوں نے اپنی زندگی نوع انسان کی رفع تکالیف کے لئے وقف کردی ہے اور یہ خدمت خلق کی خصلت جس قدر دنیا کو نفع و راحت پہنچانے میں معین ہوئی ہے اُسی قدر ان ہستیوں کی سطح اخلاق بلند کرنے میں بھی ہوئی ہے جو اس پر عامل رہی ہیں —

بعض معتزلی فرقوں میں عورتوں کے سپرد اعلی مذہبی مناصب بھی ہوتے تھے ۔ عام راسخ العقیدہ گروہوں میں گو یہ شے جائز نہ تھی، تاہم بعض ادنی مذہبی مراسم کے ادا کرنے کی عورتوں کو ان کے ہاں بھی اجازت تھی اس سلسلہ کی ابتداء خود حواریوں کے زمانہ سے قایم ہوگئی تھی ۔ سن رسیدہ کنواریوں کا ایک خاص حلقہ قایم کردیا گیا تھا جن کے ایک خاص حلف اُٹھانے کے بعد یہ فرایض قرار پا جاتے تھے کہ عورتوں کو بپتسمہ لینے میں مدد دیں، بیماروں کی تیمارداری کریں،

نظربندوں اور قیدیوں کی خدمت کریں، مذہبی مجالس میں انتظام و اہتمام کریں اور جو عورت پادری صاحب کا شرف زیارت حاصل کرنا چاہے اس کی رہبری کریں، تاریخی شہادتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ رفتہ رفتہ اس حلقہ میں بھی ابتری پھیلتی گئی تاآنکہ بالآخر یہ مخصوص کنواریاں، محض عام کنواریوں (نن) کے درجہ پر رہ گئیں۔ تاہم اس حلقہ کا وجود، مشرق میں بارھویں صدی تک رہا - اس کے علاوہ پہلی مرتبہ کی بیواؤں کی خاص عزت ہوتی تھی اور وہ کلیسا کی فیاضیوں کی خاص حقدار سمجھی جاتی تھیں - علیٰ ہذا اُن سن رسیدہ مستورات کے ساتھ جن کا کوئی مرد والی و وارث نہ ہوتا (عام اس سے کہ انھوں نے کبھی شادی نہ کی ہو یا یہ کہ ان کے مرد اعزہ کی وفات ہوگئی ہو) غیر معمولی مراعات ملحوظ رکھے جاتے - مرد کا سن جتنا زیادہ ہوتا جاتا ہے، اُسی نسبت سے وہ زیادہ تجربہ کار و جہاں دیدہ سمجھا جاتا ہے - بخلاف اس کے "بڑھیا عورت" ہرجگہ عموماً ایک مضحکہ خیز ہستی سمجھی جاتی ہے اُس سے تمسخر کیا جاتا ہے، یہاں تک کہ حسن و جمال جو شباب میں اس کا قوی ترین حربہ ہوتا ہے - وہ بھی اس وقت اُس کا بالکل ساتھ چھوڑ دیتا ہے اور بہ مقابلہ ایک پیر زن کے ایک پیر مرد اس کا بھی زیادہ حصہ دار نظر آتا ہے - ایسی حالت میں کلیسا کا یہ ایک خاص احسان ہے کہ اس نے مسن عورتوں کے گرد تقدس و احترام کا حلقہ کھینچ کے اُن کی قدرتی کمزوریوں کا ایک بڑی حدتک کفارہ کردیا اور ایسے اسباب مہیا کردیے کہ ان کی آخر عمر کی تلخیاں اور ناگواریاں کچھہ تو کم ہوجائیں —

کلیسا کی ان تعلیمات کا یہ اثر ہوا کہ مسیحی واضعان قوانین نے بھی جائداد کے معاملہ میں عورت کے قانونی حقوق کو وسعت دینا شروع کیا اور جستینین نے مشرکوں کے اس اصول کو توڑ کر کہ سرپرستی و مربی گری کا حق مردوں کے ساتھہ مخصوص ہے - بیواؤں کو ان کی اولاد کا مربی و سرپرست بنا دیا - عورتوں نے جس طرح اپنے تئیں خدمت کلیسا کے لئے وقف کردیا تھا نیز جس قدر امداد متمول بیوائیں کلیسا کو دیتی تھیں ، بے شبہ ان چیزوں نے ایک حدتک کلیسا کو بھی ان کا ہمدرد بنا دیا تھا ، لیکن ان خواتین و تعلیمات سے اہم نتیجہ یہ ہوا کہ عورتوں کو اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت کے باب میں غیر معمولی حصہ حاصل ہوگیا اگرچہ لازمی طور پر ہرموقع پر مفید ہی نہیں ثابت ہوا —

لیکن قانونی حقوق سے قطع نظر کر کے محض وہ اخلاقی تخیل جو عورت کے متعلق اب قایم ہوا تھا ، اس کی عظمت و شرافت میں اضافہ کردینے کے لئے کافی تھا - پھر ، مقدس کنواری کا جو تقدس دلوں میں تھا ، صنف نسواں میں کثرت سے پیر و ولی پیدا ہوے تھے - یہ چیزیں بھی اس اثر کے گہرا کرنے میں معین ہوئیں - اسی سلسلہ میں یہ ایک عجیب بات ہے کہ قوم یہود جس نے قدیم اقوام ثلاثہ میں تاریخ و شاعری کے عالم میں سب سے قلیل تعداد جنس نسواں میں سے پیدا کی ، اُسی دنیا کے سامنے عورت کے مرتبہ کے متعلق اتنا بلند تخیل پیش کیا ، اور اس حقیقت سے عورت کی دلکش ترین و محبوب ترین خصوصیات کا راز بھی کُھل جاتا ہے کہ ایک ایسی خاتون جس کے متعلق ہم بجز اُس کی نیکی

اور اُس کی مخصوصیت کے اور مطلق کچھہ نہیں جانتے - بایں ھمہ دنیا کو اس کی جانب جو کشش و گرویدگی ھے اُس کا مقابلہ مشرکوں کے ھاں کی بہتر سے بہتر وطن پرست خواتین نہیں کرسکتیں! مقدس کنواری کے پرستش کے مذھبی حصہ کے جواز و عدم جواز' استحسان و عدم استحسان سے ھمیں بحث نہیں - لیکن یہ یقینی ھے کہ عورت کا مرتبہ بلند کرنے اور مردوں کے اطوار و اعمال میں گداز و لطافت پیدا کرنے میں جس حد تک یہ تخیل معین ھوا اس کی کوئی نظیر نہیں مل سکتی مشرکوں کی دیویوں کی پرستش سے یہ بات حاصل ھونا ممکن ھی نہ تھی اس لئے کہ وہ ھستیاں حسن اخلاقی' اور خصوصاً زنانہ حسن اخلاقی کے جوھر سے معری تھیں - اس تخیل نے درحقیقت مذھب عیش پرستی اور عسکریت کے اُن تمام مختلف عناصر کو یکجا کر دیا جن کے اثر میں صدھا ھزار ھاسال گزر جانے کے بعد اب تک بھی کوئی کمی نہیں پیدا ھوسکی -

یہ حقیقت نا قابل انکار ھے کہ سولھویں صدی میں جو مذھبی انقلابات ھوے ان میں کتھو لک ازم کا ساتھہ زنانہ اخلاق نے دیا اور پروتستنت ازم کا ساتھہ مردانہ اخلاق نے' جس کی وجہ یہی ھے کہ اول الذکر نے مقدس کنواری کی پرستش کو قائم رکھا اور اس کے متعلقات کو برابر ترقی دی - جذبات کو موسیقی' نقاشی و نقش و نگار کی آراستگی سے بر انگیختہ کرنا' عقل کے بجاے اپنا مخاطب تخیل کو بنانا' بجاے قواے مدرکہ کے قواے حساسہ کو تحریک دینا' معتقدات کے باب میں تحکم سے کام لینا اور سب سے بڑھ کر اپنے متبعین کو

ہمیشہ تقلید کی تعلیم دینا - یہ تمام چیزیں اس کی مویدات ثابت ہوئیں - مرد کی سرشت میں اپنے پیروں آپ کھڑا ہونا، اور عورت کی سرشت میں دوسروں کا سہارا ڈھونڈھنا ہے - اس بنا پر جو مذہب دلوں میں دوسروں کا آسرا، اور دوسروں کے دامن میں پناہ لینے پر نجات کا اذعان بٹھا دیتا ہے وہ عورت کی طبیعت پر خاص طور سے موثر ہوتا ہے - اس کے مقابلے میں جو مذہب شخصی ذمہ داری پر زور دیتا ہے اور مذہب کو جذبات کے زیور سے معرا کردیتا ہے وہ مردوں کا مذہب ہوسکتا ہے - پیورٹن ازم (توہب) مسیحیت کی سب سے زیادہ مردانہ شکل ہے اس کے مشاہیر ارکان کتھولک ازم کے مشاہیر ارکان سے نہ صرف اپنی تعلیمات کے لحاظ سے بلکہ اپنی عملی زندگی کے لحاظ سے بھی ہمیشہ مختلف رہے ہیں - کتھولک ازم طبیعت میں نرمی پیدا کرتی ہے اور پروتستنت ازم مضبوطی کو اکثر نرمی کے ڈانڈے کمزوری و بزدلی سے اور مضبوطی کے ڈانڈے سختی و تشدد سے مل جاتے ہیں - یہی وجہ ہے کہ جو قومیں دل سے کتھولک ہیں اُن میں تقدس و احترام، خوش مزاجی، خلق و مروت، آداب تہذیب، و ملنساری کے جوہر نمایاں ہوتے ہیں - اسی طرح جو قومیں دل سے پروتستنت ہیں، ان میں راست‌بازی، فرض شناسی اور بلند سیرتی کے اوصاف ممتاز ہوتے ہیں- اطاعت و انکسار، اول‌الذکر قوموں کے اور حریت و خودداری آخرالذکر قوموں کے اوصاف خصوصی ہیں-اول‌الذکر ضعیف‌الاعتقاد و وہم پرست ہوتی ہیں، اور آخرالذکر متعصب و غالی - اس میں شبہ نہیں کہ پرو تستنت ازم نے ازدواج کا احترام قایم کر کے صنف نسواں پر ایک بڑا احسان کیا - لیکن

یہ مسلک اپنے تعلیمات و اعمال کے لئے ہرگز اس صنف کے لئے اتنا موزوں نہیں ، جتنا اس کا حریف —

ان مسایل میں پڑ کر میں تاریخ کے حدود سے تجاوز کر گیا - لیکن اس کتاب کی تالیف سے میرا مقصد کائنات اخلاقی کے محض واقعات و حوادث کو قلمبند کرنا نہ تھا ، بلکہ یہی دکھانا کہ ہئیت اجتماعیہ کے ہر تغیر پر اُن کا کیا اثر رہا ہے - اب میں اس کتاب اور اس باب کے خاتمہ پر اس حقیقت کا اظہار ضروری سمجھتا ہوں کہ اخلاق کے تمام شعبوں میں آیندہ ہر دو اصناف کے باہمی تعلقات اور عورت کے مرتبہ کا مسئلہ سب سے زیادہ دشوار و نازک ہے - تاریخ کا سبق یہ ہے کہ تمدن کی وسعت کے ساتھ ساتھ لوگوں میں فیاضی ، راست بازی ، دیانت داری ، و اعتدال وپاکبازی کے جوہر ترقی کرتے جاتے ہیں - لیکن اسی کے ساتھ دوسری طرف خاص روشن خیالی اور معاشری نفاستوں کے عروج کے زمانہ میں مرد و عورت کے باہمی تعلقات ، قیود سے آزاد ہو جاتے ہیں - موجودہ زمانہ میں ان تعلقات کی نوعیت بہت کچھ مذہبی طرز تعلیم کی معلول ہے - لیکن اس کا اثر روز بروز ملکی معاشرت پر ہلکا پڑتا جاتا ہے - ہرحال میں بعض اقتصادی وصنعتی حقایق کے انکشاف نے بھی اس حیثیت سے رفتار زمانہ کا رخ پھیر دیا ہے - یہ پرانا کلیہ کہ کثرت آبادی ہمیشہ مفید ہوتی ہے - جو واضعین قوانین و حکماء اخلاق دونوں کے نزدیک مسلم تھا اور جس پر قانون و اخلاق دونوں کے ایک بہت بڑے حصے کی بنیاد تھی اب باطل ثابت ہوگیا ہے اور اب اس کی جگہ اس کے قضیہ برعکس نے لے لی ہے کہ آبادی کا محدود رہنا ملک کے حق میں

مفید ہے اور اولاد ازدواج کو ایک حد معین سے آگے نہ بڑھنا چاہئیے - کچھہ تو اس کلیہ کے اثر سے اور کچھہ تمدن زائیدہ عیش پرستیوں کی بنا پر صنف نسواں کی ایک بڑی اور روز افزوں تعداد بغیر کسی مرد کی ولایت کے خود ہی کشمکش حیات میں پڑتی ہے - لیکن قوانین و آئین حکومت نیز معاشری رسم و رواج جو اب تک اُسی قدیم بنا پر قایم ہیں کہ ہر بالغ عورت کو بیوی ہونا چاہئیے - بجاے اس کے کہ عورت کی راہ میں سہولت پیدا کریں ' اسے مردوں کے مساوی تعلیمی و مالی حقوق سے محروم رکھکر اس کے لئے اور زیادہ دشواریاں پیدا کر رہے ہیں اور بعضوں جائز ذرایع آمدنی و مشاغل اس پر بند کرکے اُسے بد چلنی یا انتہائی افلاس اختیار کرنے پر مجبور کر رہے ہیں - لیکن باینہم عورت کی خانگی زندگی میں بھی ایک انقلاب شروع ہوگیا ہے جس کے اثرات اس وقت واضح طور پر کسی کی نظر میں بھی نہیں - جو مشاغل اس کے لوازم زندگی سمجھے جاتے ہیں وہ گھر کی چار دیواری سے نکل کر اب بڑے کارخانوں میں پہنچ گئے کپڑے سینا ' چرخہ کاتنا- اس سارے زنانہ کار وبار کو اب بجاے عورت کی اُنگلیوں کے مشینوں اور کلوں کے پرزہ انجام دے رہے ہیں —

اس صورت حال کے نتائج پر غور کرنا ایک حکیم اخلاق کے لئے دلچسپ ہوگا - لیکن مورخ کے دائرۂ عمل سے یہ باہر ہے - پیشین گوئی صرف اس حد تک کی جاسکتی ہے کہ عورت کے آیندہ مشاغل و طریقۂ تعلیم موجودہ حالت سے بالکل بدلے ہوے ہونگے - ان تغیرات کا لازمی اثر سیرت و طبیعت پر پڑے گا - اور عورت

و مرد کا موجودہ طرز تعلق بیسیوں حیثیات سے قابل
ترمیم سمجھا جاے گا - متعدد انوکھے نظریات بھی پیش ہوں گے
لیکن اتنا یقینی ہے کہ ان تمام اصلاحات و تغیرات اخلاقی
کی بھی ایک خاص حد ہو گی جس سے آگے بڑھنا ممکن
نہ ہوگا جو لوگ نیکی و بدی کی تفریق ملحوظ رکھتے
ہیں - قوانین اعمال بشری کو سمجھتے ہیں اور اپنی
اولاد کے نفع نقصان کا خیال رکھتے ہیں - ان کے پیش
نظر یہ حقیقت اچھی طرح ہے کہ دوسرے شعبوں کی
طرح اس باب میں فطرت کی طرف سے اخلاقی امتیازات
قایم ہیں جو کسی کے مٹاے نہیں مٹ سکتے —

—— : * : ——

انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد دکن

اپنے ان مہربان اصحاب کی فہرست مرتب کر رہی ہے جو اس بات کی عام اجازت دیدیں کہ آئندہ جو کتاب انجمن سے شائع ہو ' وہ بغیر ان سے دوبارہ دریافت کئے ' تیار ہوتے ہی ان کی خدمت میں بذریعہ وی پی روانہ کردی جایا کرے - ہمیں امید ہے کہ قدر دانان زبان اردو ہمیں عام طور پر اس کی اجازت دیدیں گے کہ ان کے اسمائے گرامی اس فہرست میں درج کرلئے جائیں اور انجمن سے جو نئی کتاب شائع ہو ' فوراً بغیر دریافت کئے روانہ کردی جایا کرے - یہ انجمن کی بہت بڑی مدد ہوگی اور آئندہ اسے نئی نئی کتابوں کے طبع کرنے میں بڑی سہولت ہوجائے گی - ہمیں امید ہے کہ ہمارے وہ معاونین جو اردو کی ترقی کے دل سے بہی خواہ ہیں ' اس اعانت کے دینے میں دریغ نہ فرمائیں گے —

ایسے اصحاب انجمن کے رکن سمجھے جائیں گے اور ان کی خدمت میں کل کتابیں جو آئندہ شائع ہوں گی وقتاً فوقتاً چوتھائی قیمت کم کرکے روانہ ہوں گی —

المشتہر

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن)